(افسانے)

بھوکا ایتھوپیا

افسانے

مشرف عالم ذوقی

زیرِ اہتمام

تخلیق کار پبلشرز

۱۷۲۹- کوچہ دکھنی رائے - دریا گنج - نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

افسانے : بھوکا ایتھوپیا

مصنف : مشرف عالم ذوقی

رہائش : ۳۔سی، کندن نگر، نزد بنک انکلیو، دہلی ۱۱۰۰۹۲

مستقل پتا : مہادیوا روڈ، آرہ، بھوجپور (بہار)

اشاعت : ۱۹۹۳ء

قیمت : ایک سو دس روپے Rs.110/=

ناشر : مشرف عالم ذوقی

اہتمام : تخلیق کار پبلیشرز

۱۷۷۹۔ کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرورق : انیس امروہوی

کتابت : ایم۔ عمران اعظمی

مطبوعہ : بلس آفسٹ پرنٹنگ ورکس ۲۵۰۹ تراہا بیرم خاں دریا گنج نئی دہلی

ملنے کے پتے :

- موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲
- ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، دہلی ۶
- نور پبلیشنگ ہاؤس، فراش خانہ، دہلی ۶

اس کتاب کی اشاعت میں دہلی اردو اکیڈمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

T.P. 012
BHOOKA ETHOPIA (Short Stories)
By MUSHARRAF ALAM ZAUQI
Takhliqkar publishers.New Delhi

1993 Rs.110/=

تبو (تبسم فاطمہ)
کے
نام ـــــــ
جس نے
زندگی کے پنّوں پر
درج ہونے والے
ہر سنگھرش کو
لکھا ہے
رومانی!

ذوقی ـــــــ

فہرست

◆◆

پیش لفظ

پیش لفظ میں کیا ہوتا ہے؟ ہوتا تو کہانی میں ہے، تخلیق میں ہے۔ "نیلام گھر" شائع ہوا تو دوستوں نے اعتراض کیا، پیش لفظ کیوں نہیں لکھا؟ کم از کم یہ تو لکھ دیتے کہ اسے تم نے دس سال قبل لکھا تھا۔ قارئین کو یہ تو پتہ چل جاتا۔ دس سال — سوچتا ہوں، اس عرصہ میں کتنی کہانیاں لکھیں۔ دو سو سے بھی زیادہ۔ ناول؟ میں تب سترہ سال کا تھا جب پہلا ناول لکھا، وہ بھی سیکس پر۔ عقاب کی آنکھیں — پریم چند کے مزدور کی طرح اُسی چھوٹی سی عمر سے ایک عادت ڈال لی تھی۔ میز پر بیٹھنے کی اور کچھ نہ کچھ لکھنے کی — یہ عادت کم و بیش اب بھی ہے۔ دوست پوچھتے ہیں... اتنا زیادہ کیوں لکھتے ہو؟ سوچتا ہوں انھیں کیا جواب دوں؟ کبھی کبھی لگتا ہے کسی نظریاتی تبدیلی کا خواہاں ہے میرے اندر کا تخلیق کار کچھ نیا چاہتا ہے۔ اور اس نئے کے لئے بھٹکتا رہتا ہے۔ اس نظریاتی تبدیلی سے زندگی کے کتنے ہی موڑ پر لکھنے کے زاویے بدلے۔ اس طرف چلو، نہیں اس طرف۔ "نیلام گھر" بھی ایک پڑاؤ تھا۔ 'عقاب کی آنکھیں' بھی۔ 'شہر چپ ہے' بھی۔ 'لمحۂ آئندہ' بھی۔ یہ ناول بھی ۸۰ء سے پہلے کے ہیں۔ اور کسی نئے نظریاتی تصور کو الگ الگ ان میں بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے — میں ابھی ٹھہرا نہیں ہوں، بھٹکنے کی حالت میں ہوں۔ سوچتا ہوں، چھوٹی چھوٹی حقیقتیں زندگی کا روپ کیوں نہیں لے سکتیں۔ پھر کوئی سا، بہت عام سا واقعہ کہانی کیوں نہیں ہو سکتا۔ کوئی کوئی کہانی مجھے پسند آتی ہے تو دوست پوچھتے ہیں۔ یہ کیا لکھ دیا؟ کیسے کہوں کہ یہ کیوں لکھا۔ چیخوف کا کردار اگر اپنے چھینکنے پر شرمندہ ہو سکتا ہے اور چھینک اس وقت کے پورے رُوسی نظام کو لے کر زبردست کہانی بن سکتی ہے تو پھر عام زندگی میں

ہونے والا بہت ہی عام سا واقعہ کہانی کیوں نہیں بن سکتا؟ اور یہ کہ — مجھے چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کی تہہ میں جاتے ہوئے مزہ ملتا ہے۔

چھوٹی عمر میں، چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر بیٹھ جاتا۔ پھر کہانیاں سنایا کرتا۔ چھوٹی، اندر سے گڑھ کر، امّاں کہا کرتیں۔ کہانی کار بیٹا۔ مگر دل ہی دل میں پریشان رہتیں —— پیش لفظ کیوں لکھ رہا ہوں۔ پھر وہی ایک منظر نظر میں ہے۔ امّی دیکھ رہی ہیں اور میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو کہانیاں سنا رہا ہوں۔ امّی اب نہیں ہیں مگر یہ منظر آج بھی اچھا لگتا ہے۔ اس پیش لفظ کی ضرورت اس لئے بھی محسوس ہوئی کہ ان چند سطور کے ذریعہ امّی کی یاد تازہ کر سکوں۔

پتہ نہیں، میرے اندر کے رومانی آدمی میں ابّا نے بچپن میں جس تخلیق کار کو چھپا دیکھا تھا، وہ تخلیق کار سامنے آیا کہ نہیں لیکن اپنے اس افسانوی سفر میں ابّا کا تذکرہ نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ ابّا حضور (مشکور عالم بصیری) کو میں نے ہمیشہ انسائیکلو پیڈیا کی شکل میں دیکھا۔ ایسا انسائیکلو پیڈیا، ایسا شفیق باپ کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے اور زمانے میں کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے۔ مجھے ہمیشہ اس بات سے مایوسی رہی کہ میں ابّی حضور کے تصور کی ایک سیڑھی تک طے نہ کر سکا۔
بہر حال — افسانوی سفر میری آخری سانس تک جاری رہے گا۔ میں نے کیا دیا اور کیا دے رہا ہوں۔ یہ ابھی نہیں، آنے والا وقت طے کرے گا۔

◆◆

بھوکا ایتھوپیا

ٹھک ... ٹھک ... ٹھک ...

یہ کسی کے پیروں کی چاپ نہیں ہے۔ تنہائی میں اکثر ایسا ہوتا ہے جب اپنی اُلجھنیں کوئی صوتی آہنگ پیدا کر دیتی ہیں اور مستقل کانوں کے پاس نگاڑہ سا بجتا رہتا ہے۔ یہ کسی کے پیروں کی چاپ نہیں بلکہ خطرے کا سائرن لگتا ہے جو برابر میرے کانوں میں بج رہا ہے۔ یہ تیسری بار ہے جب میں نے اُٹھ کر سوئچ پر ہاتھ رکھا ہے۔ بلب روشن ہو گیا ہے۔ سوئچ سے ابھی تک ہاتھ ہٹایا نہیں ہے۔ کچھ سوچ رہا ہوں جب کہ اصلیت یہ ہے کہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوں۔ صرف اُتپلیندو کے بارے میں غور کر رہا ہوں کتنا بجا۔ گیارہ بجنے والے ہیں۔ کم بخت اب تک باہر ہے۔ اُتپلیندو نے بی۔ اے فائنل ایئر کا امتحان دیا ہے۔ مگر کسی کمپیٹیشن کی تیاری میں نہیں لگا ہے۔ کہتا ہے سب بیکار ہے۔ اسے گورنمنٹ کی چمچاگیری نہیں کرنی ہے۔ پتلا دُبلا اُتپلیندو۔ چھوٹے چھوٹے بال، بڑی بڑی گمبھیر آنکھیں، اندر کی طرف دھنسا ہوا گال، پھولی ہوئی ناک، جو بعض دفعہ اتنی سُرخ لگتی ہے جیسے کسی نے خون مَل دیا ہو۔ پیروں میں ہوائی چپّل ڈالے، جھولتا ہوا، چور ملیدہ کُرتا پاجامہ پہنے ... کبھی کبھی رات میں چوروں کی طرح اندر آتا ہے۔ ہلکے سے دروازے پر دوبارہ دستک دے گا۔ یہ ماں ہے جسے ہمیشہ سے اپنے بچّے کی آوارہ گردی میں بھی کسی معرکہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے —— چُپ چاپ دروازہ کھول دے گی مہاشویتا۔ چوروں کی طرح گردن جھکائے، اَدھ کھُلے دروازے سے پورا جسم اندر کر دے گا اُتپلیندو پھر ماں سے

پوچھے گا۔" پتاجی جاگے تو نہیں ؟"

"نہیں رے، چل کھالے ... اتی اتی رات کو گھومتا رہتا ہے تو۔"

وہ اپنے کمرے سے دیکھتا ہے۔ اڑگی ہوئی کواڑ سے۔ جہاں اندھیرا ہے اور جہاں سے وہ سب کو دیکھ رہا ہے اور اسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ گویا عمرو عیار کی ٹوپی ہو گئی۔ پہن لیا غائب ہو گئے۔ سب کو دیکھ رہے ہیں اور انھیں کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ ہاں تو وہ بھی دیکھ رہے ہیں اور مہا شویتا بھی کہ لاڈلے نے بازو میں کچھ داب رکھا ہے۔

"یہ کیا ہے ...؟" مہا شویتا پوچھتی ہے۔

"یہ ـــ" اپلیندو گھبراتا ہے ..." نہیں ... کچھ بھی نہیں ... کچھ بھی تو نہیں ..."

"کچھ بھی نہیں"۔

"کچھ بھی نہیں ماں... تم تو جھوٹ موٹ کا شک کرنے لگتی ہو...؟"

کھانا پروسا جا چکا ہے۔ رسوئی میں کھاٹ لگی ہے۔ پیر ہاتھ دھونے کے بعد پیر سمیٹ کر بیٹھ گیا اپلیندو۔ بڑے بڑے لقمے منہ کے اندر ٹھونس رہا ہے اور مہا شویتا پوچھ رہی ہے۔

"یہ سب نہیں کرنا چاہیئے تھا تجھے ... تیرے پتاجی کی نوکری پر ...؟"

بے جان آوازیں چاروں طرف سے پھر گھیرنے لگی ہیں۔ باہر نکلے تھے گھوش بابو... دو قدم چل کر پھر اندر کو لوٹے۔ سوئچ پر ہاتھ رکھا۔ کمرہ پھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ مہا شویتا کے کمرہ کی لائٹ بھی بند ہے۔ مگر وہ جانتا ہے۔ مہا شویتا کی آنکھوں میں نیند نہیں ہوگی۔ لاڈلے کا انتظار رہو گا۔ اس کے بے جان پیروں کی چاپ بھی محسوس کر لیتی ہے مہا شویتا۔ بند آنکھوں سے گن ہو گا۔ ایک، دو، تین، چار چکر ہو گئے ہیں باہر کے۔ چھ بار لائٹ جلی ہے۔ گھوش نہیں سوئے اب تک ... پورا حساب چل رہا ہو گا۔ اندھیرے میں لوٹتے ہوئے اپنے بستر پر بیٹھ جاتے ہیں گھوش بابو، بالوں کو کھجلاتے ہیں۔ ہوائی چپل ایک طرف کرتے ہیں۔ سونے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر نہیں۔ نیند نہیں ہے۔ سامنے وہی ہے۔ وہی اتّا سا اپلیندو... بچپن میں کتنا مار اکرتے تھے وہ۔ پڑھ۔ نہیں پڑھے گا کم بخت۔ کوئلہ کی دوکان کھولے گا۔ تیرے باپ کے پاس کوئلہ کی دوکان کھلوانے کا بھی پیسہ نہیں ہے۔ سمجھا۔ تجھے ڈاکٹر بننا ہے، انجینئر، آئی۔ ایس افسر، جانگھیا پہنے ہوئے اپلیندو مار کھا کر تیز آوازیں

رونا شروع کر دیتا ہے۔ ناک سے نیٹا بہنے لگتا ہے۔ دونوں ہاتھ ہنٹا میں سن جاتے۔

"چھی ۔۔۔ چھی ۔۔۔ گندہ ۔۔۔ تو اپنی ماں سے ہی پڑھو۔ جاہل رہ۔ گنوار۔۔۔ جنگلی۔۔۔"

مارنے پیٹنے کے جنگلی عمل کے بعد وہ گھڑی دیکھتے۔ کتنا بجا۔ اُف! آٹھ بج گئے۔ دو گھنٹے بعد آفس نکلنا ہے۔ غصّے میں ایک جھاپڑ اور لگاتے۔

"کم بخت بڑھتا نہیں ہے۔"

مہاشویتا کو مچھلی بھوننے کا آدیش دے کر وہ اپنے کمرے میں آجاتے۔ اپلیندو دیر تک آں ۔۔۔ آں کرتا رہتا۔ بیچ بیچ میں مہاشویتا کے بولنے کی آواز آتی رہتی۔ "اتنا کوئی مارتا ہے کیا اپنے بچّوں کو۔ تمہیں تو پڑھانے بھی نہیں آتا۔ اتنی عمر ہوگئی، کوئی کام سلیقے کا نہیں سیکھا۔"

مچھلی کی گندھ ناکوں سے ٹکراتی، بنگالی بابو ایک دَم سے سب کچھ بھول جاتے۔ اب صرف ایک ہی چہرہ آنکھوں کے آگے گھومتا۔ ٹکو لفاڑ بیٹے کا چہرہ ۔۔۔ جو صبح ہی آکر ہنگامہ کرتا۔ گھوش دادا ۔۔۔ مچھری ۔۔۔ ایک دَم تاجا مچھری ۔۔۔ ابھی ابھی سون سے آئی ہے، سون مچھری، دادا ۔۔۔ سون مچھری، بنگال میں سنتے تھے۔ سون کی مچھلیاں ایک دَم سونے جیسی ہوتی ہیں۔ کھانے میں بھی سونے جیسی اور یہاں آنے کے بعد، جب سے وہ اس محلّے میں بسے ہیں کباڑیوں کے محلّے میں، اس ٹھلکے نے سون مچھریا کی عادت لگا دی ہے۔ بنگال قحط کے فوراً بعد ان کی بدلی بہار کے اس پھوہڑ ضلع میں ہوئی تھی۔ پھر جو ٹکے تو ٹکے رہ گئے۔ اس بیچ دو بار بنگال چلنے کی بات بھی ہوئی، مگر جو کہتے ہیں، ایک بار بہار راس آجائے تو ۔۔۔ دوسرے دوستوں نے تعجّب کیا گھوش دادا آپ گئے نہیں؟ ۔۔۔ ہاں نہیں گیا ۔۔۔ وہ تھوڑا غصّے میں کہتے اس میں تعجب کی بات کیا ہے اور وہاں ہے ہی کون سوائے جھگڑے کے اس گھر کے جس پر دو بھائیوں نے پہلے سے ہی اپنا قبضہ جما کر رکھا ہے۔

گھوش بابو کے اندر تھوڑی کڑواہٹ گھُل جاتی ہے۔ ایک چھوٹی سی زندگی میں کتنے واقعات آدمیوں کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ بستر پر لمبا لیٹ گئے ہیں گھوش دادا ۔۔۔ آنکھوں میں پھر وہی چہرہ ابھرتا ہے، پریمل گھوش کے بچپن کا ۔۔۔ اپلیندو نے اب جس رُوپ میں جنم لیا ہے۔ ان کا اپنا بچپن ان کے سامنے ہے اور بڑی بڑی گمبھیر آنکھیں سر جھُکائے ان سے مخاطب

ہیں۔

"آپ یہ نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

کیا ——؟ وہ اچانک سناٹے میں آ گئے ہیں۔ نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے — اندر بھاری چل رہی ہے۔

سر جھکائے کھڑا ہے اتپلیندو —" جسے آزادی کہتے ہیں، یہ وہ آزادی نہیں ہے حکومت کی غلامی کرنے میں ہونٹ سی لینا پڑتا ہے۔ ایک کانشس آدمی اپنے ہونٹ کو سی نہیں سکتا، جو ہو رہا ہے پورے ملک میں۔ ہمیں توڑے جانے کی کارروائی کا سٹ اور ریلی جن کے نام پر ہم میں پھوٹ ڈالنے کا ڈراما۔ مذہب سے فائدہ اُٹھانے والی سیاسی چالیں۔ ہم اور غلام نہیں بن سکتے حکومت کے۔ سب لوگ اگر چپی سادھ لیں تو نازیوں کی فوج بڑھتی جائے گی —"

اتپلیندو کے چہرے کے مانس پھنچ گئے ہیں۔ اب کسی ہٹلر اور مسولینی کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ آپ یہ نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے ...؟

وہ ڈھیٹ بنا سامنے کھڑا ہے۔ اب آنکھیں لڑانا بھی سیکھ گیا ہے۔ یہ سب کہاں سے سیکھا .... گھوش دادا سوچتے ہیں۔ جب پہلی بار معلوم ہوا تھا انھیں، اپنے ہی محلّے کے آدمی سے، کہ اتپلیندو کی سنگت بگڑ رہی ہے۔ وہ پوسٹر چپکاتا ہے۔ راتوں کو نکڑ ڈرامے کرتا ہے۔ چیختا ہے۔ حکومت کے خلاف نعرے لگاتا ہے تو پہلی بار وہ بوکھلائے ہوئے گھر آئے تھے۔

"وہ کہاں ہے اتپلیندو کا بچہ؟"

اس وقت اتپلیندو آئی۔اے میں تھا۔ امتحان کی تیاری سے زیادہ اس کا دل ان بیکار سے کاموں میں لگتا تھا۔ سُننے میں یہ بھی آتا کہ اسکول بھی نہیں جاتا ہے۔ تھرڈ گریڈ ایکٹیویٹیز میں اُلجھا رہتا ہے۔ پھر معلوم ہوا وہ کسی آرگنائزیشن سے جُڑ گیا ہے۔ جو بڑے پیمانے پر حکومت کے خلاف تحریکیں چھیڑتی رہتی ہے۔ گھوش بابو کا دماغ قابو میں نہیں تھا۔ بس یہی سوچ رہے تھے سامنے نظر آ جائے تو چمڑا ادھیڑ کر رکھ دوں اور پھر دکھائی دیا تھا اتپلیندو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا —— اپنے کمرے میں، بڑے بڑے پوسٹروں کے ساتھ، جنھیں وہ پھیلانے میں لگا تھا۔

ایک ملے کو سکتے میں آگئے گھوش بابو۔۔۔ اپلیندو اب تک انہیں نہیں دیکھ پایا تھا۔ کچھ پوسٹر دیواروں پر بھی ٹنگے تھے۔ عجیب عجیب تصویریں بنی تھیں۔ بھنچی ہوئی مُٹھیاں، سلگتے ہوئے نعرے انقلاب اور انگاروں کی بولیاں بول رہے تھے پوسٹر۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے۔۔۔" آواز لڑکھڑا رہی تھی گھوش بابو کی۔

"یہ۔۔۔" اپلیندو جیسے خواب سے جاگا تھا۔

مگر تب تک وہ اپنے وزنی ہاتھوں سے اس کے جسم پر حملہ بول چکے تھے: "بول سور! میری نوکری ختم کرائے گا۔ فٹ پاتھ پر آنا چاہتا ہے کیا؟ کھائے گا کیا؟ پٹے گا کیا؟ مالوم، سرکار کو مالوم ہوگیا کہ ایک سرکاری آدمی اپنے گھر سانپ پال رہا ہے تو۔۔۔؟ مالوم۔۔۔؟ تو بیٹ نو ٹھیک ہے تیری؟ پھنسوائے گا سب کو۔۔"

ہاتھوں اور پیروں کی ٹھوکر سے کچومر نکل گیا تھا اپلیندو کا۔ مہاشویتا نے آکر شور مچایا۔ "کیا کرتے ہو، مار ڈالو گے۔۔"

"یہ۔۔۔ یہ سب دیکھ رہی ہو، نوکری چلی جائے گی۔ ہم سب فٹ پاتھ پر آجائیں گے۔۔"

فرطِ جذبات سے ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ پہلی بار۔ ہاں پہلی بار غور سے انھوں نے مہاشویتا کو دیکھا۔ جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیواروں پر لٹکے پوسٹر کے مضمون پڑھ رہی تھی۔ جہاں گیت کی پنکتیوں میں، غزل کے مصرعوں میں، پریم چند، لوشن، کارل مارکس، ماؤزے تنگ یا کسی روسی ناولسٹ کی کتاب کے کسی پاراگراف سے انقلاب کی بات کہی گئی تھی۔

مہاشویتا نے پہلی بار مضبوط آواز میں کہا تھا "اس میں غلط کیا ہے؟"

"تمھیں کچھ غلط نہیں دِکھ رہا"

"کچھ بھی نہیں ــــــ"

"یہ حکومت کے خلاف ہے۔ یہ باتیں مجھے جیل پہنچا سکتی ہیں اور تم سب کو فٹ پاتھ پر۔۔"

"آنے دو ــــــ" پہلی بار اس گھریلو بنگالن کی آنکھوں میں گھوش بابو نے سلگتی ہوئی نفرت کو محسوس کیا تھا۔ "اتنے غلام ہیں ہم کہ ہماری سچ بات بھی ہمیں نوکری سے نکلوا سکتی ہے تو تھوکتی ہوں ایسی نوکری پر۔ اس میں جھوٹ کیا ہے، غلط کیا ہے"

اتپلیندو سر جھکائے کھڑا تھا اور گھوش بابو ـــ اب سے برسوں پیچھے چھپا ہوا منظر دیکھ رہے تھے۔ شرمائی شرمائی سی مہاشویتا۔۔۔ نذرالاسلام کی کسی نظم کے مصرعوں کو گنگنا رہی تھی۔ گھوش بابو نے فخر کی سانس لی تھی۔ بنگالی لڑکیوں کے خون میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ غلط اور ناانصافی کو برداشت نہیں کر پاتیں۔ ساہتیہ، ادب انھیں وراثت میں ملتا ہے۔ نذرالاسلام اور رویندر ناتھ ٹیگور کی کویتائیں ایک طرح سے وہ جہیز میں اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ اور آج یہی کویتائیں ایک ماں بن کر بول رہی تھیں۔۔۔ تھوکتی ہوں ایسی نوکری پر۔۔۔ اس میں غلط کیا ہے۔۔۔۔۔ جھوٹ کیا ہے۔۔۔؟

وہ ہار گئے تھے۔ اپنے کمرے میں لوٹتے ہوئے وہ سچ مچ اپنی ہار محسوس کر رہے تھے۔

گھوش بابو تھوڑی آہٹ سن کر چونک گئے۔ مہاشویتا اٹھی تھی۔ بتی جلی تھی۔ شاید گھڑی دیکھنے کے لیے بتی جلائی ہو یا شوچ جانے کے لیے۔ بتی پھر بجھ گئی۔ یعنی گھڑی دیکھنے کے لیے۔ لاڈلے کا انتظار ہوگا۔ ساڑھے گیارہ بج گئے۔ کراہنے اور سانس لینے کی گہری آواز کے بیچ پھر لوٹ جانے کا احساس ہے۔ بتی بجھ گئی ہے۔ شویتا پھر لیٹ گئی ہے۔

اتنے سے اتپلیندو میں کتنا زبردست چینج آگیا تھا۔ کتنے دن ہی گزرے ہیں اس واقعہ کو۔ آفس سے لوٹتے ہوئے گوپالی کنواں کے قریب وہ ٹھہر گئے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں اکثر نکڑ ڈراموں کی ریہرسل ہوتی رہتی تھی۔ ہر روز۔۔۔ روزانہ ہی۔ ہاتھ میں چھاتا، آنکھوں پر جھولتا چشمہ، پیروں میں چپل، دھوتی اور کرتا پہنے گھوش دادا ٹھہر گئے۔ جھولتا ہوا چشمہ ناک پر برابر کیا۔ کچھ بڑبڑاتے ہوئے گوپالی کنواں اسٹیج پر نظر دوڑائی چونک گئے۔ چشمہ ایک بار پھر برابر کیا۔ اندر جیسے آگ لگ گئی۔ یہ تو اپنا اتپلیندو ہے۔ اور اتپلیندو ایکشن کے انداز میں ایک آدمی کو روک رہا تھا۔

"اے۔۔۔ اس ٹرک میں کیا ہے؟"

"کھانے کا سامان۔"

"کہاں جا رہا ہے ـــ؟"

"جافنا۔"

"جافنا کیوں؟"

"جافتا میں لوگ بھوکوں مر رہے ہیں۔ یہ کھانا وہیں پہنچایا جا رہا ہے۔"

"نہیں، نہیں۔"

کچھ لوگ اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں، جیسے ٹرک روک رہے ہوں۔ پھر اتپلیندو اور دوسرے ساتھیوں کی آواز اُبھرتی ہے۔

"ہم بھوکے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی ایک ایتھوپیا ہے۔ ہم گھاس کھا رہے ہیں۔ ہمارے تمام شہر کالاہانڈی۔بن چکے ہیں۔ ہم مُردہ۔ بلی چوہے کُتّے کھا چکے ہیں۔ ہمیں اب انسانوں کو کھانے کی اجازت دو۔ نہیں تو یہ کھانا دو۔ یہ کھانا باہر نہیں جائے گا۔ یہ ہماری محنت کا انعام ہے۔ اسے ہم کھائیں گے۔"

"نہیں نہیں۔" ٹرک والا ہٹلر کے انداز میں انھیں دُور ہٹاتا ہے۔ "کتو، جانورو بھاگو، تم وہی کھاؤ گے۔ چوہے بلی۔ وہی تمہارا مقدّر ہے۔"

"ہم بھوکے ہیں۔ ہمیں کھانا دو۔"

دوسرا لگھگھیائی آواز میں چیختا ہے "لُوٹ لو۔۔۔"

سب مل کر چلّاتے ہیں "لُوٹ لو۔۔۔ لُوٹ لو۔۔۔"

اور سب مل کر ٹرک والے پر حملہ کر دیتے ہیں۔ اور۔۔۔

گھوش بابو کی آنکھوں میں چمک لہراتی ہے۔ لڑکے خوش ہیں۔ ایک قطار میں کھڑے ہیں۔ سُر میں سُر ملا کر گا رہے ہیں "ہم ہوں گے کامیاب۔ پُورا ہے وشواس" خود بھی گنگناتے ہیں۔

"ہم ہوں گے کامیاب۔ پُورا ہے وشواس۔۔۔"

پھر نظر آتا ہے اتپلیندو، جو اُن سے کہہ رہا ہے "آپ یہ نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے، استعفیٰ کیوں نہیں دیتے۔ آپ یہ نوکری چھوڑ دیجیے۔ برابری کی رسم اس وقت تک پُوری نہیں ہوگی جب آپ جیسے تمام لوگ سرکاری نوری سے استعفیٰ دے کر سِسٹم کو ٹھیک کرنے کے لیے سنجیدگی سے غور کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ سرکاری نوکری کا مطلب ہے زبان بند۔ گھر کے کمرے میں سڑی گلی دیو ستھا کا ماتم منانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جو بھگتنا تھا، پہلے کی نسل بھگت چکی ہے۔ پھر ہم بھگت رہے ہیں۔ آگے کے لوگوں کو بھگتنا نہیں پڑے اس کے لیے۔۔"

"ٹن ... ٹن ... ٹن ...

کان کے پاس مستقل نگاڑہ بج رہا ہے۔ گھوش بابو کروٹ بدلتے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت گھڑی کی سوئی بارہ بجنے کا اعلان کرتی ہے۔

گھوش بابو کا دل دھک دھک کرتا ہے۔ اتپلیندو نے اتنی دیر کیوں کی۔ اتنی دیر تو وہ کبھی نہیں کرتا۔ گھر میں لے دے کر صرف دو وجود ہیں۔ چھوٹا سا گھر۔ تین کمروں پر مشتمل۔ اُن کے دوست کہتے بھی ہیں ... اے۔جی آفس میں کام کرنے والا معمولی سے معمولی آدمی بھی اپنا مکان کھڑا کر لیتا ہے ... مگر نہیں۔ گھوش بابو بے ایمان نہیں۔ وہ یہ نہیں کر سکتے۔ تبھی تو یہ تین کمروں والا کرائے کا مکان کافی ہے۔ دو جن کی موجودگی میں بھی یہ بھائیں بھائیں کرتا رہتا ہے۔ اتپلیندو سے خود کو الگ کرنا چاہتے ہیں گھوش بابو ... ہفتہ بھر پہلے کا ایک منظر ان کی آنکھوں میں اُتر آیا ہے۔ ایک بوڑھا آدمی۔ ایک آنکھ پر ہری پٹی چڑھی ہے۔ چہرے پر دُنیا جہاں کا غم سمیٹے ہاتھ جوڑے سنہا صاحب کی کرسی کے پاس کھڑا ہے ...

صاحب ... ہمری فائیل ... ریٹائر کیے چھ مہینے گذر گئے۔ اب تک پروویڈینٹ فنڈ اور گریجوئی کا روپیہ نہیں مل سکا ہے۔"

سنہا بغل والی کرسی پر بیٹھا ہے۔ ایک لمحے کو فائل سے اُس کی نگاہ اُٹھتی ہے۔

"تم پھر آگئے۔ بہت پریشان کر دیتے ہو۔ چھ مہینہ کیا یہ بہت زیادہ ہے۔ تمھاری فائل بڑھ رہی ہے۔ اب جاؤ بھی۔ اے جی کے یہاں گئی ہے۔"

"نہیں گئی ہے" بوڑھا غصّے میں کہتا ہے "ہم اے۔جی کے پاس گئے تھے۔ وہاں فائیل نہیں گئی ہے۔ بوڑھے کی آواز لرز رہی ہے۔ صاحب، ہم نے آنکھ بنوائی ہے۔ بیوی ٹی۔بی سے مر رہی ہے۔ دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں۔ ہمارا حق بنتا ہے صاحب۔ پنشن کا کاغذ۔"

"ایک ہفتہ بعد آنا" ٹالنے والے انداز میں سنہا کہتا ہے اور دوبارہ فائیل دیکھنے لگتا ہے۔"

بوڑھا بدبداتا ہوا چلا گیا ہے ... گھوش بابو اُٹھتے ہیں۔ سنہا کو دیکھتے ہیں ...

"سنہا صاحب! وہ فائیل تو ...؟"

"ہاں وہ فائیل میرے پاس ہے۔ اے۔جی کے پاس نہیں گئی۔"

"تو آپ بڑھاتے کیوں نہیں؟"

سنہا کی نظریں فائیل سے ہٹی ہیں۔" آپ نہیں جانتے گھوش بابو اس آفس کا کام۔۔"اس لفظ پر زور دیتے ہیں سنہا صاحب۔ اس کی فائیل بڑھانے سے مجھے کیا ملے گا۔ اس طبقے کے لوگ کسی نہ کسی طرح اپنا گزارہ کر ہی لیتے ہیں۔ ہم نہیں کر پاتے۔ ہم ایک ٹی وی رکھیں گے، ایک فریج ۔۔۔ ہو سکا تو وی۔ سی۔ آر بھی۔ مہمانوں کی ان کی حیثیت کے مُطابق خاطر داری کریں گے جب کہ یہ لوگ تو روگا کر ۔۔۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ہمدردی جتلانے کی ۔۔۔

مگر وہ بھوکا تھا۔" پتہ نہیں یہ میرے منہ سے کیا نکلا ہے۔ سنہا صاحب ہنس رہے ہیں۔ آنکھوں میں بنگال کا قحط گھوم رہا ہے۔ مردہ آنکھیں ۔۔۔ جیسے قبر سے جھانک رہی ہوں۔ کوئی عورت اپنے بچے کو کھا گئی۔ بھوک سے ابلے ہوئے چہرے۔ پُورا شہر قبرستان لگ رہا ہے یہ بوڑھا ۔۔

کھانستے ہیں گھوش بابو ۔۔۔ اور وہ نکڑ ڈرامہ ۔۔۔ پورا شہر کالا ہانڈی بن گیا ہے ۔۔۔ ہمارے یہاں بھی بستا ہے ایک ایتھوپیا۔ اکیسویں صدی میں لے جانے والے فرفیکس اور بوفورس کے ڈرامے بند کرو ۔۔ اختلاجی کیفیت میں اندر جیسے اتھل پتھل مچی ہے ۔۔۔ یہ خالی خالی انتڑیاں دیکھو ۔۔۔ ان میں راشن ڈالو۔ مرتے ہوئے آدمی کی یہ بے جان آنکھیں دیکھو ۔۔۔ جا فنا ۔۔ کھانے کا یہ سامان جا فنا نہیں جائے گا۔ ہمارے یہاں بھی بستا ہے ایک ایتھوپیا ۔۔ یہ ہماری محنت کا انعام ہے۔ پھر کئی آوازیں ۔۔۔ لُوٹ لو ۔۔۔ لوٹ لو ۔۔ "

بھوک ۔۔۔ قحط ۔۔۔ بیمار چہرے ۔۔۔ گھوش بابو رُکتے ہیں۔ ہاتھ جوڑتی ہوئی سوئیاں ایک دوسرے سے الگ ہوئی ہیں، کانوں کے پاس ہتھوڑا بج رہا ہے۔ کیا سچ مچ انھیں استعفٰی دے دینا چاہئیے۔ ان کے جیسے تمام لوگوں کو۔ یہ آزادی کے وقت کا زمانہ نہیں۔ سب الگ الگ ہیں۔ مذہب کے نام پر، پارٹی کے نام پر ۔۔ پھوٹ پڑ گئی ہے اور انھیں جوڑنے کے لیے، اکائی بنانے کے لیے، اپنے اپنے طرز پر سب کو زبان کھولتے ہوئے انقلاب کی صف میں آنا پڑے گا اور اس کے لیے ۔۔۔

گھوش بابو کی آنکھوں میں آج صبح کا منظر لہرا رہا ہے۔ وہی بوڑھا ہاتھ جوڑے گڑگڑا رہا تھا۔ آج آنکھوں پر پٹی بھی نہیں تھی۔ آنکھیں بہہ گئی تھیں۔ بہہ نہیں گئی تھیں۔ پھُوٹ گئی تھیں۔ سنہا کی بغل والی

کرسی پر ایک ریٹائرڈ آفیسر بیٹھا ہے۔ سنہا آؤ بھگت میں لگا ہے۔ چائے پیجئے، سر آپ بیٹھ جائیے، میں خود دستخط کر کے منگوا لیتا ہوں۔ بیچ بیچ میں گڑگڑانے اور گھگھیانے کی آواز۔۔۔ بوڑھے کی۔"
مائی باپ۔۔۔ آنکھیں پھوٹ گئیں، دوا دارو نہیں کر سکا صاحب۔۔۔ میرے مائی باپ تم ہی ہو۔ گریچوئی کا روپیہ دلوا دو۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں ہے۔ اے جی سے سائن کروا دو صاحب میرا پیسہ دلوا دو مائی باپ۔۔۔

ٹکڑے ٹکڑے کتنے آنسو ہیں جو مجھے قبرستان میں دفن کر رہے ہیں۔ سنہا مشینی بن گیا ہے۔ آفیسر نظر اٹھاتا ہے۔ بوڑھا آدمی بول رہا ہے۔۔۔

"بس یونہی سر، یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ کام ایک ہی دن میں ہو جائے گا!"

آفیسر کہہ رہا ہے۔ ایک ہفتہ پہلے جب ریٹائر ہوا تو بہت پریشان تھا۔ یوں تو سارے کاغذات ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی کلیئر کروا لیے تھے، پھر بھی پریشان تھا۔

"گھبرائیے نہیں سر، چائے پیجئے۔"

سنہا اُٹھ رہا ہے۔ آفیسر چائے پی رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں فائل دبی ہے۔ میری کرسی پر وہ آکر ٹھہر گیا ہے۔ چاروں طرف کاغذات اور فائل کے ڈھیر لگے ہیں۔

"گھوش بابو۔۔۔ یہ کاغذات آپ۔۔۔ ارجنٹ ہے۔ وہ میری طرف دیکھتا ہے۔

بوڑھے نے اچانک سنہا کے پیروں کو پکڑ لیا ہے اور پیروں سے ہو کر ایکدم اس نے اس کے گلے پر ——— فائل میرے ہاتھوں میں کانپ گئی ہے۔ میں نے سختی سے اپنی انگلیاں فائل پر جما رکھی ہیں۔

بوڑھا پاگلوں کی طرح سنہا سے لپٹ گیا ہے۔ خونی۔۔۔ میری آنکھیں چلی گئیں۔ تمہارے پاس ہے میری فائل۔۔۔ میری فائل نکالو۔ ہم بھوکوں مر رہے ہیں۔ کھانے کو دانہ نہیں ہے۔"
سنہا ہاتھ جھٹکتا ہے۔ چھوڑو چھوڑو۔ گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔ بوڑھا رو رہا ہے۔ اس کے آنسو بہہ رہے ہیں۔

گھوش دادا سسکیاں لے رہے ہیں۔ ناکارہ حکومت، حکومت کے ناکارہ ٹھیکیدار۔ وہ فائل اب بھی ان کے پاس پڑی ہے۔ وہ اے۔ جی کے حوالے نہیں کر سکے۔ آنکھوں میں مرتا ہوا بنگال ہے۔

اور دوسری طرف وہ بوڑھا، جس کی ایک آنکھ کی روشنی ختم ہو گئی ہے۔ کل وہ پٹیاں چڑھانے آیا تھا اور آج . . . کھانا جا فنا جا رہا ہے۔ اپنی سسکیاں وہ خود سُن رہے ہیں۔ شہر شمشان بن رہا ہے۔ مرگھٹ، جہاں صرف مُردے جل رہے ہیں۔ ہاہا کار کرتے ہوئے شعلے آسمان چھو رہے ہیں اور اس شعلے میں سب جھلس رہے ہیں۔ وہ بھی، مہاشویتا بھی، اتپلیندو بھی اور سارے کے سارے . . . شعلے آسمان چھو رہے ہیں۔

مہاشویتا کے اُٹھنے کی آواز پھر ہوئی ہے۔ چوکیدار نے ایک کا گھنٹہ پول پر مارا ہے۔ گھوش بابو کا دل رہ، رہ کر دھڑک رہا ہے۔ مہاشویتا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے دروازے پر آکر ٹھہر گئی ہے۔ کسمسا کر وہ بھی اُٹھنا چاہتے ہیں۔ بدن کی ہڈیاں زوروں سے چرمرا اُٹھی ہیں . . . آہ . . . ہ . . . ہ . . .!
چُپ چاپ کوئی سوئچ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ بتی جل گئی ہے۔ موت جیسی سنجیدگی اوڑھے کھڑی ہے مہاشویتا۔ ہونٹوں پر سوال . . .

"اتپلیندو کے بابو سو کیوں نہیں جاتے . . ."

"سو . . ."

آنکھوں میں پرچھائیوں کا رقص شروع ہو گیا ہے۔ گھوش داد بڑبڑاتے ہیں۔ اتپلیندو۔۔۔
بوڑھی آنکھوں سے ایک کراہ پھوٹتی ہے "صبر کیوں نہیں کرتے ہو تم۔ اب کیا اتپلیندو کو مرگھٹ سے لاؤ گے۔ سو جاؤ۔ آنکھیں بند کر لو"

"مرگھٹ . . . سو جاؤ . . . آنکھیں بند کر لو ـــــ" آنکھوں میں نمی اُتر رہی ہے منجمد ہو گئے ہیں گھوش بابو۔ اپنی جگہ ساکت و جامد۔ لکوا مار گیا ہے پورے بدن کو . . .

آنکھوں میں کتنی جلد کتنے منظر ایک ساتھ بدلنے شروع ہو گئے ہیں . . .

اِتنے سے اتپلیندو کی آنکھوں میں پہلی بار خون دیکھا تھا۔ ڈھیر سارا خون . . . شاید جو خون سڑکوں پر بہہ گیا تھا، گلیوں میں پھیل گیا تھا وہ پورا پورا خون اتپلیندو نے اپنی آنکھوں میں بھر لیا تھا۔ اس دن گویا لی ٹاور پر اتپلیندو اور اس کے دوستوں کا نکڑ ناٹک چل رہا تھا۔ یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب شہر کی فضا خراب ہوئی تھی۔ کافی لوگ مارے گئے تھے۔ کرفیو لگا رہا تھا۔ پھر کرفیو ٹوٹا۔ اتپلیندو اور اس کے دوستوں کو باہر بتیاتے ہوئے دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔

"سالے جھوٹ بولتے ہیں۔ چار مارے گئے۔ پُورا محلّہ پھونک دو۔ محلّے میں کیا چار ہی لوگ ہوتے ہیں؟"

"وہ کہتے ہیں جتنی لاشیں ملیں گی، گنتی بھی اتنی ہی ہوگی۔ لاشیں ابھی صرف چار ملی ہیں؟"

"جھوٹ ___ ناکے بندی کر رکھی ہے سالوں نے۔ پُورا دن جس محلّے سے دھواں اُٹھتا رہا ہو وہاں صرف چار لاشیں نہیں ہوسکتیں ..."

اور گوپالی ٹاور کے بیچ پر اُن لڑکوں کا ناٹک چل رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا جی میں آیا کہ گھوش بابو بھی ناٹک دیکھنے والوں میں شامل ہوگئے ہیں۔

ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چار لڑکے نظر آتے ہیں۔

ایک آدمی پیچھے سے آتا ہے، روکنے کے انداز میں ..." اے بھائی ٹھہر جاؤ... رُک جاؤ..."

چاروں ___ "کیا بات ہے؟ بات کیا ہے؟"

وہی آدمی۔ "تم لوگ کون ہو۔ کون ہو تم لوگ ..."

چاروں (مسکراہٹ اور طنز سے) "___ ہم ___ ہم ہندو مسلم سکھ عیسائی۔ سب آپس میں بھائی بھائی۔"

"بھائی بھائی" وہی آدمی ہنستا ہے ..."ابھی جو احمد نے پنڈت کا گھر جلایا اور پنڈت نے احمد کے گھر والوں کو گولیوں سے بھون دیا۔ وہ لوگ کون تھے۔ کون تھے ..."؟

چاروں (ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے) وہ... ہم نہیں تھے۔ ہم تو دوست ہیں۔ ہم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔"

وہی آدمی۔ تم لوگ سچ سچ دوست ہو۔

چاروں (ایک ساتھ) ہاں۔

آواز ___ تم لوگ ایک دوسرے کے خلاف باتیں کرتے ہو۔"

چاروں (زور سے) کبھی نہیں...

آواز ___ پھر وہ کون ہے۔ کون ہوسکتا ہے...

آواز گونجتی ہے۔ اچانک پیچھے سے کھادی کا کُرتا پائجامہ پہنے اور ٹوپی لگائے ایک شخص بھاگتا ہوا آتا ہے اور مسخری کے انداز میں بھاگنے کی ایکٹنگ کرتا ہے . . .

چاروں ـــ وہ یہی ہے . . . یہی شخص . . . یہی ہو سکتا ہے . . .

اب پانچوں مل کر، پکڑو اُسے ـــ پکڑو . . . جانے نہ پائے۔

بہت دیر تک بھاگنے اور پکڑنے کی ایکٹنگ ہوتی ہے۔ آخر کو وہ کھادی دھاری فرار ہو جاتا ہے۔

پانچوں ـــ بھاگ گیا۔

ایک ـــ اب وہ دوسرے شہر جائے گا۔

سب مل کر۔ آؤ اُسے تلاش کریں۔ اُسے تلاش کرنا بہت ضروری ہے . . .

وہ لوگ اسٹیج سے اتر جاتے ہیں۔ اسی بیچ۔ اسٹیج پر دائیں اور بائیں طرف سے دس بیس آدمی بھوت کا ماسک لگائے داخل ہوتے ہیں۔ ان کے گلے میں ایک بورڈ جھول رہا ہے جس پر لکھا ہے۔ بھوکا ایتھوپیا . . . یہ بورڈ جھول رہا ہے۔ یہ جسم کو عجب عجب طرح سے حرکت دے رہے ہیں . . .

کورس ـــ ہم بھوکے ہیں۔

ـــ ہم ننگے ہیں . . .

ایک ـــ ایتھوپیا مر رہا ہے۔

دوسرا ـــ یہاں کا ہر شہر کالا ہانڈی ہو رہا ہے۔

تیسرا شخص مُنہ سے ایروپلین کے چلنے کی آواز نکالتا ہے۔ سب مل کر آسمان کی طرف دیکھتے رہیں "وہ کیا جا رہا ہے؟"

اُن ہی میں سے ایک (جھولتے ہوئے) راحت کا سامان، کھانے کا سامان، جا رہا ہے۔ باہر جا رہا ہے . . .

سب مل کر ـــ راحت کا سامان باہر جا رہا ہے، کہہ کر بدن کو حرکت دینے لگتے ہیں۔

اسی درمیان اسٹیج پر وہ کھادی دھاری دوڑتا ہوا پریشان حال چڑھتا ہے۔ اب وہ

چاپلوسی کے انداز میں ان بھوکے بھوتوں کو دیکھ رہا ہے جو مسلسل ہل رہے ہیں۔ پیچھے پیچھے وہ پانچوں بھی داخل ہوتے ہیں۔ ایک، پکڑلو اسے جانے نہ پائے۔ یہ سارے فساد کی جڑ ہے "

پانچوں (مل کر) یہ آگ لگاتا ہے۔ گھر توڑتا ہے۔"

سارے بھوت مل کر، ہم بھوکے ہیں ...

ہم ننگے ہیں ...

اور اسی کے ساتھ سب مل کر اس کھادی دھاری کو گھیر لیتے ہیں۔ ایک گولائی سے ...

اور اب ... اسٹیج پر کڑ کڑ کڑ کی آواز گونج رہی ہے۔ جیسے بہت دنوں سے بھوکے لوگ آدمی کے گوشت کھانے پر اتر آئے ہیں۔ ایک بھیانک چیخ کھادی دھاری کی ... اور ...

گھوش بابو اوپر سے لے کر نیچے تک کانپ گئے ہیں۔ اُف بھگوان، یہ لڑکا تو ... کیا بھیانک ناٹک ہے۔ اب سب لڑکوں کا کورس چل رہا ہے۔ ہم ہوں گے کامیاب، پورا ہے وشواس۔ اپنا ہے وشواس ... ہم ہوں گے کامیاب ایک دن "

گھوش بابو چھاتا سے زمین کو ٹھونکتے ہیں۔ ہاتھ کا مُکا بنا کر پیشانی پر دھیرے سے مارتے ہیں۔ اسی شام خبر آتی ہے اتپلیندو کو اور اس کے کچھ دوستوں کو پولیس نے شر پسندی کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔

چوکے پر بیٹھتے ہوئے مچھری کی گندھ بھی بری لگ رہی ہے۔ مہاشویتا صرف ٹکر ٹکر ان کا چہرہ دیکھ رہی ہیں۔

"کچھ کہتے کیوں نہیں۔ کیا بات ہے؟"

وہ کیا بتائیں کہ انھوں نے کیا دیکھا۔ ایک ایسا خطرناک ناٹک جس نے پورے جسم کی چولیں ہلا دی ہیں۔ ننگے بھوکے ابھتو پیا کو ... ہندوستان کو۔ اتپلیندو کو اور بھوک سے ادم خور ہوئے اپنے جیسے انسان کو ... کہیں کچھ ٹھنڈا پن ہے ورنہ حکومت سب کچھ دیکھتے ہوئے اتنی کھلی چھوٹ نہیں دیتی۔ وہ جانتی ہے۔ بھونکنے سے کچھ نہیں ہونے والا اتپلیندو کی ماں ..."

باہر کچھ کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ چار نہیں چالیس مارے گئے۔ سالے جھوٹ بولتے ہیں۔ سفید جھوٹ۔

دروازہ کھولتے ہیں گھوش بابو۔ اسی روز، رات کا واقعہ، لڑکوں کی آنکھوں میں موت جیسا سناٹا۔

"کیا ہے ——؟"

پیچھے پیچھے ڈری ہمی مہاشویتا کھڑی ہے۔ شاید وہ گھڑی آگئی۔ ایک بوڑھے باپ کی تقدیر میں جسے بھیانک کہا گیا ہے۔ مگر وہ تیار ہیں۔ ہر چیز کے لئے۔ اس ناٹک کا انت دیکھنے کے بعد۔

"کیا ہے؟"

"اتپلیندو۔۔۔ پولیس کی گولی سے۔۔۔"

ٹن ٹن۔۔۔ ٹن ٹن۔۔۔

سناٹا۔ بھیانک سناٹا۔ دُور تک سناٹا۔ اور اس سناٹے میں سُنائی دے رہی ہے صرف پولیس کے قدموں کی چاپ۔ رتھ یاترا نکلے گی۔ نفرت یاترا نکلے گی۔ موت یاترا نکلے گی اور غصے میں آیا ہوا کوئی اتپلیندو، پولیس کو بندوق کے کندے سے مار دے گا۔ بدلے میں پولیس کے جوان اسے گولیوں سے بھون دیں گے۔ اور فساد میں مرنے والوں میں ایک نام اور شامل۔۔۔

سناٹا۔ بھیانک سناٹا۔ اس سناٹے کا کوئی انت نہیں ہے۔

رات ڈوبتی جا رہی ہے۔ اتپلیندو مرگھٹ سے نہیں آئے گا۔

کھٹ کھٹ۔۔۔ کھٹ کھٹ۔۔۔ کھٹ کھٹ۔۔۔

یہ کسی کے قدموں کی چاپ نہیں ہے۔ تنہائی میں اکثر ایسا ہوتا ہے جب اپنی اُلجھنیں مل کر کوئی صوتی آہنگ پیدا کر دیتی ہیں۔ گھڑیال نے تین کا گھنٹہ مارا ہے۔ اب اس کے بعد وہ کوئی گھنٹہ نہیں مارے گا۔ ایک گھنٹہ بعد صبح ہو جائے گی۔ کانوں کے پاس اِتنا سا اتپلیندو نگاڑہ لیے بیٹھا ہے۔ آپ استعفیٰ کیوں نہیں دیتے۔ کیوں نہیں دیتے۔ تنہا بیٹھا ہے۔ یس سر۔ چائے بھیجئے۔ بوڑھے آدمی کی آنکھ بہہ گئی ہے۔ صاحب میرا گریجوٹی کا روپیہ دلوا دو۔ گھر میں ایک دانہ اناج نہیں۔ میری آنکھ بہہ گئی صاحب اور۔۔۔

شمشان سے نکلے ہوئے بہت سے مُردے گلے میں بھوکا ایتھوپیا کا بورڈ لٹکائے ناچ رہے ہیں۔ رقص کر رہے ہیں۔

چار بجے گا۔ پھر صبح ہو جائے گی۔ اور پھر شروع ہو گا۔ روزانہ کا کاریہ کرم۔ وہ بوڑھے آنکھوں میں آہستہ آہستہ اترتا ہے اور پُوری جگہ گھیر لیتا ہے۔

اچانک سوتے میں اُن کے ہاتھ ٹائپ رائٹر مشین پر چلنے لگتے ہیں ...

"کھٹ ... کھٹ ... کھٹ ... میں ... آزاد ... کھٹ کھٹ ... ہونا چاہتا ہوں۔ کھٹ ... ہاتھ پیر مُنہ ... کھٹ ... پُورے وجود کے ساتھ ... کھٹ ... آزاد ... کھٹ ... کھٹ ... میں اس نوکری سے ..."

کھٹ ... کھٹ ...

آواز گوُنج رہی ہے۔

آواز مُستقل گونج رہی ہے۔

آواز پُورے اعصاب پر سوار ہو گئی ہے۔

تناظر ۱۹۸۹ء ◆◆

بِچّھُوگھَالیٔ

بہت پہلے اُس نے مجھ سے کہا تھا "تمہاری کہانیوں میں میرا بچہ کیوں دِکھتا ہے۔ میرے بچے کی بھوک کیوں نظر آتی ہے؟!"

اب بھی اُس وقت کا اُس کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم رہا ہے۔ اس کی پریشان پریشان سی کھوئی کھوئی آنکھیں، کندھوں تک جھُولتے ہوئے بکھرے ہوئے بال، پُرانی ساڑی پہنے ہوئے، جو پتہ نہیں دھونے اور سکھانے کے کتنے ہزار عمل سے گزر چکی تھی۔ کیا یہی وہ خواب تھا کہ میں نے اسے ساتھ ساتھ چلنے کے لیے مجبور کیا تھا، اور اس نے بھی کسی مجبوری سے نہیں بلکہ اپنی رضامندی سے قدم سے قدم ملا کر میرے ساتھ چلنے میں خوشی کا اظہار کیا تھا——— "تم میں وہ نظر آتا ہے جو بہتوں میں نظر نہیں آتا۔ میں تمہارے ساتھ رہنے میں فخر محسوس کروں گی۔"

نظر اُٹھا کر ——— پُرانی ہزار بار دُھلی ہوئی اور مَل مَل کر نئی بنا لی گئی ساڑی میں اس کے اُلجھے اُلجھے سرتاپا سوال پیکر کو دیکھتا ہوں۔ مٹی سَنی ہوئی دیوار کے دوسری جانب آشوتوش کھیل رہا ہے اور رسوئی میں دھونے کو پڑے ہوئے برتنوں کو اب وہ تیسری جنگِ عظیم کے نقشے میں تبدیل کر رہا ہے۔

"دیکھو ——— جاؤ اسے ٹھیک کرو۔ صاف کپڑے پہناؤ۔"

کیا یہی کچھ میرا خواب ہے۔ میرے بچپن کا خواب۔ جب آنکھوں میں پتہ نہیں کیسے کیسے سنہرے خواب لیے کہانیوں کی دُنیا میں داخل ہو گیا تھا۔ اور زمانے کی

طلسمی فضا سے نئی نئی کہانیاں چُرانے لگا تھا۔ تب کیسے کیسے خواب تھے۔ تب اُن چمکتی ہوئی آنکھوں میں خود ــــــ اور خود کے سپنوں کو نے کمرایک چھوٹے موٹے گھر کا نقشہ ہوا کرتا تھا۔ قدم سے قدم ملا کر چلنے والی بیوی۔ گڈے کی طرح رنگ برنگے کپڑوں اور نئے نئے جوتوں میں اُچھلتا کودتا ہوا ننھا منا شہزادہ۔۔۔ کیا وہ خواب بھی ہے۔ آشوتوش کے مٹھی میں سُنتے ہوئے ہاتھ، گندے برتنوں کے بیچ کھویا ہوا اُس کا بچپن، منہ پر لگی ہوئی کالک، مجسم سوال بنی، پرانی اُدھڑی ساڑی میں کھڑی دیپیکا ــــــ

"تم نے جواب نہیں دیا۔ تمہاری کہانیوں میں میرا بچہ کیوں دِکھتا ہے۔ میرے بچے کی بھوک کیوں نظر آتی ہے؟"

دیپیکا کی آنکھوں میں آج بھی وہی ٹھہراؤ ہے، مگر کل کی طرح ــــــ خوابوں کی دنیا سے اپنی تسلی کے سامان کے لیے کچھ چُراتا ہوا مسکراہٹوں کے خزانے نہیں بکھیرتا، بلکہ انجانے میں اُدھڑے گئے احساس سے بچنے کے لیے اس سوال سے کٹنے کا راستہ چُنتا ہوں، اور نظریں چرا لیتا ہوں۔

پھر وہی جواب ــــــ "اچھا لگتا ہے۔ بچے کو صاف کپڑا نو پہناؤ۔"

دیپیکا کچھ لمحے کھڑی رہتی ہے۔ پھر آشوتوش کی جانب دیکھتی ہے، اور بلبلاتی ہوئی بس اتنا کہہ پاتی ہے۔

"تم بدلنے لگے ہو ــــــ نہیں، تم ہارنے لگے ہو۔"

"میں ہارنے کیوں لگا ہوں۔ یہ سوال اکثر اپنے آپ سے کرتا ہوں اور کوئی جواب نہیں سوجھتا، شاید اس لیے کہ اب خواب دیکھنے کی عمر نکل گئی۔ مگر یہ تو کوئی جواب نہیں ہوا۔ سچ کے لیے لڑنے کی طاقت تو ہر عمر میں ہونی چاہیے۔ پھر میں ہارنے کیوں لگا ہوں؟ اس سوال کو تھوڑا اور کُرید تا ہوں

دوسروں کی طرح بے مقصد زندگی جینے کا میں عادی کبھی نہیں رہا۔ بہت چھوٹے سے ہی میں نے اپنا ایک مقصد بنایا تھا۔ مجھے جینا ہے اُن لوگوں کے لیے۔۔۔۔ مگر نہیں۔ میں کوئی پیغمبر نہیں تھا۔ کوئی ولی یا بزرگ نہیں تھا۔ کوئی سنت، مہاتما یا مہاپرش نہیں تھا۔ صرف گرد و اطراف میں چھائی ہوئی انسانوں کی بے چینی اور

درد میں شامل ہونے کا احساس میرے اندر کچھ جگا رہا تھا۔ وہی جو بعد میں میرے لکھنے کی وجہ ثابت ہوئی۔ قلم اُٹھانے سے پہلے سوچا تھا۔ لکھوں مگر کس لیے؟ اور کیوں؟ اور اس کا جواب بھی مل گیا تھا۔ ان کے لیے۔ سوال پھر اُٹھا تھا، تو اس سے کیا ہوگا، کیا اس سے خود کی تسلی ہو جائے گی یا ان کے درد میں کمی ہو جائے گی؟ کبھی کبھی درد میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ دوسروں کے اندر کس حد تک جا سکتے ہیں ہم ـــــ مگر ذہنی سطح پر احساس کی حد تک جاتے ہوئے۔ ان سے خود کو قریب کرتے ہوئے، جوڑتے ہوئے، درندہ صفت لوگوں سے کٹ جاتے ہیں ہم۔ یہ درندہ صفت لوگوں سے خود کو بچا لینے کا احساس بھی شاید بہت اہمیت نہیں رکھتا۔ پھر بھی اپنے آپ کی تسلی کے لیے کسی ناٹک کی طرح کام کرتا ہے۔ ان کے بارے میں سوچتا تو ہوں ـــــ ہاں ان کے لیے لڑ نہیں پاتا۔ یہ گرد و اطراف میں پھیلے ہوئے لوگ ـــــ ان کے لیے لڑ نہیں سکتا۔ صرف قلم اور قلم کی سطح پر ان کے نزدیک پہنچ جاتا ہوں۔ کیا یہی کم ہے ۔۔۔؟

" ہاں یہ بہت کم ہے۔ شاید تمہاری تخلیق کا مقصد بھی نہیں۔ کم از کم یہ میرے نزدیک کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ مقصد اتنا کھوکھلا ـــــ اتنا دھندلا ـــــ جیسے پانی کی سطح پر تیرتا ہوا تیل اور تمہارے پاس آگ جلانے کے لیے صرف ایک بجھی ہوئی تیلی ہے۔ یہ جھوٹ موٹ کا محض تسلی بھرا احساس ہے۔ تم اسے اگر اپنی جیت سمجھتے ہو تو میں سمجھتی ہوں تم ٹھیک نہیں سوچ رہے۔

یہ دیپیکا تھی۔ اُس وقت کی دیپیکا، جب ہم کالج میں تھے۔ اور دیپیکا میرے ساتھ پڑھنے والی لڑکی۔ ہم دونوں کا سبجیکٹ بھی ایک ہی تھا۔ اکثر کالج کے ڈبیٹ اور دوسرے فنکشن میں وہ مجھے بہت غور سے سنتی، پھر اس درمیان کئی رسائل میں اس نے میرے سلگتے ہوئے احساس کی چنگاری بھی دیکھی اور مجھ سے مل کر اس طرح کے تیز موضوعات پر باتیں کرنے بیٹھ گئی۔

" ہر جگہ میں تمہارے خیالات سے اتفاق نہیں کرتی۔ پتہ نہیں کیوں لگتا ہے جب تمہارے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہ جاتا ہے۔ تب اچانک تم سوئے ہوئے طبقے کے کسی آدمی سے پتھر چلا دیتے ہو اور کہانی ختم ہو جاتی ہے "

"میں مانتا ہوں۔ اچانک پتھر کا چلانا، غصّے سے بھنچی ہوئی مٹھیاں کسی مسئلے کا حل نہیں۔ مگر ایسا دِکھاتے ہوئے میں انھیں بیدار ہوتے ہوئے دیکھ لیتا ہوں۔ اپنے طور پر مکمل اور بیدار۔ کسی سے خوفزدہ نہیں۔ اپنی جنگ آپ لڑنے والا۔ اپنے حق کے لیے آواز اُٹھانے والا ——— اور یہ سویا ہوا طبقہ۔ یہ تم نے کیا کہا؟"

"ہاں سویا ہوا طبقہ۔ میں ایسے لوگوں کے لیے اب بھی یہی لفظ استعمال کرتی ہوں۔ اس لیے کہ تم نے اوپری سطح سے انھیں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اندر جا کر دیکھو تو معلوم ہوگا ——— لڑنے کے لیے اور مشعل اٹھانے کے لیے۔۔۔ یہ اب تک اپنے اندر کوئی مضبوطی کا احساس پیدا نہیں کر سکے ہیں۔ ایک چھوٹے سے دائرے میں قید اور سوئے ہوئے!"

"تو۔۔۔؟"

"تو تمہیں ان کے قریب جانا ہوگا۔ برابری کی رسم اُس وقت تک پوری نہیں ہوگی، جب تک تم اپنا لبادہ اتار کر ان کے قریب نہیں پہنچو گے۔"

لکھنے والا کیوں لکھتا ہے؟ یہ جواب مجھے آج تک نہیں ملا۔ لکھتے وقت وہ کوئی سیاست داں نہیں ہوتا۔ مبلغ اور مقرر نہیں ہوتا۔ مسئلے سلجھانا اس کا کام نہیں ہوتا۔ ہتھیار چلانا اس کا پیشہ نہیں ہوتا۔ پھر وہ کس احساس کے تحت لکھتا ہے اور کیوں لکھتا ہے؟ یہ اپنے آپ سے تھکنے والا جذبہ بھی نہیں ہو سکتا؟ ہاں کسی سطح پر ظلم اور ناانصافی کی کسی ایسی زندہ مثال سے اس کا واسطہ ضرور پڑتا ہوگا، جو اچانک قلم میں آگ پھونکنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ مگر قلم میں آگ پھونکنے تک ہم کتنی جنگیں لڑ پاتے ہیں۔ اپنے طور پر انھیں ایسی کتنی جنگیں لڑنے کے لیے تیار کر پاتے ہیں۔

جنگ ——— یعنی کچی عمر سے جڑا ہوا ایک رومانی احساس۔ بس اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے؟ عمر کی اسی نازک دہلیز پر فیصلہ کیا تھا۔ مجھے گورنمنٹ سروس کی قید نہیں بھگتنی ہے۔ تب اس فیصلے پر مجھے کتنا کچھ سہنا پڑا تھا۔ کتنے کمینٹس، کتنی تقریریں، گھر کے بزرگوں نے مجھے گھنٹوں بیٹھا کر کتنا سمجھایا تھا۔ بچو! یہ نادانی ہے، پھلجھڑی کی

طرح بجھتے ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ مفلسی، تنگ دستی اور غریبی کے تجربات بتائے گئے تھے۔ ایک لہلہاتا ہوا خوب صورت مستقبل ہے تمہارے سامنے۔ یوں بھی تمہارا کیریئر شروع سے اچھا رہا ہے۔ لکھنے سے کبھی منع نہیں کیا گیا اور لکھنا بُرا بھی کیا ہے، مگر لکھنے کو زندگی بنا لینا، پیشہ بنا لینا، اپنے کیریئر پر کلہاڑی چلانا ہے۔ ۔ ۔"

اور یہ کلہاڑی چلائی تھی میں نے۔

دیپیکا تب بھی میرے ساتھ تھی ــــــ "مجھے تمہارے فیصلے سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ میں تمہارا درد جانتی ہوں، سمجھتی ہوں۔ اپنے سلگتے ہوئے احساس کا مجھے بھی ایک حصہ سمجھنا۔ یہ درد کتنے لوگوں میں ہوتا ہے۔ اگر یہ درد سارے کے سارے محسوس کرتے تو ــــــ آج ملک کی یہ حالت نہ ہوتی۔ چاروں طرف چھٹپٹاہٹ اور بے چینی کے جو پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ وہ دکھائی نہ دیتے۔"

"میں نہیں جانتا۔ میں نے اچھا کیا ہے یا بُرا، مگر دیپیکا۔ ۔ ۔"

وہ آنکھیں جھکائے کھڑی تھی۔ کیسا منظر تھا یہ بھی یاد نہیں۔ مگر کوئی دریا کا کنارہ نہ تھا، سمندر یا ساحل نہ تھا بلکہ کالج کے باہر کی جھونپڑپٹی سے شروع ہوا ــــــ اوپلے سنی دیواریں اور گندگی کے ڈھیر بھرے میدانوں کا ایک لمبا سلسلہ تھا، جہاں ہم کھڑے تھے۔

"تم دیکھ رہی ہو۔ کبھی کبھی یہ چھوٹا سا لفظ بڑا پیارا لگتا ہے ــــــ 'محبت'، ٹالسٹائی اور گاندھی سے جڑا ہوا یہ لفظ۔ ان سے قریب ہوتے ہوئے یہی لفظ سلگتا اور جاگتا رہتا ہے میرے اندر۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔ ۔ ۔"

"میں سمجھ رہی ہوں۔ بہت کچھ تو تمہاری کہانیوں سے سمجھا اور تمہاری کہانیوں کے راستے سے تمہارے اندر اتر کر جھانک کر محسوس کیا اور اب تمہارے ساتھ ساتھ۔"

دیپیکا کی نظریں جھکی تھیں۔

سورج سر پر تھا۔ جھونپڑپٹی سے گرد اور دھول کی آندھی اٹھ رہی تھی۔ یہ جھکی ہوئی نظریں بڑی پیاری لگیں، اور پھر وہی رومانی احساس، اوپر سے نیچے تک مجھے بھگو گیا تھا۔ ۔ ۔

"تم ان کے بارے میں سوچتے ہو نا . . . یہ ہیں تمہاری کہانی کے ہیرو ہیروئن . . . ."

دیپیکا نے مسکراتے ہوئے اشارہ کیا۔ ایک چھوٹا سا ننگے پاؤں۔ دھول میں سَنا ہوا لڑکا ——— اپنے ہی جیسی چکٹ گندے کپڑے پہنی لڑکی کا ہاتھ پکڑے حیرت و محبت کے ملے جلے رنگوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

(۲)

میرے بچے کیسے ہوں گے ؟ ویسے ہی نا . . . جیسے خوابوں میں نظر آتے ہیں۔ جیسے پریوں کے دیس کے بچے ہوتے ہیں۔ شہزادوں جیسے رنگ برنگے مخمل اور کمخواب کے کپڑوں میں ——— چھوئی موئی سے۔ میری بیوی کے سر پر شہزادیوں کا سا تاج ہوگا۔ ریشمی ساڑی میں سرتاپا حسن بنی ہوئی۔ لان میں سجی ہوئی کرسیاں۔ ایک طرف سوئمنگ پول، ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے نوکر چاکر۔ میٹھی کھنکتی ہوئی آواز کا سحر۔ کسی ایر کنڈیشنڈ آفس میں ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا میں، تھری پیس سوٹ، کپڑے پر ایک بھی شکن نہیں گھنگھریالے خوب صورت بال، ہلکی ہلکی جھانکتی ہوئی بالوں سے سفیدی۔ باہر شاندار گاڑی رُکی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ دربان نے سلام داغا۔ چیمبر میں داخل ہوتے تک کتنے ہی ہاتھ پیشانیوں تک جا جا کر سلام بن جاتے ——— ایسا ہی نا ؟ ایسا ہی کچھ خواب ہوتا تھا نا . . . ؟ لیکن اب کہاں تھا یہ خواب ——— کہیں نہ کہیں ضرور یہ خواب میرے اندر رہا تھا۔ اُن کی باتیں کرتے ہوئے بھی جو یہ نہیں جانتے کہ اُن پر بھی کہانیاں لکھی جا سکتی ہیں۔ تو ان کی باتیں کرتے ہوئے بھی یہ خوب صورت سا لطیف احساس مجھ سے کہیں نہ کہیں ضرور جڑا تھا۔ جو اکثر ہوا کے خوش گوار جھونکے کی طرح میرے اندر کے خوبصورت احساس والے آدمی کو چھیڑ دیتا۔ پھر چُپ چُپ مرنے لگا تھا۔ یہ خوابوں کا جزیرہ اور دکھائی دے رہا تھا۔ اصل ہندوستان کا چہرہ۔ وہ جو کھیتوں میں آج بھی مویشیوں کی طرح جوتے جاتے ہیں آج بھی آزادی کے اتنے سال بعد جاگیردارانہ نظام کی نحوست تلے دبے ——— [illegible] کولہو کے بیل ——— جھنڈ کے جھنڈ ——— ہانپتے ہانپتے

ہوئے ـــــــ پھر خبروں میں، اخباروں میں، سُرخیوں میں ـــــــ، کسی قبرسے نکلی ہوئی ایک معصوم مُردہ بچّے کی آنکھیں[1] یہ زندہ کیمروں میں قید کتنی ہی تصویریں، جو رسائل اخبارات کی سُرخیوں سے ہوتی ہوئی عام جذبات میں ہلچل مچادیتی ہیں، وحشت اور بربریت کے نام پر قطار میں سجی لاشیں[2] ـــــــ فوٹو گرافر کے پاس بھی دل نہیں ہوتا شاید کیسے دیکھ لیتے ہیں۔ بے ہوش نہیں ہوتے۔ میں بھی تو لکھ لیتا ہوں ہوش میں رہ کر۔ مگر یہ سب۔ بربریت اور وحشت کا یہ خونی رقص ان سب سے بند ہوجانے والا نہیں۔ پھر کیا ملتا ہے۔ جذباتی طور پر ان سے قریب ہوتے ہوئے۔ سوچتا ہوں۔ سوچنا چھوڑ دوں اور مشین بن جاؤں۔ اچانک چونک اٹھتا ہوں۔

گاندھرو میری طرف دیکھ رہا ہے۔

"یہ پروف دیکھا ہے آپ نے۔ عمر کے کتنے سال گزار چکے ہیں اس میدان میں۔ پھر بھی پروف دیکھنے کا طریقہ نہیں آیا۔ ایسے کب تک چلے گا۔ صرف پروف دیکھنے کے لیے دس آدمیوں کو رکھا جائے؟"

ہلکا سا احتجاج کرتا ہوں "پروف دیکھنا تو میرا کام نہیں ہے۔ ایڈیٹنگ اور دوسری ذمہ داریاں آپ مجھ کو سونپ سکتے ہیں۔"

"آپ کا کام نہیں ہے مطلب؟"

گاندھرو کی پیشانی پر بَل پڑ گئے ہیں۔ "یہاں اس میگزین میں کام کرنا ہے تو یہ سب بھی کرنا ہوگا۔ ورنہ اور بھی راستے ہیں آپ کے پاس۔"

کمرے سے باہر نکلتا ہوا سوچتا ہوں۔ گاندھرو ایڈیٹر ہے۔ دوسرے مدیروں کی طرح ہی خواہ مخواہ کی غلطی نکالنا اب اس کی عادت بن چکی ہے۔ میری کمزوری جانتا ہے۔ قصور بھی عمر کے اُن سپنوں کا ہے جو پورا نہ ہونے کی صورت میں مجھے باندھ گئے ہیں۔ میری سلگتی تحریروں کا ہے جنھوں نے اپنے جھوٹے نشے

---

[1] بھوپال گیس سانحہ "انڈیا ٹو ڈے" کے سرورق پر شائع ہوئی یہ تصویر کافی مشہور ہوئی تھی۔
[2] نیلی قتلِ عام تصویریں۔ یہ تصویریں کئی رسائل میں شائع ہوئیں۔

کا عادی بنا دیا ہے۔ میگزین سے اُس والہانہ لگاؤ کا ہے کہ میں اسے چھوڑ کر نہیں سکتا۔ کہاں ہوتے ہیں وہ لوگ اُس وقت جو میرے مضامین اور کہانیوں پر فخر سے دیکھا کرتے ہیں مجھے۔ وہ مجھے اس وقت آکر دیکھ لیں جب گاندھرو مجھ پر آنکھیں اتر یر، رہا ہوتا ہے، اور دو پیسے کا سوال اس کے سامنے مجھے بھیگی بلی بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سوچتا ہوں گاندھرو سے لڑ جاؤں۔ آخر اتنی ترقی کی ہے میں نے۔ کہیں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی۔ مگر پھر ایک ہارے ہوئے آدمی کی طرح چپّی کا راستہ اپنا لیتا ہوں۔

جنگ ——— یعنی کچّی عمر سے جڑا ہوا ایک رومانی احساس۔

میں نے فیصلہ کیا تھا یا بغاوت، یہ سوچنا بھی اب میں نے چھوڑ دیا ہے۔ عمر کی کچّی سیڑھیوں پر اپنے کیریئر کا جو جوا میں نے کھیلا تھا، وہ آج میرے سامنے تھا۔ خواب اور زندگی میں بس اتنا فرق ہوتا ہے۔ دوسرا اعتراض دیپیکا سے میری شادی کو لے کر ہوا۔ اسے بھی گھر والوں نے بغاوت کا ہی نام دیا ——— میری چمکتی ہوئی آنکھوں نے بہت غور سے اس دھان پان سی لڑکی کا جائزہ لیا تھا۔ شہ... زادی.... خوب صورت کپڑوں میں اپنی دیپیکا شہزادی ہی تو لگے گی۔ تیکھے نین نقش، ترا شے ہوئے ہاتھ پاؤں، سڈول بدن، اپنی چھوٹی سی جنّت میں سکھ کے اتنے ذخیرے ایک ساتھ جمع ہونے لگے تھے کہ شاید دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھنے لگا تھا خود کو۔ میری کہانیوں کے زہر نے لنتوں کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ اب تو بڑے بڑے سمینار میرے بغیر ہوتے ہی نہیں تھے۔ کہانیوں کا معیار بھی میرے بغیر ادھورا سمجھا جاتا تھا۔ شاید یہی تو چاہتا تھا میں مقبولیت، عزّت، شہرت۔ وہ چھوٹا سا احساس کہاں تھا۔ ہاں چھوٹا احساس ہی تو تھا جو مقبولیت اور شہرت کے گرد ماند ہوا جا رہا تھا۔ اور میگزین کے دفتر کے ایک چھوٹے سے کیبن میں راشن کی فکر، دیپیکا کا مُرجھایا ہوا چہرہ۔ مجھے خوابوں سے حقیقت کی دنیا میں لا رہا تھا۔

سچ ——— ایسا مُرجھایا ہوا!

" وہ سونے کا تھال کہاں ہے؟ وہ کمخواب اور مخمل کا بستر کہاں ہے؟ وہ شہزادیوں کا تاج کہاں ہے! وہ لان میں نکلی ہوئی کرسیاں اور سوئمنگ پول کہاں ہے۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ درد کہاں ہے۔ بس اتنا سا ہے وہ درد۔ فوٹوگرافر کے کیمرے کا کمال، قبر سے جھانکتی ہوئی مُردہ بچے کی آنکھیں —— جو طبیعت کو کچھ پل کے لیے جھنجھوڑ دیتی ہیں۔ بس اتنا سا ہے وہ درد۔ تلخ احساس سے جُڑا ہوا تمہارا احساس "

تمہاری کہانیوں میں جو درد جھانکتا ہے، وہ دوسروں میں نہیں پاتی "
دیپیکا کی سرگوشی اُبھرتی ہے۔ " اپنے درد کا مجھے حصہ دار نہیں بناؤ گے؟"
آواز شب خون مارتی ہے۔

اور سامنے ہوتا ہے ایک بجھا ہوا آدمی۔ بس کی بھیڑ میں کچلا جانے والا آدمی، کھادی کا کرتہ پہنے، جھولا کندھے سے لٹکائے اپنے خوب صورت سپنے کے قتل کے بعد تھکا ہارا گھر لوٹ رہا ہے۔ ۔ ۔

آشوتوش ایک طرف رو رہا ہے۔ دیپیکا کے ہاتھ میں ہٹی میں سنے ہیں۔ وہ برتن مانجھ رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر جلدی جلدی وہ اپنے ہاتھوں کو صاف کرتی ہے۔

" آج جلدی آ گئے؟"

" ہاں " بہت غور سے آشوتوش اور اس کی طرف دیکھتا ہوں۔

" آج کل کچھ اُداس رہتے ہو، کچھ بجھے بجھے سے۔ کیا بات ہے!"

"کام بڑھ گیا ہے "

" نہیں —— "

دیپیکا ایک دم شانت ہے۔ گندے آشوتوش کو اٹھاتے ہوئے وہ میری آنکھوں میں جھانکتی ہے۔

" تم ہار رہے ہو —— سمجھے! تم ہار رہے ہو "

اس دن رات میں شکن پڑے ہوئے بستر پر میرے قریب لیٹی ہوئی وہ بہت دیر تک پتہ نہیں مجھ میں کیا تلاش کرتی رہی۔ آشوتوش سو گیا تھا۔

اور دیپیکا سر کے بالوں کو سہلاتی ہوئی آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

" سپنا بڑا بھی تو ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں تم کیا سوچتے رہتے ہو۔ یہی نا کہ اس درد سے الگ کا بھی احساس تھا تمہارے پاس کہ ایسا ہوتا۔ کاش ایسا ہوتا، جیسا کہ ہر مرد سوچتا ہے۔ سونے کی سیج پر لیٹی ہوئی اس کی بیوی، سونے کے پلنے پر ہلکورے کھاتا ہوا اس کا بچّہ۔ یہ سب نہیں ہے تو تمہارے اندر کا احساس دُکھ گیا ہے۔ ہاں دُکھ گیا ہے۔ پورے پاگل ہو گئے ہو تم۔ اس بار بار ڈھلی ہوئی ساڑی میں بھی ویسی کی ویسی ہوں۔ تمہارے خواب ـــــ رنگوں جیسی۔ اور اپنا آشوتوش مٹی کے آنگن میں بھی سونے کے پلنے جیسا ہی کھیلتا ہے۔ اور سپنا بھی وہی ہے۔ ہاں تمہارے سوچنے میں کہیں نہ کہیں غلطی ہو گئی ہے۔ تمہارا یہ 'حلیہ'، تمہارے مضامین، تمہاری کہانیاں، تمہارے تیور سب ویسے کے ویسے ہیں۔ اور برابری کا فلسفہ برابر ہوئے بغیر پورا بھی تو نہیں ہوتا۔ جنگ تو تبھی لڑی جا سکتی ہے نا۔۔۔ آہستہ آہستہ۔۔۔ دھیرے دھیرے۔۔۔"

دیپیکا مسکرا رہی ہے۔ آشوتوش کی طرف ایک نظر ڈالتا ہوں۔ کتنے دن لگیں گے اس کے بڑے ہونے میں۔ شاید بہت وقت۔ تب تک میں بوڑھا ہو جاؤں گا۔ مگر کہیں کچھ نہیں بدلا۔ کوئی سسٹم نہیں۔ سب ویسا کا ویسا ہے۔ دیپیکا کی بات سے ڈھارس بندھتی ہے۔ پھر گاندھرو کا چہرہ نظروں میں گھومنے لگتا ہے۔

" تمہارے مضامین اب اپنا اثر چھوڑ رہے ہیں۔ 'آخری پتّا'۔ اب تم نہیں لکھو گے۔ اب ایک نیا آدمی آ گیا ہے" باسی پرانی باتیں دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ لوگوں کو جھنجھوڑنے والی باتیں چاہئیں۔ تمہاری کوری سچائی اس پنے پر فٹ نہیں بیٹھتی"

آہستہ آہستہ مجھے میگزین سے ختم کرنے کی سازش چل رہی ہے۔ مگر میرا کیا ہے۔ گاندھرو جس دن بھی زیادہ سخت پڑا۔ اُسی دن یہ میگزین چھوڑ دوں گا۔ اور بھی مجھے کتنے آفر مل چکے ہیں۔ اس کی ماتحتی میں اب زیادہ کام نہیں کر سکتا۔

(۴)

اس دن "اپنی بات" میگزین کے مالک نے ایک میٹنگ بلائی تھی۔

"میگزین کا سرکولیشن اتنا گھٹ کیوں گیا؟ پچاس ہزار سے اچانک پندرہ ہزار پر کیسے آگیا۔ اگر امپروومنٹ کا کوئی چانس نہیں ہے تو گھاٹے میں چلنے والا میگزین نکالنے سے فائدہ ہی کیا ہے؟"

گاندھرو نے میری طرف اشارہ کیا۔ "ان سے پوچھیے 'اپنی بات' کا سرکولیشن کبھی ان پر منحصر تھا۔"

اس کے لہجے میں طنز چھپا تھا۔ "مجھے آئے تو صرف دو سال ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کے آخری پنّے کی وجہ سے اس کی مارکیٹ ویلیو کافی بڑھ گئی تھی؟"

سوم دت مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ "کیوں مسٹر پرکاش! میں خود بھی کبھی کبھی وقت نکال کر آخری پنّا پڑھ لیتا ہوں۔ ریئلی اب وہ بات نہیں رہی۔ سیرئیلی آئی ایم ٹاکنگ ٹو یو۔ آپ کی رائٹنگ کا وہ جادو کہاں گیا؟"

"میں اب بھی وہی لکھتا ہوں جو محسوس کرتا ہوں۔ میں کام ٹالنے پر یقین نہیں رکھتا۔"

"یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔" گاندھرو ہنستا ہے۔

"یہ بات ہوئی!"

میں ذرا سخت لہجے میں گاندھرو کی طرف دیکھتا ہوں۔ کوئی آدمی ہمیشہ ایک جگہ برقرار نہیں رہتا۔ وقت کے ساتھ آدمی کی مقبولیت میں کبھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے میگزین کی فروخت پر میرے پنّے سے فرق پڑا ہو۔ مگر میں پورا پورا مارکیٹ ویلیو کو لے کر یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ یہ ذمہ داری پوری پوری ایڈیٹر پر لاگو ہوتی ہے کہ وہ ٹیکنک میں کون سی تبدیلی لاتا ہے اور کس سے کون سا کام لیتا ہے۔ یہاں تو پروف تک ہمیں دیکھنا پڑتا ہے۔"

"پروف دیکھنے کا کام؟"
سوم دت نے چونک کر گاندھرو کو دیکھا۔ گاندھرو نے آنکھیں نکال کر میری طرف دیکھا۔
"اب شاید کچھ دن میں کٹنگس چپکانے کا کام بھی ہمیں ہی دیکھنا پڑے، اور آپ پوچھیں گے کہ آخری پنے کا وہ دم خم کہاں گیا؟"
"نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔
سوم دت گمبھیر ہوگئے تھے۔ خیر! اس سلسلے میں، میں الگ سے گاندھرو جی سے بات کروں گا۔ آپ لوگ سوچیے۔ صلاح دیجیے۔ کیسی تبدیلیاں اس کی مارکیٹ ویلیو کو اور بڑھا سکتی ہیں۔ یہ سوچنا آپ سب لوگوں کا کام ہے۔
"میں زیادہ پریشر میں کام نہیں کر سکتا۔"
پتہ نہیں، ایک دم سے کیسے میرے اندر جوش آگیا تھا۔ میٹنگ کا رخ ہی بدل گیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"مسٹر پرکاش ــــــ" سوم دت ہڑبڑا کر میری طرف دیکھنے لگے تھے۔
گاندھرو کے چہرے پر شکن پڑ گئی تھی۔
آپ کہیں نہیں جائیں گے مسٹر پرکاش۔ آپ یہیں رہیں گے اور آخری پنا بھی آپ ہی لکھیں گے۔"
"اور پروف؟"
"ہمارے پاس آدمیوں کی کمی تھی۔" گاندھرو نے ہار مان لی تھی۔ اس کا سر جھک گیا تھا۔
"تھینکس۔۔۔ تھینکس اے لاٹ۔۔۔۔"
یہ مبارک باد شاید میں نے خود کو دی تھی۔ دو سال سے سوئے ہوئے اپنے جذبات کو، جو دیپیکا جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی سو گیا تھا۔ دیپیکا جو ہر قدم پر ہارتے ہارتے بھی۔۔۔۔ مجھے تسلی دیتی رہی تھی۔ مگر میں سو گیا تھا۔
شاید گاندھرو کا بچہ شروع دن سے مجھ سے جلتا رہا تھا۔ جس دن اس نے بڑی بڑی ڈگری اور تجربوں کے حوالے سے بطور ایڈیٹر اس میگزین کو جوائن

گیا تھا۔ شاید اسی دن سے وہ میری شہرت اور مقبولیت سے جلنے لگا تھا۔ قاعدے کے لحاظ سے تو یہ عہدہ ہم میں سے کسی کو ملنا چاہیے تھا۔ پرانے لوگ کسی بھی باہر کے آدمی کے خلاف تھے۔ لیکن سوم دت کا فیصلہ آخری فیصلہ تھا۔ آشوتوش کے مٹھی میں سنے ہوئے ہاتھ، دیپیکا کے ماتھے کی شکن نے پتہ نہیں کیسے دو سال کے اس طویل عرصے میں مجھے اتنا جھکا دیا تھا کہ میں تھوڑے سے زیادہ پیسے کے لیے پروف جیسا کام بھی دیکھنے لگا تھا۔ اور میری اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتا رہا گاندھرو۔ ہر بار اور ہر موقع پر میرے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر جیسے وہ اپنی نظر میں میری مقبولیت کو کم کر دیتا تھا۔ کیوں اتنا جُھک گیا تھا میں؟

شاید وہی ــــــــ پریوں کے دیس کا خواب جو ٹوٹ گیا تھا۔

اور سوم دت کہہ رہے تھے "یو نو مسٹر گاندھرو۔ میگزین میں کچھ چینج چاہیے، کچھ نیا پن لائیے۔"

"یس سر ــــــــ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" گاندھرو نے ٹیبل پر پڑا ہوا پیپرویٹ اُٹھا لیا تھا۔

"مگر اس کے لیے کیا میں آزاد ہوں۔ آئی مین، اپنے طور پر میگزین کو نیا موڑ دیتے ہیں؟"

"یس ــــــــ یو آر ابیٹ لیبرٹی ٹو گیو اے نیو ٹرن ٹو دس میگزین۔"

(۴)

اس دن بس کی بھیڑ بُری نہیں لگ رہی تھی۔ ڈرائیور کے اچانک بریک لگانے پر ایک بوڑھا لڑکھڑاتا ہوا مجھ پر گر پڑا تھا۔

"سنبھل کر بابا۔" ایک آدمی نے بوڑھے کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔

مجھے یاد ہے سیمیناروں میں تحریک کے نام پر مجھ سے کیسے کیسے سوال کیے جاتے تھے۔ مسٹر پرکاش! کیا ایک ڈاکٹر، وکیل اور انجینئر کا بھی فرض بنتا ہے کہ وہ سروس سے الگ پورے طور پر اس تحریک میں شامل ہو جائے۔ تحریک تبھی کامیاب ہوگی؟ کوئی پوچھتا۔ مسٹر پرکاش! برابری کے فلسفے پر آپ کا کیا خیال ہے، کہانیاں مسئلے سلجھا سکیں گی؟ آپ ان کی کہانیاں

لکھتے ہیں جو انھیں پڑھ بھی نہیں پاتے ۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ نوجوان دوستوں کے چہروں پر چمک ہوتی جیسے وہ میری باتوں سے شہرت اور مقبولیت کی سیڑھیوں پر چڑھنے کا راز جان لیں گے۔ لیکن وہ ہزار بار دہرائی گئی کھوکھلی باتیں بیان کر کے کیا پاتا۔ ہاں ایک بار جذبات میں کہہ گیا تھا۔ لکھنے سے پہلے میں زیادہ اس بارے میں نہیں سوچتا، ہاں وہ کسی نہ کسی صورت میرے اندر رہتے ہیں اور میں کون سا الگ ہوں ان سے۔ ایک معمولی سا آدمی ہوں میں بھی۔ بس میں دھکے کھاتا ہوں۔ ہوائی چپل گھستا ہوں۔ پتہ نہیں میری ان باتوں کا کیا مطلب نکالا ہوگا ان لوگوں نے ـــــ کچھ مسکرائے تھے، مگر میں جان رہا تھا بہت قریب سے اپنے دوستوں کے تیور دیکھنے کا موقعہ ملا تو محسوس ہوا تھا۔ مارکس اور اینگلز کے فلسفے بھی شاید ان کے اندر وہ درد نہ بھر سکیں جس کے نام پر یہ اس تحریک کے دعوے داروں میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس لیے میں ایسے سوالوں سے کٹ گیا ہوں۔ پریکٹیکل زندگی جینے کا ایک زبردست نقصان یہ بھی ہے کہ کہانیوں سے زندگی نکل جاتی ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ اب میرے قصے باسی ہو گئے ہیں۔ آخری بیتا۔ وہ کالم جو میں مستقل لکھا کرتا تھا، اب پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جا رہی تھی۔ شاید وقت بھی بدل تھا۔ مٹی میں کھیلتا ہوا آشوتوش عمر کی پندرہویں دہلیز پر کھڑا، ایک انتہائی سنجیدہ نوجوان بن کر میرے سامنے کھڑا تھا اور پوچھ رہا تھا۔

"پتا جی! کیا ہمارے یہاں کمانے کی عمر مقرر ہے؟"

"کیوں؟"

اس کی خود اعتمادی نے مجھے ایک دم سے جھنجھوڑ دیا ہے۔

"پھر آپ مجھے صرف پڑھنے پر زور کیوں دے رہے ہیں۔ ایک اکیلے آپ پر پوری ذمّہ داری ہے۔ جب کہ میں بخوبی اب یہ ذمّہ داری اپنے کندھوں پر اٹھا سکتا ہوں۔"

میں دیپیکا کی طرف دیکھتا ہوں۔ اس کی آنکھوں پر چشمہ چڑھ گیا ہے موٹا چشمہ۔ بیٹے کی بات نے اس کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے۔

اور آشوتوش کہہ رہا ہے "میں اسکول میں پڑھتا ہوں تو کیا پارٹ ٹائم ـــــ پارٹ ٹائم، تو کر ہی سکتا ہوں ـــــ آپ مجھے ایسا کرنے کیوں نہیں دیتے؟ پتا جی، کیا ہمارے کمانے کی عمر مقرر ہے؟"

"نہیں؟" ایک کمزور آواز اپنی جانب سے اٹھاتا ہوں "لیکن ابھی تم بہت چھوٹے ہو تمہیں پڑھنا ہے اور ساری توجہ پڑھنے پر دینی ہے۔"

"مانتا ہوں۔ یہ پڑھائی رات میں بھی تو ہو سکتی ہے۔ لالٹین ہو یا ٹیوب لائٹ کی روشنی، پڑھنے والے پڑھ ہی لیتے ہیں۔"

"آشوتوش میرے بچے۔"

فرق ہوتا ہے نا، عمر عمر میں۔ کل کی بغاوت نے مجھے کچھ نہ دیا ہو۔ مگر آشوتوش تو دیا ہے۔ ایک سمجھ دار بچے کا باپ تو بنایا ہے۔ ہو سکتا ہے، اپنی ضد اور اپنے فیصلے پر قائم رہ کر میں نے غلطی کی ہو مگر زمانے کو ایک آشوتوش دے کر میں نے مکتی پالی ہے۔ ہاں مکتی پالی ہے۔ اس لیے دیپکا کے اس صحت مند تبصرہ کا جواب ہے میرے پاس جو کبھی اس نے میری کہانیوں پر کیا تھا۔

"تمہاری کہانیوں میں میرا بچہ کیوں دکھتا ہے۔ میرے بچے کی بھوک کیوں نظر آتی ہے؟"

"اس لیے کہ میں بھوک دیکھ رہا تھا۔ مٹی میں سنے چہرے کی بھوک اب یہ بھوک نظر نہیں آئے گی۔"

"یعنی کہ تم خود کو جوڑ کر لکھتے ہو ـــــ اپنے بچے کو، اپنے بچے کی بھوک کو محسوس کرتے ہوئے۔ ۔ ۔ اپنے دائرے سے باہر۔"

"ایک دائرے کو ہی سمجھ لوں تو۔ ۔ ۔" میں کہنا چاہتا ہوں۔

مگر یہ دائرہ محدود تو نہیں۔ وسیع ہے بہت وسیع ـــــ مجھ پر گرنے والا بوڑھا مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

"آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟"

"نہیں ـــــ آپ کو؟"

"مجھے؟"

وہ چپ ہے شاید یہ کہنا چاہتا ہے ۔ اب تو عادت سی پڑ گئی ہے۔ اگلے بس اسٹاپ پر مجھے اُتر جانا ہے ۔ گھر آگیا ہے ۔

دیپیکا کا چہرہ مجھے دیکھ کر کھِل اٹھا ہے۔ شاید اس لیے کہ آج برسوں بعد میں بھی خوش نظر آرہا ہوں ۔

" کیا بات ہے ! "

" ایک بات کہنی ہے ۔ جھُولا کرسی کی پشت سے ٹکاتے ہوئے کہتا ہوں ۔

" تم سے کہا تھا کہ اس مہینے تمہارے لیے نئی ساڑی لے دُوں گا ۔ مگر اس مہینے نہیں لے سکتا ۔ "

" کوئی بات نہیں ۔ مجھے کوئی خاص شوق بھی نہیں ۔ مگر آتے ہی یہ بات ۔ ضرور کچھ وجہ ہے ۔ "

" ہاں " اپنا آپ نکال کر ہلکا کر رہا ہوں " اب میں پروف نہیں دیکھوں گا ۔ مَیں مانتا ہوں کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا ۔ لیکن دو پیسے فاضل کے لیے یہ سب کرتے ہوئے اپنے کام کے ساتھ پُورا ایمان دار نہیں ہو پاتا ہوں ۔ "

" اچھا کیا ۔ مَیں تو خود تمہیں سمجھانے والی تھی " دیپیکا مسکرائی ۔

" آشو تو شش آج کل کافی دیر میں آنے لگا ہے ۔ "

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سوچتا ہوں ۔ ہاں پریوں کا دیس نہیں ہے ۔ گدّوں پر سونے والا راج کمار نہیں ہے ۔ سونے کا تھال نہیں ہے ۔ شکن پڑنے لگی ہے میرے اور بیوی کے چہرے پر ۔ مگر اس کے باوجود کل جو ایک خواب دیکھا تھا ۔ خوب صورت سا خواب ۔ وہ اس لمحے جب کہ ہم دونوں کی آنکھوں میں صدیوں کی تپتیا کے اندر دھنش جاگ اٹھے ہیں ۔ ۔ کیا کم ہے ۔ ۔ ۔ یہ تو وہی سپنا ہے ۔ محسوس کرنے کی حد تک ۔ ۔ ۔ پریوں کا دیس بھی تو ہے ۔ سونے کا تھال ۔ مخمل اور کمخواب کا بستر بھی ۔

(۵)

گیارہ بجے کا وقت ہے ۔ آفس میں چہل پہل شروع ہو گئی ہے ۔ نئے پرچے کی ڈمی تیار ہے ۔ یہ شمارہ ایک دم سے سکریٹ رکھا گیا تھا ۔ ہاں اس شمارے

کی بھی سیٹ بڑے پیمانے پر کی گئی تھی۔ قیمت بھی بڑھا دی گئی ہے۔ مینیجنگ ایڈیٹر کی رپورٹ کے مطابق آرڈر بڑھ رہے ہیں۔ شاید اگلے مہینے سے ہی میگزین ہاٹ کیک کی طرح ہر بک اسٹال پر تھوک کے حساب سے نظر آنے لگے۔ مگر یہ کیا ہے۔۔۔؟

جس رسالے کو اپنا آئیڈیل مان کر اتنے برسوں سے اپنے آپ کو ٹکائے رکھا ہے۔ گاندھروکے پریشر کے باوجود یہ وہ رسالہ تو نہیں ہے۔ مختصر مختصر۔۔۔۔ صرف سچ اگلتے ہوئے۔۔۔۔ تبلیغ اور تقریر سے الگ، پیلی صحافت سے الگ۔۔۔ مگر یہ کیا ——— یہاں تو سنسنی خیزی بھری پڑی ہے۔ فلم نامے کی فرضی رپورٹ اور آخر میں میرا اپنا پتّا ——— شاید اسی لیے اس شمارے کو مجھ سے بھی سیکریٹ رکھا گیا تھا۔ اس ہفتے صرف مجھے آخری پتّا لکھنے کو کہا گیا تھا۔ میں وقت پر ہی آفس آتا رہا۔ کیبن میں خالی مکھیاں اڑانا تو مجھے کبھی پسند نہیں رہا۔ دوسرے دوسرے کام انجام دیتا رہا۔ مگر جان رہا تھا، شروع دن سے ہی گاندھرو کی نبض پکڑ لی تھی۔ یہ آدمی میگزین کو خراب کر دے گا۔ مگر سوم دت تو اس معاملے میں کٹّر آدمی ہیں۔ پھر انھوں نے یہ آزادی کیسے سونپ دی۔ اب شاید ایسی کسی تحریک کا تصوّر نہیں رہ گیا ہے۔ یاد آیا اُس دِن سوم دَت کہہ رہے تھے۔ یوٗ آر ایٹ لیبرٹی ٹو گیو اے نیو ٹرن ٹو دِس میگزین۔ مجھے دھکّا لگا ——— سنسنی خیز واقعات، جیسی کسی میگزین میں کام نہیں کر سکتا تھا۔ پیلی صحافت کی روشنائی مضبوطی سے پکڑے گئے قلم میں نہیں بھر سکتا تھا۔ ڈمی پر ایک نظر ڈال کر جلا بھُنا کیبن میں آکر بیٹھ گیا ہوں، کہ اچانک ہلکا سا شور سُن کر باہر آجاتا ہوں۔

باہر دوسرے اسٹاف کا ایک بڑا سا کمرہ ہے۔ جس میں ایک لائن سے کئی میز اور کرسیاں پڑی ہیں۔ ایک چھوٹا سا لڑکا تقریباً ۹، ۱۰ سال کا۔ ہاتھ میں بسکٹ کا پیکٹ لیے رحم طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا ہے۔

”ارے لو نا صاحب۔ بھوکا ہوں۔ کچھ کھایا نہیں ہے ابھی تک۔“

”تم یہاں کیسے آئے؟“

”یہ آفس ہے۔ سمجھے۔“

"لے لو نا صاحب" لڑکا اب میری طرف دیکھ رہا تھا۔
مجھے لگا یہ اپنا آشوتوش بھی تو ہو سکتا ہے جو اسکول سے باہر پارٹ ٹائم کرتا ہے ـــــ اپنا آشوتوش۔۔۔۔
"بیٹے، ابھی لوگ کام کر رہے ہیں" میں نے اسے سمجھانا چاہا۔
"لے لو نا صاحب۔ بھوکا ہوں"
"یہ لو"
جیب سے نکال کر میں دو روپے اس کی ہتھیلیوں پر رکھنا چاہتا ہوں۔
"نہیں صاحب" لڑکا پیچھے ہٹ جاتا ہے "ماں نے سمجھایا ہے بھیک نہیں لینا۔ میں بھیک نہیں لوں گا صاحب"
لوگ غور سے بچے کو دیکھنے لگے ہیں۔
"کتنے کا ہے؟" میں پیکٹ کو غور سے دیکھتا ہوں۔
"دس روپے کا صاحب"
"ابھی میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں بیٹے"
لڑکا کچھ سوچتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے "اچھا یہ رکھ لو صاحب اور یہ دو روپے دے دو۔ میں باقی پیسے بعد میں لے جاؤں گا"
"سنو"
میں اسے روکتا ہوں "یہ پیکٹ بھی لے جاؤ اور یہ دو روپے بھی لے جاؤ۔ سمجھو میں بھیک نہیں دے رہا ہوں۔ تم کھا لینا۔ جب اتنے پیسے ہو جائیں تو مجھے واپس کر دینا"

"اچھا صاحب" لڑکے کو یہ تجویز پسند آئی ہے۔ وہ مسکراتا ہوا ممنون آنکھوں سے دیکھتا ہوا باہر نکل گیا ہے۔ میں دوبارہ کیبن میں لوٹ آیا ہوں۔ تازہ شمارے کا آخری پنا میری آنکھوں میں گھوم رہا ہے کیسے آئے گی مضبوطی۔۔۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو چاروں طرف مردے ہی مردے نظر آتے ہیں۔۔۔ خون خرابہ۔۔۔ فساد دنگے۔۔۔ آدھے کٹے سر۔۔۔ لہولہان جسم۔۔۔ سڑکوں پر پھیلا ہوا ڈھیر سا لہو۔۔۔ حدِ نگاہ تک استی پنجروں کا ایک جزیرہ۔ ہم کس شمشان

ہیں آگئے ہیں شاید۔ جہاں مُردار کے جلتے گوشت کی بو ہر جگہ پھیلی ہے۔ آس پاس سے گھورتی ڈراؤنی آنکھیں.... اور ہزاروں مردہ آنکھیں.... چہار طرف سے پیٹھ میں کسی نوکیلے خنجر کی طرح گھُسی جاتی ہیں۔ جلاتی جاتی ہیں.... تم کسی شمسان میں آگئے ہو اور اس شمسان سے باہر نہیں نکلنا چاہتے تم.... ان میں رچ بس گئے ہو.... تمہاری سانس سانس میں اُتر گئی ہیں، مُردار کے گوشت کی بُو.... تم اُس کے عادی ہوگئے ہو..... ہزاروں لاکھوں جانیں نذر کر کے تم نے آزادی پائی بھی تو آزادی کے جسم کو شمشان میں لاکر جلا دیا۔ کتنی ہی پڑھیوں کو تم ذات پات، دھرم مذہب کے نام پر کھا گئے.... اپنی سنسکرتی کو، سبھیتا کو، اور خود کو.... تم دوسری بے کار چیزوں میں اتنا بٹتے گئے کہ انسان نہیں رہ گئے.... کچھ اور ہوگئے ہو تم.... دیکھتے ہوئے بھی یہ آگ تمہیں نظر نہیں آئے گی.... سچ کہوں، تم بھوت ہوگئے ہو...."

پتہ نہیں وہ کیسی آگ تھی، جس میں برسوں سے جلتا رہا تھا۔ اور یہی آگ تھی کہ جو جی میں آیا، اول فول لکھتا چلا گیا.... آخر میں ملک کی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ایک چھوٹا سا حاشیہ لگایا تھا میں نے۔

"مجھے تم سے شکایت ہے،
کہ تم نے انتظامیہ کو سمجھ رکھا ہے
اُگال دان
آتے ہو اور تھوک دیتے ہو
کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہے اس سے
کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا اُس سے
بلکہ پیدا ہوگا ایک اور مسئلہ
جب ایک دن بھر جائے گا اُگالدان تمہاری تھوکوں سے
تب پیدا ہوگا
تھوک سے بھرے ہوئے اگالدان کو پھینکنے کا مسئلہ"

یہاں تک لکھتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی میں نے... جیسے

اپنے پر سوار آسیب کو جھٹکنے کی کوشش کی ہو۔۔۔ یہ بھی لگا تھا کہ میرے خلاف چلتی ہوئی سازش میری کرسی کھینچ رہی ہے۔۔۔ میری زمین ہٹانے کی کوشش چل رہی ہے۔۔۔ اندر بیٹھا ہوا کمزور آدمی دھیرے دھیرے مضبوط ہونا چاہ رہا ہے۔ اب یہ صرف ایک میگزین نہ ہو کر میرا میرا آشوتوش ہو گیا ہے۔ میں اپنے اس آشوتوش کو۔۔۔

کھڑکی کے باہر کا کوئی منظر صاف نہیں ہے۔۔۔ سب کچھ دھند دھندلا سا۔۔۔ ایک کشمکش سی چل رہی ہے اندر۔۔۔ میگزین چھوڑ دوں۔۔۔ اور بھی کتنی ہی جگہوں پر کام مل جائیں گے مجھے۔۔۔ میری سوچ کہیں ٹھہر گئی ہے۔

وہ غریب لڑکا پھر میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں کھلی تھیں۔

"بابو جی۔ یہ پیسے۔"

وہ ممنون آنکھوں سے اب بھی مجھے دیکھ رہا تھا۔ پل میں مجھے لگا شاید دو روپے دے کر میں نے اس پر احساس کر دیا ہے، جب کہ یہ کوئی احسان نہ تھا۔ مگر یہ لڑکا اسے احسان کے طور پر لے گا۔ اور مستقبل میں پھر کبھی اسے دیکھ کر سر نہیں اٹھا پائے گا۔ وہ ہمیشہ اخلاقی کمزوری کے تحت جھکا رہے گا۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ جیسے میں۔۔۔ دو سال کا طویل عرصہ محض اپنی کمزوریوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا تو پھر۔۔۔

"بھکاری کہیں کا۔" میں تیز آواز میں بچے کو ڈانٹتا ہوں۔

بچہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔۔۔ اسٹاف میری اس تبدیلی پر چونک گئے ہیں۔۔۔

"گیٹ آؤٹ۔ تم نے بار بار آفس کا چکر لگانا شروع کر دیا۔"

"صاحب! ہم پیسے لوٹانے آئے ہیں۔"

بچے کے چہرے پر پڑی ہوئی ان گنت لکیریں اب شکن کی صورت میں تبدیل ہو گئی ہیں۔

"اب بھاگو یہاں سے۔" میں پھر چلاتا ہوں۔

اس بار لڑکا حیرت و غصے کے ملے جلے رنگوں سے دیکھتا ہو مجھے، باہر

نکل گیا ہے۔

ایسا کرتے ہوئے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے، مگر،۔۔۔

مَیں شاید جیت گیا ہوں نہیں صرف اُسے ویسا کا ویسا رہنے دیا ہے۔ جانتا ہوں۔ آج جیسے ماحول کے لیے یہ اندر دبی ہوئی چنگاری کتنی اہمیت رکھتی ہے۔

(۶)

مجھے لگتا ہے انجانے طور پر دیکھے گئے۔ ان نیلے پیلے سپنوں سے میں دُور نہیں جاسکا شاید۔۔۔۔ وہ اب تک مجھ میں بستے ہیں۔۔۔۔ اور صرف بستے ہی نہیں بلکہ موقع کی تلاش میں بھی رہتے ہیں۔ ذرا بھی موقع ملے تو مجھے توڑنے لگتے ہیں۔ تب تب اپنے پورے احساس کو میں کوئی نام نہیں دے پاتا۔ جانے کیوں لگتا ہے کہ میں بچھوؤں سے بھری ہوئی گھاٹی میں ہوں۔۔۔۔ قدم قدم پر گھات لگائے بچھو میرے جسم پر بچھ بچھ گئے ہیں۔۔۔۔ ان کے زہریلے ڈنکول نے لہولہان کر دیا ہے مجھے۔۔۔۔ پورا پورا۔۔۔۔ آسمان سے ٹوٹتے کسی بدنصیب ستارے جیسے خواب کی طرح اپنی دُنیا میں لوٹتے ہوئے اتنا تھکا ہارا ہوتا ہوں کہ دیپیکا کی آواز بھی سُنائی نہیں دیتی۔ جو ہولے ہولے میرے بکھرے بے ترتیب بالوں میں انگلیاں پھیرتی مجھ سے کہہ رہی ہوتی۔

آج پھر پریشان ہو۔۔۔۔ جوتے نہیں اتارے۔ کپڑے بھی نہیں بدلے۔

وہ پاس ہی بیٹھ گئی ہے۔ سوکھے ہونٹ مسکرائے ہیں اور آنکھوں میں پیار ہی پیار کا دریا اتر آیا ہے۔ بات کیا ہے۔ اپنا آشوتوش اب تک نہیں آیا۔ پارٹ ٹائم کرنے لگا ہے۔۔۔۔ نا۔۔۔۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔ اب دیکھو نا آٹھ بجے آئے گا۔۔۔۔ منع کرتی ہوں اُسے۔ مگر وہ ضدی ہے۔۔۔۔ بس تمہاری طرح۔۔۔۔ پورا پورا تم میں گیا ہے۔

کہہ کر ٹھہرتی ہے دیپیکا۔۔۔۔ اس کے پیارے سے چہرے کو ہاتھوں کی رحل میں بھرتا ہوا ایک لمبی اداسی اوڑھ کر ویسا ہی چپ اور شانت ہو جاتا ہوں۔ وہی گھاٹی۔۔۔۔ بچھوؤں بھری۔۔۔۔ میں اس گھاٹی میں ہی کہیں ہوں۔۔۔

شاید.... اپنا آشوتوش.... زندگی کے لمبے لمبے سال گزارتے گزارتے اُس پر جیسے ویسا ہی لگاؤ ہو گیا ہے مجھے۔ جیسا اپنے پیارے سے آشوتوش.... صبح شام.... روز کا حساب مانگوں تب بھی، ایک لمحہ بھی اپنی بات سے الگ نہیں رہا ہیں.... ان میں رہ کر ہی عمر کی رومانی منزلوں پہ دیکھے گئے رنگ برنگے سپنوں کے رنگین محل سے سمجھوتہ کیا ہے میں نے۔ پھر ایک دم سے ان سے الگ کیسے ہو جاؤں....؟

دیپکا سنتی رہتی ہے.... چپ چپ.... سنجیدہ چہرے پر کہیں کوئی ہلچل نہیں.... چپ چپ.... ایک لمحے کو ٹھہرتی ہے دیپکا.... تو کیا سوچ رہے ہو تم.... پھر ایک گہری سانس بھرتی ہے وہ.... ریزائن کر دو گے؟ اب وہ میری آنکھوں میں جھانگ رہی ہے۔ جیسے اندر اتر کر پورا پورا پڑھ لینا چاہتی ہو مجھے....

"نہیں ــــــ سوچ لیا ہے.... ریزائن نہیں کروں گا.."

آہستہ سامنے کے دانت ایک دوسرے میں بھینچ گئے ہیں... مگر ویسا نہیں ہونے دوں گا جیسا گاندھر و چاہتا ہے۔

لفظ چباتے ہوئے کسی فیصلہ کن موڑ پہ آ کر ٹھہرا ہوں.... اور صرف ٹھہرا ہی نہیں بلکہ مسکرا بھی دیا ہوں۔ کچھ سوچ کر.... ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ دیپکا.... سنو گی ــــــ یاد ہے ایک بار تم نے ہی کہا تھا.... سپنے ٹمرے بھی تو ہوتے ہیں.... یاد آیا؟.... تم نے ہی کہا تھا کہ اس بار بار کی دھلی ہوئی ساڑی میں بھی.... وہ مسکرا رہی ہے.... اور اپنا آشوتوش بھی مٹی کے آنگن میں سونے کے پلنے جیسا ہی کھیلتا ہے.... ہاں تمہارے سوچنے میں ہی کہیں غلطی ہو گئی۔ اب لگتا ہے تم نے ٹھیک ٹھیک پہچانا تھا.... جدوجہد کا عمر کے کسی پڑاؤ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا.... اور ان سے لڑنے والا کبھی بوڑھا ہو ہی نہیں سکتا۔ .... اور ان سے جوجھنے کا یہ احساس ہی وہ خوب صورت سا خواب ہوتا ہے دیپکا۔ ــــــ جو ہم نے دیکھے تھے، اور جو....

آوازیں میں سمندر کا بہاؤ شامل ہے۔ اور دیپکا کی آنکھوں میں ہنستا

لہراتا، ٹھاٹھیں مارتا ایک پورا سمندر اُتر آیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس سے پہلے کہ وہ
نی آنکھوں کی خاموشی زبان سے کچھ کہہ پاتی، باہر کے کھلے دروازے سے اندر
خل ہوگیا ہے آشوتوش۔ ۔ ۔ ۔ تھکا ہارا ۔ ۔ ۔ ۔ پسینے پسینے اندر اٹھتے ہوئے
پناہ پیار کے بہاؤ کو توڑ کر اسے سینے میں بھر لیتا ہوں۔
جان گیا ہوں۔ انجانے طور پہ دیکھے گئے رنگ برنگے سپنوں کی منزلیں بھی
نجانی اَن دیکھی ہی ہوتی ہیں، جہاں جستجو اور جدوجہد کے سخت پاؤں دھیرے
دھیرے اپنا سفر طے کرتے رہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ بغیر ٹھہرے ———

آجکل، دہلی ۱۹۸۹ء ◆◆

مرگ نینی نے کہا

کون؟

مرگ نینی کی اُٹھنے کی خواہش تو ہوئی لیکن پھر لیٹ گئی۔ رات کے اندھیرے میں کتنی ہی بار خالی خالی پدچاپوں کی صدا ذہن کے سناٹے میں اُبھرتی رہتی ہے۔ تب کوئی نہیں ہوتا، صرف ایک جھوٹ بھرا ہوا وہم۔ پھر بھی کون ہے ...؟ مرگ نینی پوچھنا نہیں بھولتی۔ اندھیرے میں یہ لفظ پورے کمرے میں بج اٹھتے ہیں۔ اُٹھ کر بتی جلانا چاہتی ہے تو لمحے بھر کے لئے ہاتھ وہیں ٹھہر جاتے ہیں ... اوِیناش گھر پر نہ ہوں تو آدھی رات کے وقت بتی جلاتے ہوئے بھی خوف کا احساس ہوتا ہے۔ بتی جلتے ہی بستر کے سامنے آدم قد تصویریں نگاہوں میں سما جاتی ہیں ... عجیب شوق ہیں اوِیناش کے ... کھلنڈری طبیعت ... موج و مستی والی عادت ... اور یہی کمرہ اگر بابو جی کا ہوتا تو ...؟ چاروں طرف وشنو، مہیش و برہما کے کلنڈر جھول رہے ہوتے۔ یہاں ایکدم سے بند اس ماحول — کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں۔ چاہو تو بڑے کا مانس بھی کھا لو ... جتنی چاہو شراب پی لو ... وہ نہیں کھاتی، لیکن اوِناش تو بچپن سے ہی بگڑا ہوا شیر ہے ... دھرم ورم بالکل مانتا ہی نہیں۔ ہاں کبھی کبھی اس کے بابو جی کی چٹکی لینے سے بھی نہیں چوکتا۔ کبھی جب مستی میں ہوگا تو خوب کھلکھلا کر ہنسے گا ... 'یار باس تیرے ڈیڈی بھی کم عجوبہ چیز نہیں ہیں۔ اب اس عمر میں

خاکی ہاف پینٹ ـــــــ، وہ سہم کر دیکھتا ہے کہ مرگ نینی اس کی بات کا برا تو نہیں مان رہی۔ پھر سنبھل کر ہنستا ہوا، ایک شرارتی مکا اس کی پیٹھ پر جماتا۔۔۔ یار یوں ۔۔۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد ہر آدمی اپنی مصروفیت کی راہ تو نکالتا ہی ہے۔ پھر مذہب کو سیاست سے جوڑنا تو، یوں بھی آج کل فیشن ہو گیا ہے۔

وہ چڑھ کر جواب دیتی۔ سیاسی سمجھ بوجھ کا مادہ تو ہر آدمی میں ہونا ہی چاہیئے۔ اس کو اگنور کرکے نہ تم ایک صحیح شہری بن کے دکھا سکتے ہو۔ نہ ہی خیالات کی سطح پر اپنے آپ کو مکمل محسوس کر سکتے ہو۔

پھر تو اویناش دیر تک ہنستا رہا۔ دراصل تیرے ڈیڈی کی آنکھ بی جے پی کے ٹکٹ کی طرف لگی ہوئی ہے۔ آج کل ٹکٹ تو ملے گا ہی۔ اور سچ پوچھو تو وہ ڈیزرو بھی کرتے ہیں۔

کمرہ اندھیرا ہو تو کتنے ہی چہرے ذہن میں بنتے رہتے ہیں۔ الگ الگ شیپ لیتے رہتے ہیں۔۔۔ اور بیتے وقتوں کے پرندے کے شور نیند کی حالت میں سوئے ہوئے جسم کو چونکاتے رہتے ہیں۔ پتہ نہیں کب، کیسے ذہن کے کسی چور دروازے سے نکل کر اسد سامنے آ گیا تھا۔ اور وہ دہاڑ رہی تھی۔

"مائی ڈیر اسد! تم جا سکتے ہو، میری تم سے کوئی دوستی نہیں۔ اس لئے کہ تم گائے کا ماس کھاتے ہو۔ اس لئے کہ تم مسلمان ہو۔ تم سے تو یہ شودر اچھے ہیں۔ تم مسلمان سمجھتے کیا ہو، ہندوؤں کے مندروں کو ڈھا کر۔۔۔ زور زبردستی تلوار کے زور پر مسلمان بنا کر، جزیہ کے نام پر بھی تمہارے مسلمان بادشاہوں کی نظر ہندوؤں کو توڑنے اور کمزور کرنے پر لگی رہی ہے۔ جبراً اسلام تھوپنے کی کارروائی کے سوا انھوں نے کیا ہی کیا ہے۔ پاپا ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ تم لوگ کینسر ہو۔۔۔ تم لوگوں کو یہاں سے جانا ہی ہوگا۔"

پھر دھماکے کی کتنی ہی ضرب زور زور سے اس کے سر پر ہوتی رہی۔ اسد کا کھلا کھلا حیرت زدہ چہرہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔۔۔

"تم مرگ نینی ہوش میں تو ہو۔۔۔ جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو۔۔۔؟"

تب کے قصّے کو بہت عرصہ نہیں ہوا۔ ۔ ۔ زیادہ دنوں کی بات نہیں رہی ۔ ۔ ۔ دروازے کے دو سکر چھو رہ پر نرسنگھ کھڑے تھے ۔ ۔ ۔ اس کے پاپا ۔ ۔ ۔ پُرسکون چہرہ لئے۔ انھوں نے بھاری آواز میں اسد سے کہا تھا۔

"معاملہ تو کچھ بھی نہیں۔ تم ہندو بن جاؤ ۔ ۔ ۔ سوچ لو کر سکو گے یہ بغاوت ۔ ۔ ۔ آخر تم شادی کر کے اسے مسلمان ہی تو بناؤ گے۔۔ دھرم بھرشٹ کراؤ گے اس کا ۔ ۔ ۔ اور تمہارے دھرم کی بساط ہی کیا ہے ۔ ۔ ۔ سب سے پُرانا دھرم تو ہندو دھرم ہے ۔ ۔ ۔ آجاؤ اس کے شرن میں"

مرگ نینی کو یاد ہے ۔ ۔ ۔ لال لال آنکھیں ہو رہی تھیں پاپا کی ۔ ۔ ۔ اور اسد بُت بنا اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ اچانک ہی اس نے اپنے قدم تیزی سے باہر کی طرف کھینچے۔

اسد کے جانے کے بعد دیر تک اپنے کمرے میں بند رہی اور سوچتی رہی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اُس نے اسد سے جو کچھ بولا، کیا وہ اس کے اپنے لفظ تھے۔ اسکول اور کالج کی تعلیم سے پیدا لفظ ۔ ملک کی جمہوریت سے اپجے لفظ ۔ ۔ ۔ اور فرقہ پرستی کیا ہوتی ہے ؟ دل کو ہی فرقہ پرست بناتے ہوئے باہر کے آدمی میں دشمن دیکھنے کا نظریہ کیا خود کے ساتھ ایک دھوکہ نہیں ہے ۔ اسے لگا وہ خود کو دھوکہ دے رہی ہے۔ اسکول اور کالج کے دنوں میں اپنی جن جن بڑی بڑی باتوں کے لئے وہ مشہور تھی۔ اب وہی باتیں ایکدم سے انجان بن گئی ہیں ۔ ۔ ۔

ان دنوں جب بسنتی خوابوں کی پہلی پہلی بارش سے وہ شرابور ہوئی تو اُس نے اپنے پورے وجود کا جائزہ لیا اور جیسے بکھرتی چلی گئی۔

اسکول کے دنوں میں جھوم جھوم کر "سارے جہاں سے اچھا ۔ ۔" گانے والی ۔ ۔ ۔ !

یہاں تو پاپا تھے ۔ ۔ ۔ بُوا تھی ۔ ۔ ۔ ماما دیدی تھی اور رنجن تھا۔ دادی کا تو کھانے پینے کا سارا برتن ہی الگ تھا۔ پُوجا کا الگ کمرہ ۔ ۔ ۔ اس کمرے میں تو کوئی جا ہی نہیں سکتا تھا۔ جانے پر دس صلوٰۃ ۔ ۔ ۔ بُوا بھی ویسی ہی مذہبی خیالوں والی ۔ مجال کہ کوئی ان کے بستر پر بیٹھ جائے ۔ ۔ ۔ فوراً چادر بدلی جائے گی اور ان سب کا اثر ماں نے لیا تھا۔ ماں کہتی تھی یہاں آنے سے پہلے وہ ایسی نہیں تھی اب ہو گئی ہے۔ یعنی ماحول کا رنگ دیکھ کر ۔ ۔ ۔

رنجن بھی ابھی سے مندر جاتا ہے۔ ماتھا ٹیکنا، جل چڑھانا اور ان سب سے بھی دو دو ہاتھ آگے نکل گئی ہیں مایا دیدی۔ پاپا تو کبھی بھی ایسے نہیں رہے۔ ساری زندگی وہ کرمنل وکیل رہے۔ مایا دیدی کی شادی کے بعد جب انھوں نے صحت اچھی نہیں پائی تو وکالت سے ناطہ توڑ لیا۔ انہی دنوں ان کے پاس ننکا پاسی کا ایک کیس آیا تھا۔ قتل کا معاملہ تھا۔ وجہ تھی ایک معمولی تاڑی کا پیڑ جس کا ٹھیکا ایک سال کے لئے مقتول مختار پہلے سے ہی لے چکا تھا۔ تاڑ کے پیڑ کو ہی لے کر مختار اور ننکا میں کہا سُنی ہو گئی۔ بدلے میں ننکا نے تاڑ چھیلنے والا ہنسیا مختار کے پیٹ میں اُتار دیا۔ ننکا کا بدحواس چہرہ دیکھ کر ہی نرسنگھ نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ لیکن مختار کے جوان بیٹے کو ان کی یہ پیروی دیکھی نہ گئی۔ صبح کے وقت ایک دن جب وہ اپنی بیٹھک میں بیٹھے، ''موکلوں'' کی فریاد سُن رہے تھے، مختار کے لڑکے بسم اللہ نے انھیں جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ بسم اللہ تو پکڑا گیا لیکن تب سے نرسنگھ کا مزاج مسلمانوں کی طرف سے اور بھی خراب ہو گیا۔

مایا دیدی کی شادی کے بعد پاپا نے اتنے پیسے تو جوڑ ہی لئے تھے کہ ساری زندگی عیش کر سکتے۔ یوں بھی کرمنل لائر رہے تھے۔ ایک ایک ''موکلوں'' کی پیروی میں ہی کتنا کما لیتے تھے۔ انہی دِنوں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ میں ان کی دلچسپی بڑھی تھی۔ اور اس کی سبھاؤں میں وہ پابندی سے جانے لگے تھے۔ یوں بھی سماج میں صرف عہدہ، رتبہ اور پیسہ تو چلتا نہیں۔ کچھ نہ کچھ سیاسی کیریکٹر بھی آج کے زمانے میں ضرور ہونا چاہیئے جو جب تب کسی بھی بُرے وقت میں کام آ سکے۔ نرسنگھ کی دلچسپی اب سبھاؤں میں بڑھنے لگی تھی اور یہ دلچسپی کا ہی کمال تھا کہ روزانہ اب سبھاؤں کے دفتر اب ان کے اپنے گھر میں بھی لگنے لگے تھے۔ اور ان سبھاؤں کی معرفت ان کی اپنی مذہبی معلومات میں اضافہ ہو چکا تھا۔ جیسے انھوں نے جانا کہ مسلمان تو شودر سے بھی بدتر ہیں۔ اس قوم نے ہندو قوم کے ساتھ اتنی زیادتی کی ہے کہ ان کے بچے کچے پر بھی کوئی رحم نہیں کھانا چاہیئے اور یہ کہ سب سے پرانا اور صحیح مذہب تو ہندو مذہب ہے جس کا کوئی وجود ہے۔ [illegible]رانی روایت رہی ہے۔ اسلام تو بہت بعد میں آیا اور اس کی تعلیم پر بھی دوسرے مذہبوں کا [illegible] زبرد[illegible] صاحب نے [illegible] تلوار کے [illegible] عرب [illegible] بھولے بھالے جاہل

لوگوں کو اپنی جادوئی باتوں کے موہ جال میں پھنسا کر پھیلایا اور یہ بھی کہ مسلم بادشاہوں نے تو ہمیشہ ہی بے چارے ہندوؤں پر قہر کا پہاڑ توڑا ہے۔ اب جب کہ ان کی اپنی حکومت ہے تو انہیں اس شودر کو ہندوستان کی زمین سے بھگا کر "ہندوراشٹر" قائم کرنے کے خواب کو تو پورا کرنا ہی ہے۔

پاپا کی زندگی میں آئے ان ساری تبدیلیوں کو مرگ نینی نے براہِ راست دیکھا تھا۔ ان کی زندگی بدلی تھی۔ پہناوا بدلا تھا۔ اب انھوں نے درجن بھر کیسریا ٹوپی بھی بنا رکھی تھی۔ کئی خاکی ہاف پینٹ بھی تھے جو ان کے موٹے بھدّے پیروں پر بالکل نہیں جچتے تھے۔ لیکن پاپا ہر سبھا میں باقاعدہ اپنے یونیفارم میں ہی جاتے۔ پھر تو گھر کی دیواروں پر بھی مذہبی کیلنڈروں نے اپنی جگہ بنانی شروع کر دی تھی۔ "فخر سے کہو ہم ہندو ہیں" والی چھوٹی چھوٹی کٹنگ ڈرائینگ روم اور پاپا کے کمرے میں جا بجا لگنے لگی تھیں۔ اسے لگتا گھر میں ایک خطرناک زہریلی تبدیلی آگئی ہے۔ گھر کے سارے فرد ایک محدود دائرے میں پناہ لینے لگے ہیں۔ ذہن کی سینسیٿو سطح پر مذہب جکڑ والا پہیہ ایک خاص طرح کی بندش لگا رہا ہے ـــــ تب وہ کالج میں تھی اور کہنا چاہیئے اسد اسے ہر طور پر اچھا لگنے لگا تھا۔ اسد اس کا کلاس فیلو بھی تھا۔ وہ بھی تواریخ سے ہی آنرس کر رہا تھا۔ تواریخ، یعنی پرانی یادوں کی دستاویز ـــ اسے اسد کی باتیں اچھی لگتیں۔ اسے لگتا اسد کافی پڑھتا ہے۔ سوچتا ہے اور کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے۔ یہ بھی کہ مذہب کی کٹر روایتوں کو اسد ایک بیکار سی چیز مانتا ہے۔ انہی دنوں ملک میں کئی جگہوں پر فرقہ وارانہ فساد چھڑے ہوئے تھے۔ دل دہلا دینے والی سرخیوں کو دیکھ کر اسد کافی غصہ ہوا تھا۔

"مرگ نینی! سچ پوچھو تو سب غلط کاروبار یہ اخبار والے کرتے ہیں۔ یہ ایسا کیوں لکھتے ہیں کہ اتنے مسلمان مارے گئے یا ہندو مارے گئے؛ کیا "انسان مارے گئے" لکھنے سے کام نہیں چل سکتا۔ ہندو مارے گئے یعنی مسلمانوں کے لئے نفرت پیدا کرنا۔ مجھے لگتا ہے پریس میڈیا نے اب تک اپنا صحیح استعمال نہیں سمجھا ہے۔

ایک دن فرصت کے لمحے مرگ نینی نے اسد کو اپنے گھر آئی تبدیلیوں کی کہانی

سُنائی تو اسد کسی خاص فکر میں ڈوب گیا۔ مرگ نینی نے بھولے پن سے پوچھا کہ تاریخ تو میں بھی پڑھتی ہوں۔ لیکن کیا واقعی مسلمان ایسے تھے؟ اس نے محمد غوری اور اورنگ زیب جیسے بادشاہوں کا نام لیا جو اپنی ہندو دشمنی کے لئے مشہور رہے تھے۔ اسد نے غصے میں بتایا کہ یہ تواریخ کے مصنفوں کا جھوٹ ہے جو نئی نسل کی برین واشنگ کرنے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ تاریخ کے اوراق پر مسلمان بادشاہوں کی جو اچھی مثالیں موجود ہیں وہاں ان تاریخ لکھنے والوں کی نظر ہی نہیں گئی۔

کیا مسلمان بادشاہ ہندوستان میں "نظامِ مصطفیٰ" چاہتے تھے۔ مرگ نینی نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔ "نظامِ مصطفیٰ"، پاکستان کے حوالے سے اس کا ذکر کتنی بار گھر میں آیا تھا۔ اسد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "نظامِ مصطفیٰ تو ایسی چیز ہے کہ تم اس کا مقابلہ "رام راجیہ" یا ترقی پسند تصور کی بنیاد پر بھی کر سکتی ہو۔ لیکن اگر تم اس میں تلوار کی زور زبردستی کی تفصیل لاتی ہو تو یہ صرف فرضی کہانیاں ہیں۔"

کالج کے چہکتے ماحول سے ہوتی ہوئی ایک بار پھر وہ کورٹ آف ہاؤس کے کٹہرے میں کھڑی تھی۔ جہاں اس کے پاپا اور ممی کی لال لال آنکھوں والی عدالت لگی تھی۔ اور ایک بے کار سی جرح مرگ نینی کے ذہن میں ہلچل مچا رہی تھی۔ نرسنگھ پوچھ رہے تھے۔

"تم کالج میں کسی مسلم لڑکے سے ملتی ہو۔"

"جی ——"

"تم کسی مسلمان لڑکے سے ملتی ہو۔ اتنا ہی جاننا ہمارے لئے کافی دُکھ بھرا ہے؟ اس لئے کہ بہتر ہے کہ تم آگے اس سے نہیں ملو ——"

"لیکن ——؟"

اور اس "لیکن" کو پاپا نے ایک جنونی کے طور پر لیا۔

"تم، جسے کالج کی چھوٹی موٹی دوستی کہہ کر بات ٹالنے کے موڈ میں ہو، یہی دوستی دو چار ملاقاتوں کے بعد محبت کہلانے لگتی ہے۔ اور محبت بھی ایک واہیات مسلمان سے۔ تم کسی ہریجن کو بھی چاہتی تو مجھے کوئی دُکھ نہیں ہوتا، جتنا یہ سُن کر ہو رہا ہے کہ تم ایک مسلمان سے

میل جول بڑھا رہی ہو۔"

پھر ممی نے آڑے ہاتھوں اسے لیا تھا۔ مٹین کی چھایا سے بھی دھرم بھرشٹ ہوتا ہے پگلی۔ گائے کا مانس کھانے والے۔ یہ مٹین تو اپنے کے بھی نہیں ہوتے۔"

پھر بُوا نے سُنے سُنائے اتیہاس کے بیتے کل پُرزے کھول کھول کر آگ میں جھونکنے شروع کر دیئے کہ مٹین تو نہاتے ہی نہیں اور ایک سے ایک کہانیاں جو پوری قوم کو غدار قرار دے رہی تھی۔

اب باری تھی مایا دیدی کی، جو ان دنوں پولیٹکل سائنس میں ایم اے کر رہی تھیں۔ مایا دیدی نے اسے مذہبی سیاست کا ملا جلا خلاصہ پڑھایا۔

"آخر اب کس لئے مسلمان اس ملک میں ہیں؟ آزادی کے ہنگامے نے تو جناح کے مُسلم لیگی ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ گاندھی جی انگریزوں کے سامنے پھلے ہی توپ ہوں، لیکن سچائی میں ہیں سب سے دبو آدمی۔ یہی وقت ہے ہندوستان کی کوکھ سے ایک اسلامی ملک کو اُچک لینا۔ ایک بڑا حصّہ نکلنے کے بعد بھی تو ہندوستان نے پاکستان کی طرح اسلامی ملکوں جیسا مذہبی لیبل اپنی پیشانی پر نہیں رکھا۔ دُنیا بھر میں آخر اتنے سارے اسلامی ملک ہیں" ہندو راشٹر" تو مٹھی بھر بھی نہیں۔ پھر آخر یہ مسلمان ہندوستان کو ایک ہندو ملک کے طور پر دیکھنا کیوں نہیں گوارا کرتے؟"

مرگ نینی چپ چاپ سُنتی رہی۔ کیا بولتی کہ اس کے لیے چوڑے بھاشن کا اسد سے کیا تعلق ہے۔ مذہب کی سیاست کے اس بھنور میں اس کی اور اسد کی دوستی کہاں آتی ہے؟"

اب باری تھی رنجن کی۔ اس کا چھوٹا بھائی۔ دراصل اسد سے ملنے جلنے کی معلومات رنجن نے ہی پہنچائی تھی۔ وہ ایک ہی جملہ اُچھال کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

"اس مٹین کے چھوکرے کی تو ایک ہی بار میں۔۔!" اس نے سُرخ آنکھوں سے مرگ نینی کو دیکھا تھا اور مرگ نینی تڑپ کر تیزی سے بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی اور زور زور سے رونے لگی لیکن اچانک اسے لگا، رونا کہیں سے کسی مسئلے کا حل نہیں۔ بلکہ ایک طرح کی بزدلی ہے۔ بہتر ہوگا کہ وہ اسد سے نہیں ملے۔ اس لئے کہ بغاوت وہ کر نہیں سکتی۔ نہ ہی یہ اس کے بس کا روگ ہے۔"

پھر ایسا کتنی بار ہوا جب اس طرح کی سبھاؤں میں پاپا گھر کے لوگوں کو بھی شامل کرنے لگے۔ پھر کتنی ہی بات اس کے دھیرے دھیرے سمجھ میں آنے لگیں۔ مسلمان بادشاہوں کے قصّے اس کے سامنے کھلنے لگے۔ اندھیرے کی کیسی کیسی پرتیں ہٹیں۔ ان سبھاؤں میں ہندو مذہب کو دُور دُور تک پھیلانے کی بات ہوئی۔ معصوم ذہن میں ہندو دھرم کے بیج لگائے جانے کا ذکر ہوتا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ ہندوستان کو وہ ایک مکمل ہندو راشٹر کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

اب پاپا کے ساتھ ساتھ ان سبھاؤں میں وہ ماں کے تیور بھی پڑھنے لگی تھی۔ ۔ ۔ اس دن گھر پر ہی کچھ لوگوں کے آجانے سے ایک بیٹھک ہوگئی۔

ماں بولی تھی۔

"ایک چیز ہوتی ہے قوتِ برداشت۔ مسلمان بادشاہوں نے ایک ہی بات جانی حملے کی بھاشا اور تلوار کی زبان۔ اور ہم نے محبّت کی بھاشا سے کام لیا، یا برداشت سے۔ نتیجۃً وہ ہمارے سر پر چڑھ گئے۔ اب باری ہے انھیں سیدھے سیدھے بتانے کی کہ ہندوستان پوری طرح ایک ہندو راشٹر ہے۔ یہاں رہنا ہے تو ہندو بن کر رہنا ہوگا۔"

پتہ بھی نہیں چلا۔ کب کیسے دوسرے بہت سارے لوگوں کے ساتھ ہنسی قہقہوں کے بیچ مرگ نینی کے ہاتھ بھی اچانک تیزی سے اُٹھ گئے۔

"مُسلمان کا ناش ہو! ۔ ۔ ۔"

پاپا نے پیار سے اس کی طرف دیکھا پھر لہجہ سخت ہوا۔ "فخر سے کہو ہم ہندو ہیں۔"

پھر سب نے یہ جملے دُہرائے۔ فخر سے کہو ۔ ۔ ۔

اور مرگ نینی کو لگا اسد اچانک کسی غار میں چھپنے لگا ہے۔ اس کا سایہ گُم ہوا جا رہا ہے۔ اُسے یاد آیا اسد نے ایک بار کہا تھا۔

"دراصل آر۔ ایس۔ ایس کمیونل جماعت نہیں ہے۔ ڈاکٹر ہیڈگیور نے اسے بطور ڈسپلن لیا تھا کہ ہندو مذہب ایک خاص طرح کی ڈسپلن کی پیروی کرکے زندگی کے

مقصد کو سمجھیں"۔ مرگ نینی کو لگا اسد اس غار میں ڈوبتا جا رہا ہے اور جب اس اندھیرے تنگ غار سے اس کا سر تھوڑا سا اونچا ہوا تو وہ بپھر گئی۔

"تمہارا ناش ہو۔ تم سب کینسر ہو کینسر۔۔۔"

پاپا نے مشورہ دیا" اسد تم اپنا مذہب چھوڑ کر آجاؤ"۔

اور اسد پھر سے غار میں گم ہو گیا ۔۔۔ باہر نہیں نکلا۔

تب سے کتنا وقت گذر گیا۔ پھر اس کی شادی اوینا ش سے کر دی گئی۔ اوینا ش دہلی میں دوا کی ایک بڑی فرم میں میڈیکل ریپریزنیٹیو تھا۔ فطرت سے چنچل اور آزاد مذہب کی بندشوں کو نہیں ماننے والا۔ اوینا ش کے قریبی دوستوں میں مسلمان بھی تھے۔ خاص کر عبدل بھائی، جو بلا ناغہ آتے۔ پھر تو گوشت اور مچھلی کی بہار آجاتی۔ عبدل بھائی کی پرانی دہلی میں الیکٹرانک کی دکان تھی۔ اب تو وہاں ان کے بچے بیٹھتے تھے۔ ایک لڑکی کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ پتہ نہیں کیا تھا کہ اتنی عمر ہونے کے بعد بھی ان کا دل اوینا ش سے ہی لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ بنوا کر گھر سے لایا کرتے۔ شروع شروع میں تو مرگ نینی کو گوشت مچھلی چھوتے ہوئے بھی ڈر سا لگتا تھا۔ کہاں اس کا گھر جہاں ان سب کے بارے میں سوچنا بھی گناہ تھا اور اوینا ش کے لئے تو سب گوشت برابر تھے۔ کیا بڑے کیا چھوٹے کا ۔۔۔ شروع شروع میں تو اس کا سارا جسم ہی سہرا اٹھا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے وہ عادی ہونے لگی۔

(۲)

اندھیری رات ۔۔ مرگ نینی کی اٹھنے کی خواہش ہوئی، لیکن پھر وہ لیٹ گئی۔ رات کی تاریکیوں میں تو کتنی ہی بار ذہن کے سناٹے میں خالی خالی قدموں کی صدا ابھرتی رہتی ہے۔ کون؟ تب کوئی نہیں ہوتا۔ صرف ایک جھوٹ بھرا یقین۔ لیکن مرگ نینی یہ سب کیوں یاد کر رہی ہے۔ تب سب کچھ ایک خوفزدہ خواب کی طرح اس کے ذہن پر نقش ہو گیا۔ ... بھیانک خواب جیسی حالت ۔۔۔ جیسی کہ اب اس ملک کی ہوئی ۔۔۔ فرقہ پرستی کے

بڑھتے شعلے اور ملک میں ہونے والے فرقہ وارانہ فساد... رام جنم بھومی اور بابری مسجد سے اپجے مسئلے۔ کشمیر اور پنجاب کا مسئلہ ان کی دل دہلا دینے والی سرخیوں سے اندر تک جمے ہوئے خون کو محسوس کرنا۔ اور کہیں اپنی ہی آنکھوں سے ٹٹولنا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ... یہ جماعتیں کیا کر رہی ہیں ... جو مذہب کے لباس میں پورے ملک کو ہی نیست و نابود کرنے میں جٹ گئی ہیں۔ تب ایک ایسے ہی خوفزدہ خوابوں کی آندھی اور بھی آئی تھی۔ جب اس کا پہلا بچہ بلبیر اسے ڈیڑھ سال کی عمر میں روتا چھوڑ گیا تھا اور وہ کسی بھیانک خواب کی طرح چیخ مار مار کر اٹھی اور رو رو کر دروازے کی طرف بھاگی... اور یہی اوی ناش تھے اور عبدل بھائی جو اسے بار بار پکڑ کر اندر لاتے ... پھر ہفتوں مہینوں گذر گئے۔ عبدل بھائی نے سمجھایا تھا... "صبر کرو اوی ناش..." بہو کو دَورے نہیں پڑتے ... اسے محبت کہتے ہیں ... جب تک اس کی گود دوبارہ نہیں بھر جاتی ... ہم تم اس کا علاج نہیں کر سکتے ..."

بلبیر کی موت کا سن کر پاپا بھی آئے تھے۔ عبدل بھائی کو دیکھ کر پاپا کی آنکھوں میں کنکری چبھی تھی۔

"یہ بوڑھے میاں یہاں کیوں آتے ہیں؟"

اوی ناش نے بتایا ہمارے ہمدرد ہیں۔ مرگ نینی کو بہت مانتے ہیں۔ بچے کام پر لگ گئے خالی ہیں تو زیادہ وقت یہیں گذارتے ہیں۔

پاپا نے اپنے طور پر سمجھایا "زمانہ خراب ہے۔ وہ بوڑھے میاں کا یہاں آنا اچھا نہیں سمجھتے۔"

اوی ناش نے بات بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ تاؤ کھاتا ہوا وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ لیکن شاید پاپا کی بات وہ اپنے دل سے نکال نہیں پایا۔ شام کے وقت دروازے پر دستک پڑی ... بہو... او... ہو...

آواز عبدل بھائی کی تھی۔ اوی ناش نے دروازہ کھولا... چہرے پر پاپا والی بات کی بھاپ موجود تھی۔ "آئیے!" کہتے ہوئے اس کے لہجے میں بھاری پن موجود تھا۔ عبدل بھائی نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا۔ اس کے برعکس بہو... بہو کہتے ہوئے اندر آ گئے۔

ہاتھ میں ایک پیالہ پکڑے ہوئے تھے۔ مرگ نینی قریب ہی تھی۔ تیزی سے بولی۔
"کیا ہے...؟"
عبدل بھائی خوش ہو گئے۔ کچھ سوئیاں بنی تھی بہو، سوچا تھیں اور اوینا ش کو بھی چکھاتا چلوں...

اوینا ش نے آگے بڑھ کر پیالہ لپک لیا تھا... اور بہت غور سے گمبھیرتا سے عبدل بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
"کیوں کرتے ہیں یہ سب... کیوں لاتے ہیں اتنا کچھ... آپ جانتے ہیں آپ ہمارے لئے صرف ایک مسلمان ہیں، جو ہم سے محبت رکھ ہی نہیں سکتے۔"
"کون کہتا ہے" عبدل بھائی کانپ کر رہ گئے۔

اوینا ش نے نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔ "سُکھ دُکھ کے موقعوں پر آپ نے ہمارے ساتھ جو کچھ بھی کیا ہے، وہ کیا کسی غرض سے کیا ہے"
"کیا کہتے ہو اوینا ش" عبدل بھائی بگڑ گئے تھے۔ سارا قصور تو دل کا ہے۔ ... جسے چاہے پسند کرے... جس کا چاہے ہو جائے... تم اور بہو اپنے لگتے ہو تو..."

لیکن اچانک ہی عبدل بھائی نے نرسنگھ کی جلتی آنکھوں کو دیکھ کر سارا معاملہ سمجھ لیا۔ وہ اٹھ کر چل دیئے اور نرسنگھ غصے میں سامان باندھنے لگے۔

مرگ نینی غصے میں تھی۔ "پاپا کی انسلٹ کیوں کی؟"
"انسلٹ کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا... میں صرف بات کی باریکی سمجھانا چاہ رہا تھا... کہ دراصل ویسا کچھ نہیں ہے جیسا وہ سمجھتے ہیں"

عبدل بھائی نے بھی جاتے جاتے کہا تھا "قصور صرف ایک طرفہ سوچ کا ہے، پرانی دہلی کی جب ہوا خراب ہوتی ہے تو ہمارے بچے بھی ہندو مسلمان کا فرق نکالنے لگتے ہیں... اللہ بچائے اس ہوا سے"

اور اوینا ش نے کہا تھا "سارا قصور تو ان سیناؤں کا ہے مرگ نینی...

بجرنگ سینا ... شیو سینا ... آدم سینا ... باندر سینا ... ان سیناؤں نے ملک کی سالمیت نوچ ڈالی ... جمہوریت ختم کر ڈالی۔ اب صرف الگ الگ مذہب کے نام پر یہ نامرد سینائیں بچی ہیں، جو ہمارے یہاں کی تاریخی ایکتا سے کھیلتی رہتی ہیں۔"

مرگ نینی صرف اتنا بولی ..." لیکن یہ کوئی وقت تھا بولنے کا۔ پاپا ہمارے غم میں آئے تھے ... اب غصے میں جا رہے ہیں ... روکو نا ...."

اوِناش نے یہاں بھی سختی دکھائی۔" نرمی کا مطلب ہے ایک بیمار سوچ کو قبول کرنا ... اور اس کو ٹھہراؤ دینا۔ اس سے یہ ممکن نہیں ..."

مرگ نینی کو لگتا ہے پاپا اور ان کے تعلقات کے بیچ کہیں دراڑ پڑ گئی ہے۔ ایک گمبھیر فکر میں ڈوب گئی ہے مرگ نینی۔ رات جیسے جیسے سرکتی رہی، مرگ نینی گہری اُداسی میں ڈوبتی چلی گئی۔ اندر صدیوں سے چپ بیٹھے ناگ نے جیسے اُسے ڈسنا شروع کر دیا ... تم کہاں ہو مرگ نینی ... اس پورے تناظر میں تم کہاں ہو؟ ... شاید کہیں نہیں ... کیا اوقات ہے تمہاری ... کیا حیثیت ...؟ تمہاری اپنی شخصیت کیا ہے ...؟ یا بالکل ہی نہیں ...؟ تم صرف دوسروں پر منحصر رہی ... یا جیتی رہی ... شادی سے پہلے پاپا کے مذہبی خیالوں والے کٹہرے میں ... اور شادی کے بعد شوہر کی آزاد خیالی کے آسمان میں ... لیکن یہ تو دوسروں کے وجود کا حصہ تھا ... تم خود کہاں رہی مرگ نینی؟ اگر نہیں رہی تو کیوں نہیں رہی ...؟

اور مرگ نینی کو لگا ... وہ خلا میں بکھرتی جا رہی ہے۔ لیکن یہ احساس بھی تھا کہ اس بکھراؤ سے ہی ایک مضبوطی کا جنم ہوتا ہے۔

اس دن عبدل بھائی گھبرائے ہوئے آئے تھے ... چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا، پھر بھی ہاتھوں میں ٹفن موجود تھا جس میں اوِناش کے لئے گھر سے بنا ہوا "استو گوشت" لائے تھے۔ عبدل بھائی کا لہجہ اس دن سہما ہوا تھا۔ بولے:

"پتہ نہیں کیوں آزادی کے اتنے سالوں بعد لگتا ہے، یہ ملک اب ان کا اپنا نہیں رہا۔ ہوا بدلتی جا رہی ہے۔ ذہنوں میں فرق کے جراثیم آگئے ہیں۔ خدا بچائے۔

حکومت بنانے والی پارٹیاں بھی اب کھلے عام مسلم دشمنی کا اعلان کرنے لگی ہیں۔ اگر پاگل ہوا کا بہاؤ یہی رہا تو ۔۔۔"

اوبناش نے ٹوکا تھا۔" آپ غلط سوچ رہے ہیں عبدل بھائی۔ چند ناسمجھ لوگ اگر ۔۔۔"

" ناسمجھ نہیں" عبدل بھائی صبر کا پیمانہ چھلک آیا ۔۔ ان چند سالوں میں مذہب کے پاؤں ہندوستان کی زمین پر جس طرح مضبوطی سے جمے ہیں، پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ سچ بتاتا" عبدل بھائی نے ٹھنڈی سانس بھری" زرینہ کا فون آیا تھا۔ اس کے یہاں اسٹڈی (S.T.D) ہے نا ۔۔۔ جب تب فون کرتی رہتی ہے ۔۔۔ فون پر کیسی لرزتی ہوئی آواز تھی اس کی ۔۔۔ کہہ رہی تھی ۔۔" ابا فضا بہت خراب ہے ۔۔۔ ڈر لگ رہا ہے ابا ۔۔۔ کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے ۔۔۔"

" آپ انھیں بلا کیوں نہیں لیتے ۔۔۔" مرگ نینی نے پوچھا۔

" کیسے بلاؤں ۔۔۔ بیٹی داماد کی بات ہے ۔۔۔ فیروز کے کام میں خلل پڑتا ہے"

اس دن پہلی بار عبدل بھائی بوڑھے لگے تھے۔ کمر سے تھوڑا جھکے ہوئے ۔۔۔ بال تو پورے پک گئے تھے ۔۔۔ لگا ۔۔۔ ہاتھ کی جھریوں میں بھی کپکپاہٹ آگئی ہے۔ ۔۔۔ لرزتی ہوئی آواز بیمار ماحول کا ایک حصہ بن گئی۔

" خیر! جو ہو رہا ہے اچھا نہیں ہو رہا ہے۔ فرقہ پرست پارٹیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور یہ پارٹیاں جیت کر اپنے حلقے میں فرقہ واریت بڑھاتی جا رہی ہیں۔ تم اسے کیا نام دوگے اوبناش؟ اس کا مطلب تھک ہار کر عام ذہنوں نے بھی مذہب کے کٹرپن کو قبول کر لیا ہے۔ یا جو بھی وجہ رہی ہو ۔۔۔ اور ایک دن یہ فرقہ پرست پارٹیاں ہی یہاں حکومت کریں گی ۔۔۔ تب؟ سوچ سکتے ہو ہم کتنے نازک دور میں آکر ٹھہر گئے ہیں ۔۔"

عبدل بھائی کی سانس تیز ہو گئی ۔۔۔ اسے کچھ اور مت سمجھنا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ یہ دنگے زیادہ وہیں ہوئے ہیں جہاں مسلمانوں کی مالی حالت اچھی رہی ہے — اور

آر۔ ایس۔ ایس جیسی جماعتوں کی نظر میں وہاں لگی رہی ہیں . . . مسلمانوں کو توڑنے کے لئے ....

عبدل بھائی چلے تو گئے ... مگر مرگ نینی کو گہری فکر میں چھوڑ گئے۔ اپنے سُونے پن کے گھنے دائرے میں گم ہوتے ہوئے اسے اپنے گھر کی وہ سبھا یاد آئی، جہاں اس نے بھی مذاق میں ہی ہاتھ ہلا کر پاپا کے دوستوں سے اتفاق کیا تھا "مسلمانوں کا ناش ہو۔"

اچانک خلا میں ڈوبتے ہوئے اُسے لگا چہرے بدلنے لگے ہیں پاپا کے .... ممی کے .... اور سبھوں کے جن کے تعلق ایسی پارٹیوں سے تھے، اسے لگا ان کے چہرے سخت ہونے لگے ہیں ... پھر وہ ایکدم سے دیو نظر آنے لگے .... بے ہنگم . . . وحشی سروں کا آلاپ کرتے .... اور اسے لگا کمرے میں دُور تک خون پسر گیا ہو۔

اس کی دھیرے سے چیخ نکل گئی۔

تسلسل تو اس وقت ٹوٹا جب اس نے دیکھا ... وہی بوڑھا لڑکھڑاتا وجود اوبناش کے ہاتھوں کے سہارے ان کے ڈرائنگ رُوم میں چپ چاپ آکر بیٹھ گیا ہے ... وہ ایک ٹک عبدل بھائی کے سوکھے آنسوؤں کے پیچھے چھپی دردناک کہانی کو پڑھنے کی ہمّت کرنے لگی۔

اوبناش کا چہرہ پتھر جیسا سخت دِکھ رہا تھا۔

دوپہر دو بجے کا وقت۔ دھوپ کی تپش نے پورے شہر کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ آگے بڑھ کر مرگ نینی نے کولر آن کر دیا۔ عبدل بھائی اچانک سسک سسک کر رونے لگے تھے۔

اوبناش نے جھنجھوڑا "عبدل بھائی ہمّت رکھئے۔"

مرگ نینی نے کانپتی آنکھوں سے اوبناش کی آنکھوں میں جھانکا۔ اوبناش نے اسے کچھ اشارہ کیا۔ وہ لرزتے قدموں سے دوسرے کمرے میں بھاگی اور فرج کھول کر ٹھنڈا شربت بنا کر لے آئی۔ عبدل بھائی نے دھیرے دھیرے شربت گلے سے نیچے اُتارا۔ اور پھپھک پڑے۔

"سب کچھ لٹ گیا بھائی — سب کچھ —"

وہ تھوڑی دیر تک بیٹھے۔ اوبناش نے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن رُکے نہیں۔ اوبناش نے انھیں گھر تک چھوڑنا چاہا لیکن وہ ٹال گئے . . . بچے بہت غصّے میں ہیں . . . تمھارا جانا ٹھیک نہیں . . .

عبدل بھائی کو چھوڑ کر اوبناش دوبارہ واپس آئے تو مہینوں کے بیمار دِکھ رہے تھے۔ آتے ہی مسہری پر لیٹ گئے۔ گہری اداسی میں — مرگ نینی دھیرے سے بڑھی۔ ماتھے پر کانپتا ہوا ہاتھ رکھا۔ پُوچھا کیا ہوا؟

"عبدل بھائی کے بیٹی داماد" اوبناش کا لہجہ کانپ رہا تھا۔ بارہ بجے فون آیا تھا زربینہ کا۔ فون عبدل بھائی نے ہی ریسیو کیا۔ فون پر ڈری سہمی آواز تھی۔

"ابّا سارے محلّے میں آگ لگ رہی ہے" پھر آواز آئی "ابّا وہ پڑوس کا مکان جلا رہے ہیں" فون ہر تھوڑی تھوڑی دیر پر آ رہا تھا۔ پھر فون آیا۔" ابّا اب بلوائی ہمارے گھر میں گھس رہے ہیں . . . ابّا اب وہ پھاٹک توڑ رہے ہیں . . . ابّا اب پھاٹک ٹوٹ گیا ہے . . . ابّا اب وہ گھر میں داخل ہو گئے ہیں . . . اور ابّا . . . صرف ایک تیز چیخ تھی زربینہ کی۔ اور اس کے علاوہ عبدل بھائی کچھ نہیں جانتے کہ کیا ہوا؟

اوبناش نے دانتوں کو بھینچتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ یہ کیا ہے — کیا ہو رہا ہے . . . ؟ کیا یہ پوچھنے کا حق ہم کو نہیں ہے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے ؟ آخر ہم بھی اس ملک کے رہنے والے ہیں . . . اس کی آواز لڑکھڑا گئی تھی۔ یار باس ! تمھارے پاپا بھی انھیں میں سے ایک ہیں۔ قاتل . . . درندے . . .

مرگ نینی اچانک اٹھ کھڑی ہوئی — "میں جا رہی ہوں"

اوبناش نے پلٹ کر دیکھا — "کہاں ؟"

"عبدل بھائی کے یہاں" اس کے لہجے میں سختی تھی۔

اوبناش پلنگ سے اُٹھ کر بیٹھ گیا "پاگل ہوئی ہو۔ عبدل بھائی کے بچے خونخوار ہو رہے ہیں اس وقت۔ جانا مناسب نہیں ہے"

"لیکن میں جاؤں گی"
مرگ نینی کے لہجے میں پہلے سب سے زیادہ سختی تھی۔ "میں اکیلی جارہی ہوں"
اویناش دھم سے لیٹ گیا۔

عبدل بھائی کے یہاں ماتم پُرسی کرنے کتنے ہی لوگ آگئے تھے۔ رہ رہ کر سسکیوں کی آوازیں تیز ہو جاتیں۔ مرگ نینی ایک طرف کھڑی تھی۔ اسے غصّے میں دیکھتے ہوئے عبدل بھائی کے بچے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کی چھوٹی بیٹی ریحانہ بھی ہمیشہ کی طرح آج مرگ نینی سے کھیلنے نہیں آئی۔ مرگ نینی دھیرے سے آگے بڑھی اور عبدل بھائی کی بیوی سے سٹ کر بیٹھ گئی۔ اور اچانک جانے کیا ہوا کہ وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ عبدل بھائی اُلٹے پاؤں لوٹے اور اسے لپٹا لیا عبدل بھائی کے بچّے بھی نکل کر باہر آگئے تھے۔ چہرہ سوجا ہوا تھا لیکن اب وہاں نفرت نہیں تھی ایک سکون جھلک رہا تھا۔

وہاں سے وہ لوٹی ضرور، لیکن لگا، وہ کسی قبرستان سے نکلی ہے۔ ایک بھیانک سناٹے نے پورے ماحول کو ڈھک لیا ہو۔ رات میں عبدل بھائی، اور عبدل بھائی کے گھر کے سارے لوگوں کے چہرے ذہن میں چھپائے رہے۔ کیا سچ مچ فضا بدلی ہے، یا اتنی اشانت کہ کبھی شانت نہ ہو سکے گی۔ اب تو پرب تہواروں کے موقع پر بھی پولیس سیکوریٹی بڑھا دی جاتی ہے۔ کیوں؟ کس لئے؟ کیا پرب تہوار ساز گار فضا کے لئے روز بروز ایک چنوتی بنتے جارہے ہیں۔ آنکھوں میں ہندوستان کا ایک نقشہ بنتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے۔ اس پورے نقشے کو دنگائی گھیرتے جارہے ہیں۔ ان میں ہر شکل اس کی جانی پہچانی ہے۔ پاپا سمیت سارے لوگوں کو وہ پہچانتی ہے ... اور پاپا کہہ رہے ہیں ... اتنی مدّت بعد اگر اب ہمیں یہ احساس ہوا ہے کہ اس ملک میں ہندو راجیہ آسکتا ہے تو ہمیں اس کے لئے کوشش کیوں نہیں کرنی چاہیئے۔

مرگ نینی کا دل نفرت سے بھر اُٹھتا ہے ... اسے لگتا ہے ... وہ ریلیکس نہیں ہو پارہی ہے ... اس کے اندر انتشار بڑھتا ہی جارہا ہے۔

گھر آئی تو پتا جی کا خط رکھا ہوا تھا۔ "تم آسکتی ہو تو آجاؤ۔ یہاں کا ماحول بھی

خراب ہو رہا ہے۔ تمھاری ماں تم کو لے کر کافی پریشان ہیں۔ ایسے موقع پر تمھیں بلانا مناسب تو نہیں لیکن مجھے لگتا ہے تمھیں دیکھ کر شاید تمھاری ماں بہل جائیں۔"

"ماں بابو جی کو یہاں بلا لوں؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"بلا سکتی ہو۔ لیکن کیا وہ لوگ آئیں گے؟"

اویناش نے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اس سے بھی بڑا ایک سوال ہے۔ تمھارے بابو جی یا ہم تم کہاں کہاں ان دنگوں اور فسادوں کے خوف سے بھاگتے رہیں گے... کس جگہ کو تم محفوظ کہہ سکتی ہو۔ اگر آگ آج یہاں لگی ہے تو کل کسی دوسرے مقام پر بھی لگ سکتی ہے۔

"پھر؟"

"ہم دونوں ہی چلیں گے۔"

شہر میں جتنا ہنگامہ تھا، گھر کے ماحول میں اتنی ہی اداسی چھپی تھی۔ پاپا ممی نے خوفزدہ آنکھوں سے ان دونوں کا خیر مقدم تو کیا، لیکن مرگ نینی کو محسوس ہوا، شہر کی ناسازگار فضا سے الگ ایک عجب طرح کا خوف ان کے دلوں میں پل رہا ہے۔ دو چار روز میں یہ بھی احساس ہوا کہ پاپا اویناش کے ڈر سے کوئی بھی ایسی بات کہنے سے ہچک رہے ہیں جس پر وہ بھڑ کے چھتے کی طرح نہ ٹوٹ پڑے۔ ہاں، اس بار رنجن کچھ زیادہ ہی مخالفت پر اُترا نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں پتہ نہیں وہ کیسی دہکتی آگ تھی کہ مرگ نینی اس کا سامنا کرنے سے ڈر رہی تھی۔

اس دن ڈائننگ ٹیبل پر اس خاموشی کا خاتمہ اویناش نے ہی کیا۔

"شہر کا ماحول اچھا نہیں؟"

"ہاں"، پاپا سہم کر بولے۔

"آپ بھی پریشان ہیں" اویناش نے چٹکی لی۔

"آبوِیسلی (Obviously)"

"آپ کو تو پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ آخر آپ ہی کی جماعتیں تو..."

اچانک اس نے رنجن کے چہرے پر ایک خونخوار تناؤ کو محسوس کیا۔

"مطلب؟" رنجن نے پلٹ کر اوِناش کو دیکھا۔

اوِناش نے پھر زندہ دلی کا مظاہرہ کیا۔ خوف کے جنم داتا بھی آپ ہیں ... گھبراتے بھی آپ ہیں۔ کیا صرف اس لئے کہ آپ کا گھر بھی جلنے والوں میں ایک ہو سکتا ہے ..."

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

مرگ نینی نے دیکھا۔ پاپا نے کھانے سے ہاتھ روک لیا ہے۔ اور وہ پُرانا کرمنل لائر ان کے اندر پھر زندہ ہو گیا ہے۔ ویسی ہی گمبھیرتا اور رنیتی تلی آواز۔

"تمہیں اپنے آپ کو سیکولر کہلوانے کا شوق ہو گیا ہے۔ کتنے سیکولر ہو تم۔ دنگوں کے دوران اگر تمہاری بیوی مسلمانوں کے بیچ پھنسی ہو تو کیا اس وقت بھی تم اتنے ہی سیکولر رہو گے؟

مرگ نینی نے دیکھا، اوِناش پاپا کی بات سے کمزور پڑا ہے، یا سوال کے جواب میں اتنی دُور نکل گیا ہے کہ جلد واپسی ممکن نہیں۔

پھر اس نے دیکھا کہ اب مورچہ رنجن نے سنبھال لیا ہے۔

"بھارتیہ سنسکرت میں دھرم کی نیو اتنی گہری ہے کہ سیکولرازم صرف دِکھاوے جیسا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ آپ دھرم کو مشکل بندھن سمجھ کر اس سے کٹنے کی سوچ رہے ہیں۔

اور پاپا نے پھر کہا۔ "آخر بھارت کو ایک ہندو راشٹر بہ کیوں نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ مانگ کہاں سے ناجائز ہے؟"

اور پھر اس نے دیکھا، ممّی کچھ کہتے کہتے ٹھہر گئی ہیں۔ مرگ نینی کو احساس ہو۔ پاپا کا جنم ایک نئے انداز میں رنجن کے اندر ہوا ہے۔ وہ ایک ٹک ڈائننگ ٹیبل پر پسری اس بھیانک سنّاٹے کے بارے میں سوچ رہی تھی، جو اچانک اوِناش کے مذاق سے پیدا ہوئی تھی۔

اویناش نے جیسے ہار مان لی۔ بس اتنا کہا لیکن سیدھے سیدھے کسی رسم کی مخالفت سے بھی تو کوئی راہ نہیں نکلتی۔

مرگ نینی کو احساس ہوا، اویناش کا لہجہ پوری طرح ابھر نہیں سکا ہے۔ اور دن کو رات کہنے والی بے معنی جرح سے کوئی نتیجہ نہیں نکلنے والا۔

اسے لگا، وہ ڈائننگ ٹیبل کسٹمس میں بندھی نہیں رہ سکتی۔ رشتے صرف خون کے تو نہیں ہوتے۔ آخر عبدل بھائی بھی تو ہیں۔ کیا لگتے ہیں وہ ان کے۔ کیوں اتنی محبّت دے جاتے ہیں۔ اس نے پہلے کہ اویناش کا سر، ماحول کے بوجھ تلے دب جاتا، بچپن سے اندر تھوڑا تھوڑا کر کے جمع ہو رہے زہر کو، ایکدم سے سمیٹ کر مرگ نینی چیخ پڑی۔

"آخر میں کہیں ہوں کہ نہیں پاپا۔ اگر ہوں تو مجھے اپنی بات کہنے کا پورا حق ہونا چاہیئے۔ کل میں نہیں تھی۔ کل کیا، کبھی آج سے پہلے نہیں تھی۔ اس لئے کہ پیدا ہوئی تو آپ تھے اور آپ کے خیال تھے۔ ہمارے تو صرف پاؤں تھے۔ آپ جیسے چاہتے ہمیں چلایا کرتے۔ ہمیں آپ کی کسی بات کو کاٹنے کا حق نہیں تھا یہ بھی نہیں کہ یہ محدود سوچ آپ اُگا ہی کیوں رہے ہیں۔"

اس نے ایک نظر سب کی طرف ڈالی پھر تیز تیز بولتی چلی گئی۔

غلط اگر غلط ہے تو اس کے لئے کسی منطق کی ضرورت نہیں۔ اتنا مان لینا کافی ہے کہ یہ غلط ہے۔ اگر ایک مکان جل رہا ہے تو یہ پوچھنا بے معنی ہے کہ یہ کیوں جل رہا ہے۔ سب سے پہلا کام آگ بجھانا ہے۔ اس لئے آپ کی ساری منطق بے بنیاد ہے۔ کہ ایسا ہونا چاہیئے یا ہندو راشٹریہ۔۔۔"

اس نے اویناش کی طرف دیکھا۔ پھر سہمی ہوئی ممّی کی طرف، حیرت سے دیکھتے رنجن کی طرف، گہری آنکھوں سے جھانکتی پاپا کی طرف ــــ اور پھر بولی۔

"جب دو خیالوں میں زمین و آسمان کا فرق ہو اور یہ احساس بھی ہو کہ انہیں ملانے کی کارروائی بیکار ہے تو۔۔۔؟ ایسے رشتے ٹھہریں گے تو نہیں نا۔۔۔ پھر ان رشتوں کو ڈھویا جانا کیا ضروری ہے۔ اس لئے میں ابھی سے یہ رشتہ توڑ

رہی ہوں۔

مرگ نینی نے ایک ٹھنڈی سانس اچھالی "گڈ بائے پاپا اینڈ گڈ بائے ایوری باڈی"

پھر اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر اویناش کی طرف دیکھا اور کہا۔

کل آفس نہیں جاؤگے کیا؟

اور جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گئی۔

بمبئی ۱۹۹۱ء ◆◆

میں ہارا نہیں ہوں کامریڈ

'ساتھی'۔۔۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک اُس نے مجھے صدا لگائی تھی ۔۔۔ ٹھہرا تھا ۔۔۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ایک منٹ کے لئے ٹہلنا بند۔ اب جیسے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں کسی اور ہی منظر میں گم لگ رہی تھیں۔ ایسا ہر بار ہمیشہ ہی اس کے ساتھ ہوتا۔

'ساتھی'۔۔۔ اس نے یہ لفظ پھر دُہرایا۔ اتنے ہلکے سے کہ ایک پل کو لگا جیسے اس چھوٹے سے کمرے میں اُسے میری موجودگی کا احساس تک نہ ہو اور یہ لفظ بھی جیسے وہ خود سے بولا ہو۔ خود سے بھی ڈرتے ڈرتے اور اٹکتے ۔۔۔۔ ساتھی ۔۔۔ کہہ کر اس نے چھوٹے کمرے کا ایک راؤنڈ پھر لیا۔ اور اس چھوٹے سے سامان کو دیکھا جسے وہ صبح سے ہی تہیانے اور باندھنے میں لگا تھا۔ ایک پُرانی چادر کی بڑی سی گٹھری تھی، جس میں اس نے اپنے مطلب کی کچھ پُرانی میگزینس، ضروری اخبارات کی فائلیں اور کتابیں رکھی تھیں۔ ساتھ میں کچھ گندے میلے کپڑے بھی تھے جسے دلّی آنے کے بعد اُس نے شاید ہی کبھی پہنا ہو یا پہننے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ ایک بار پھر گٹھری کی گانٹھ کو دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ ٹھیک بندھی ہے یا نہیں۔ اُٹھانے پر کھُل تو نہیں جائے گی۔ دوسرا سامان چمڑے کا ایک پُرانا بکسا تھا، جس کی تاریخ بابو جی سے جڑی تھی۔ یہ بابُو جی کے اسکول کے زمانے کا بکسا تھا۔

ہینڈل تک تو ٹھیک تھا، لیکن قلابہ خراب ہو چکا تھا۔ اس لئے تالا بند کرنے کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ ایک منٹ کے لئے پُرانے اتہاس سے جُڑے اس بکسے پر پیار آیا اُسے۔ کچھ سوچ کر آنکھیں بھی گیلی ہو گئیں۔ فرطِ جذبات سے بکسے پر جمی گرد کو انگلیوں سے ہاتھ میں لے کر دیکھا اُس نے۔ کچھ پُرانی یاد جُڑی تھی، جو اُسے بھیتر سے بھگو گئی تھی۔ پاتا نا کم ہمت بھی نہیں تھا وہ کہ رو دیتا یا آنسو نکل آتے۔

ایکدم سے اچانک مہانگری کے اس تھرڈ گریڈ ایمپلائز کوارٹرز کے اس حبس دیتے کمرے میں بابوجی اُمڈ آئے۔ ۔۔ کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں میں بکسے سے جُڑی تاریخ کو بتاتے ہوئے چمک سی آ گئی۔۔۔۔

معلوم، اس بکسے کو لے کر پہلی بار امتحان دینے پٹنہ گیا تھا۔ تب پٹنہ جانا بہت بڑی بات تھی۔ آج کی طرح نہیں۔ وقت بہت بدل گیا۔ اس بکسے کو خریدنے کے لئے پیسہ بھی بابوجی نے دیا تھا پھر ڈانٹ پلائی تھی۔

کل امتحان دینا ہے کہ نہیں رے ۔۔۔ بکسا لے آ۔۔۔ ضرورت کے سب سامان رکھ لے۔

اور سفر بھی کیسا ۔۔۔ آرہ سے پٹنہ۔

یعنی دو گھنٹے بھی نہیں لگتے۔

پُرانی یادوں کے اس اچانک کے اسپرش سے وہ بکسے کی گرد انگلیوں سے صاف کرنے لگتا ہے۔ وہیں پڑے گندے میلے کپڑے سے ۔۔۔ پُوری لگن سے اپنے کام میں جُٹا ہوا۔

کتاب سے نظر اُٹھا کر چپ چپ اس منظر میں پُورا پُورا گم ہونے کی خواہش ہوتی ہے میری۔ زمین پر بچھی ہوئی چادر ۔۔۔ کل تک اس چادر کے سامنے ہی دوسری طرف دنیئے بہاری کی چادر بچھی رہتی تھی۔ کنارے کچھ کتاب، میگزینس، پانی کا مگ، پائیتانے ایک صراحی، پلاسٹک کی بالٹی، دیوار پر ٹنگی ہوئی رویندر ناتھ ٹیگور کی اور غالب کی تصویریں۔ انھیں کے پاس پریم چند کے گئودان کا پہلا صفحہ بھی بھی جو کہیں سے

اُٹھالایا تھا وہ، کسی دوست کے پاس سے۔ اور بندھے ہوئے سامان، بندھی ہوئی گٹھری ۔۔۔ اور کمرے میں پھیلی اُمس، خاموشی ۔۔۔ سب ہی اس بات کا اشارہ دے رہے ہیں کہ اس کمرے کے ساتھ کوئی غیر معمولی حادثہ ہونے کو ہے ۔۔۔۔ کتابوں میں نظریں جھکائے ہوئے بھی، کتابوں میں اُگے لفظ ذہن میں ہلچل نہیں مچاتے۔ بلکہ یہاں تو پُوری پُوری ونئے کو دیکھنے کی کاروائی ہے، جو پُرانی یادوں سے پَل پَل جُڑتا ہوا معمّہ پہیلی جیسا ہی دِکھ رہا ہے۔ اب وہ بکسے کے دوسرے سرے پر بندھی ہوئی رسّی کی گانٹھ کو دیکھ رہا ہے جیسے سفر کے دَوران اُنھیں اُٹھا پائے گا یا نہیں؟ ایک دو بار رسّی کی گہرائی کا اندازہ کرتے ہوئے ۔۔۔ چمڑے کے بکسے کو ہلا ڈلا کر دیکھ چکا ہے وہ۔ اب مطمئن ہے ۔۔۔ ہاں اُٹھا سکتا ہے۔ بس اسٹیشن کی سیڑھیاں ہی تو پھلانگنی ہیں ۔۔۔ ہو جائے گا ۔۔۔ اب ایک بار پھر وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ ساتھی ۔۔۔

پھر ویسی ہی دھیمی آواز۔ ایک پَل کو لگا، کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ونئے بھاری کتابوں میں مُنہ دیئے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔

اخلاقی طور پر بھی ۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نظر اس کی آواز کی سمت اُٹھائی ۔۔۔ کچھ اُداس سا لگا وہ، یا ٹُوٹا ہوا سا ۔۔

ساتھی ۔۔۔ اب ہنسا ہے وہ۔ کچھ بولنے سے پہلے یہ اُس کا ہمیشہ سے ایک خاص انداز رہا تھا۔ پہلے جی کھول کر ہنس لینا۔ پھر اپنی بات کہنا۔ چہرہ پھر سنجیدگی کی آڑی ترچھی لکیروں میں بٹ گیا ہے۔ جیسے وہ اب شبد جوڑ رہا ہے ۔۔۔ اپنے منشا پر آنا چاہتا ہے ۔۔۔ اور اس کے لئے جیسے اُس کے اندر کے آدمی کو بہت ہمت کرنی پڑ رہی ہو ۔۔۔

• میرے اندر بھی ایک طرح کا ناسٹیلجیا ہے ساتھی۔ گاؤں واپس لوٹ رہا ہوں تو یہاں مہانگری اور تم سب کی یادیں۔ رُلیا (رُلا) دُنیا چاہتی ہیں مجھے، مگر میں بھی کم اکڑ فوں نہیں ہُوں۔ ایسے جذبات کو تو میں خاطر میں بھی نہیں لاتا ساتھی۔ ادے اپنے آنسو ہیں ۔۔۔ ان پر اپنا بھی حق نہیں، جب چاہا بہہ گئے ۔۔۔ کیوں ساتھی ۔۔۔ وہ

پھر ہنس رہا ہے ... پر ایک بات ہے ساتھی .... لوٹنے کا دُکھ نہیں ہے مجھے۔ کوئی دُکھ نہیں ہے۔ آخر گاؤں کی سوندھی مٹی ہی تو بلا رہی ہے ... پر یہاں جو چھوڑے جا رہا ہوں اس کا دُکھ ہے مجھے، جو ساتھ لئے جا رہا ہوں .... اس کا دُکھ ہے مجھے ..

وہ پھر ہنسا اور مضبوطی سے باندھے گئے چمڑے کے بکسے پر بیٹھ گیا۔ چھوٹے سے گاؤں میں دیکھے گئے جن سپنوں کے ساتھ یہاں آیا تھا، وہ سب ایسے ہی یہاں کی مٹی میں ویسے کا ویسا چھوڑے گاؤں لوٹ رہا ہوں ... سوچتا ہوں کتنے دن گزرے یہاں ..

"چھ سال کچھ مہینے" تب چلا تھا گاؤں سے ... گاؤں جانے کے بعد سوچوں گا۔ یہ چھ سال کچھ مہینے میری زندگی میں کبھی آئے ہی نہیں ... کیوں ساتھی ... اب کچھ برا نہیں تو پریشان کیا ہونا ... ماتھا کیا کھانا ... "لوٹ کے بدھو گھر کو آئے" والی کہاوت میں نہیں مانتا ساتھی۔ آخر کو اپنا گاؤں ہے .... بابو جی ہیں .... ماں ہے .... کھیتی کروں گا .... کچھ بھی .... کہہ کر پھر جیسے اُس نے مضبوطی اوڑھنی چاہی تھی .... اس بار لفظ کو کھینچ کر پوچھا تھا اس نے ... کیوں ساتھی .... ہے نا۔ آخر ہم قلم چلانے والے چھینی اور کدال کیوں نہیں اُٹھا سکتے۔ ٹوکریوں میں مٹی کیوں نہیں ڈھو سکتے۔ کہیں کوئی سمجھوتہ ہے کیا کہ جو قلم اُٹھائے گا وہ ہل نہیں چلائے گا۔ ہمارے یہاں یہی سب کمی ہے ساتھی۔ اس لئے پڑھ لکھ کر بھی ہم اَن پڑھ کے اَن پڑھ رہ جاتے ہیں اور اس لئے ....

اب وہ چمڑے کے بکسے سے پیر جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور اسی لیے کبھی یہاں اچھی تبدیلی کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے کہ ہم سب نے آپ کو ایک محدود دائرے میں قید کر لیا ہے۔ ہم نے چاند سے روٹی تک کی جو منزل طے کی ہے وہاں بنے بنائے راستے ہی جاتے ہیں۔ نئے راستوں کی دھار نہیں جاتی۔ غلطی یہی ہوتی ہے ساتھی ..

ذرا ٹھہر کر پوچھتا .... "نیند آ رہی ہے کیا ساتھی ؟"

"نہیں"

"مجھے لگتا ہے شاید کچھ دنوں تک میری غیر حاضری کا احساس رہے گا تمہیں بھی ...

چھیلے گا بھی تمہیں ۔۔۔ لیکن بس کچھ دنوں تک ۔ وہ میری طرف مُڑا ہے ۔ شاید منڈی ہاؤس میں بھی کچھ سمئے تک چرچے کا موضوع بنا رہوں ۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ روز مرّہ کی مشینی کارروائی سب کچھ بُھلا دے گی ۔ مجھے بھی ۔ میرے ساتھ کو بھی ۔ کیوں ساتھی تم بھی بھول جاؤ گے نا ؟"

پتہ نہیں وہ ہنس رہا ہے یا جانے کے پاگل کر دینے والے احساس کی چبھن سے سُلگ رہا ہے ۔ صرف اس کی طرف دیکھے جا رہا ہوں ۔ ہاں اس سوال میں، مہانگری میں جھیلے گئے چھ سال کچھ مہینوں کی پُوری پُوری چبھن قید ہے ۔۔۔ اس لئے کہ اتنے برسوں میں ونئے کے سب سے زیادہ قریب میں رہا ہوں ۔ اس لئے اسے دوسروں سے زیادہ جاننے کا بھی مجھے ہی ہوتا ہے ۔۔۔ شاید ایسا ہے ۔۔۔۔ اس کے جانے کا دُکھ مجھے بھی ہے ۔۔۔ جو آج رات سے ہی عجیب طرح سے اندر گھمڑ رہا ہے جو اچانک سناٹے کی طرح وجود کے ریشے ریشے میں اُتر کر اس اکلوتے کمرے کی بھیانک سناٹگی دِکھا کر پوچھتا ہے کہ کل یہاں ونئے نہیں ہوگا، کیا ؟ نہیں ہوگا کا مطلب تو بہت گہرا ہے ۔۔۔ تب کیا ہوگا ؟ تب کتنا فرق پڑے گا روز مرّہ کے معمول میں ۔ تب کتنا بٹو گے تم زندگی کے اصولوں میں، قاعدے میں، قانونوں میں ؟ ونئے کے نہیں ہونے کا مطلب تو بہت گہرا ہے اور اس گہرائی نے اندر تک سناٹے کا جال بُن دیا ہے ۔۔۔" ساتھی تم بھی بھول جاؤ گے نا ۔۔۔"

لگتا ہے اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی معصومیت اُتر آئی ہے ۔ یہاں کے کولاہل شور مشینی ہونے کے دُکھ، وجود میں گُھلتی ملتی کڑواہٹ، پہچان کی تلخی اور چھ سال کے بنتے، ٹوٹنے اور فرسٹریشن سے چُرائی مسکراہٹ کے لگاتار اُدھار لینے والے لمبے سلسلے کے بعد ایک دم سے آج پُرانی کھوئی مسکراہٹ جیسے اُسے واپس مل گئی ہے ۔۔۔

آہستہ سے بولا ہے وہ " ساتھی تم بھول جاؤ گے تو دُکھ ہوگا مجھے "

اچانک جیسے کوئی تیز چیختی، ہوئی شتابدی ایکسپریس پلیٹ فارم سے گزر گئی ہو ۔ اتنا کہہ کر وہ باہر نکلی ہوئی چادر کو جھاڑنے میں لگ گیا ۔ اب وہ بے من سے کچھ گنگناتا ہوا چادر بچھا رہا ہے ۔ ایکسپریس میرے اندر اب تک گھڑگھڑا رہی ہے ۔۔۔ چیخ رہی ہے

... تب ویسے ہی چھ سال کچھ مہینے پہلے منڈی ہاؤس میں ونتے سے میرے دوست اوشن نے ملاقات کرائی تھی۔

"یہ ونتے ہے ... ونتے بہاری ... تمہارے بہار سے آیا ہے۔"

میں تپاک سے ملا تو وشن اچانک مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ "سالے تیرے اندر صوبائیت بہت زیادہ ہے ... بہاری ہے نا۔ اب پوچھے گا کہاں سے آیا ہے۔ کہاں کا رہنے والا ہے۔ دراصل تجھے آدمی کے ہونے سے مطلب نہیں، اپنے وطن، اپنے علاقے کا ہونے سے زیادہ مطلب ہے۔ ہے نا؟"

"ایسا نہیں ہے پیارے۔" میں ٹھٹھا مار کر ہنسا — دراصل یہاں رہ کر اپنے شہر کی مٹی کی بُو باس بھی بھول جاتے ہیں ہم۔ کوئی اپنے وطن سے آیا ہے، تو لگتا ہے اُس نے وہ گلیاں، وہ رستے دیکھے ہوں گے جہاں شناسا سا نظریں بستی ہیں۔ ایک ایک چہرہ اپنا لگتا ہے۔ بوڑھی جھریوں والا، شفقت دیتا ہوا ... بس ایسا ہے ... تو اسے ناسٹیلجیا کہہ لے۔

اس وقت میں خود بڑی تکلیف میں تھا۔ اور جمنا پار میں کسی طرح تین سو روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا کمرہ مل سکا تھا جو کمرہ کم گیرج زیادہ تھا۔ ہوا کا گزر ہی نہیں — کوئی کھڑکی نہیں۔ پاس میں سامان ہی کتنے تھے۔ چند پہننے کے کپڑے، ایک اسٹوو، تھوڑے سے برتن، پلاسٹک کی بالٹی، نہانے کا مگ، دو ایک پلیٹ، چائے کی قلفیاں ...

وشن نے ہی بتایا کہ ونتے ایک ہفتہ پہلے ہی دلی آیا ہے۔ کچھ کرنا چاہتا ہے۔ ابھی نئی دلی ریلوے اسٹیشن ہی اس کا گھر ہے۔ رات وہیں بسر کرتا ہے اور ونتے کے لفظوں میں ...

"خوش ہوں یار۔ کچھ تو کر رہا ہوں۔ وہاں کیا تھا۔ ایک چائے کی دکان سے دوسری چائے کی دکان تک ٹہلتے ہوئے۔ درشن فلسفے کا "بگھارا بھات" کھاتے کھاتے اُلجھن سی ہو گئی تھی۔ بس دلی چلا آیا۔ ابھی کام ملا نہیں۔ مل جائے گا۔ قلم کی نوکری نہیں ملے گی تو رکشا چلا لوں گا۔ بوجھ ڈھولوں گا"... کہہ کر زور سے ہنسا تھا۔

رات ہی تو کاٹنی ہوتی ہے۔ جب کوئی نہیں ہوتا۔ یار دوست اپنے اپنے گھونسلوں میں چلے جاتے ہیں اور دلّی کی سڑکیں سونی ہو جاتی ہیں۔ تب مَیں بھی پلیٹ فارم پر صبح میں خریدا ہوا "نو بھارت ٹائمس" بچھا دیتا ہوں۔ ریڈی میڈ بستر۔

اس نے قہقہہ لگایا تھا۔ ٹائمز آف انڈیا والے بھی اپنے اخبار کے اس شاندار استعمال سے ناواقف ہوں گے ساتھی، جو مَیں کرتا ہوں ... پڑھنے کا پڑھنا اور رات میں بستر کا بستر۔

"تو تو اکیلا ہے نا؟" وشن نے پوچھا تھا۔

"میرے ساتھ چلے گا ـــــ سچ کہوں تو وشنے مجھے پسند آیا تھا۔ پہلی بار میں ہی۔

لاگ لپیٹ بناوٹ سے الگ کا۔ اس لئے مجھے اپنے ساتھ رکھنے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ہاں! میرے جواب پر بہت پیار سے مسکرایا تھا وہ۔

"ساتھی، اخبار کی بستر سے تیرے کمرے تک لگتا ہے سفر کا ایک پڑاؤ تو ختم ہو گیا۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔"

اس روز رات وہ میرے ساتھ ہی کمرے پر آیا۔ بہت خوش تھا کمرہ دیکھ کر۔ کندھے پر پڑا ہوا اپنا جھولا اُتار کر کنارے رکھتے ہوئے بھی اس کی خوشی اس کے پور پور سے پھوٹ رہی تھی۔

"اب تو یہ زمین اپنی ہے۔ چادر لانی ہوگی۔ میرے پاس تو کُل یہی سامان ہے، جو پیسہ لے کر چلا تھا وہ اب ختم ہونے والا ہے۔ لیکن اب سب ہو جائے گا۔"

اس رات وہ گھوڑے بیچ کر سویا۔ صبح جب اُٹھا تو مَیں کام پر جانے کو تیار تھا۔ نہا دھو کر کپڑے پہن کر تیار ....

"کیوں ساتھی۔ چل دیئے کیا؟" وہ مُسکرایا۔

"تمھارے لئے رات میں پھُلایا ہوا چنا رکھ دیا ہے، کھا لینا۔ چنے کا پانی بھی ایک گلاس میں ہے پی لینا۔ آج سے کچھ اور بندوبست کروں گا۔"

کمرے کی کنجی اور کچھ ضروری مشورے دے کر میں آفس چلا آیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ہندی سا پتاہک سماچار پتر تھا۔ بارہ سَو روپے ماہوار ملتے تھے مجھے۔ آفس آنے کے بعد ونئے کے لئے دیر تک اِدھر اُدھر فون کھٹکھٹا تا رہا کہ شاید کہیں چانس مِل جائے۔ کہیں جگہ خالی ہو۔ ایک جگہ بات بن بھی گئی۔ پروف پڑھنے کے لئے آدمی کی ضرورت تھی۔ مَیں نے کہا چلو ٹھیک ہے۔ شروع میں تو بس کام چاہیئے۔ یہ کرے گا تو آگے بھی ملے گا۔ کم سے کم قلی گری کرنے سے تو بچ جائے گا۔

اس خبر نے اُسے بھی کافی خوش کر دیا۔ احسان نگاہوں سے دیکھنے کے بعد کہنے لگا۔

"ساتھی سچ پوچھو تو تم اس راستے کو آسان کرتے جا رہے ہو۔ اب تو طے کر لیا تھا کہ آج اگر کام نہیں ملا تو کل سے بوجھ ڈھونا شروع کر دُوں گا۔ اس لئے کہ جب تک یہاں اپنے لئے ایک صحیح زمین کی تلاش نہ کر لُوں، کیسے رہ سکتا ہُوں۔"

اس رات وہ بہت خوش تھا۔ دیر تک اپنی اِدھر اُدھر کی باتیں سُناتا رہا۔ زندگی کی ان سچّائیوں کی باتیں جو تھوڑا بہت سب کے ساتھ رہتی ہیں۔ تھوڑے بہت ہیر پھیر کے ساتھ سب کے ساتھ گھٹتی ہیں۔ وہی سب سے بڑا لڑکا ہونے کا دُکھ، قلم کی پتوار سنبھالنے کا دکھ۔ بابو جی بار بار پوچھتے تھے "اِی سب کا کرتے ہو۔۔۔ قلم گھسنے سے آج کے زمانے میں کا ہوئے والا ہے، کچھ نہیں۔"

"پھر ــــ؟"

"بابو جی کو بہن کی شادی بھی تو کرنی تھی اور مَیں ۔۔۔"

ونئے کی آنکھوں میں کہیں ہلچل مچی تھی۔ "اب تو شاید شادی ہو بھی گئی ہو۔ مَیں کرتا کیا؟ وہاں رہتا تو یَل یَل بابو جی کا ہاتھ نہ بٹا پانے کا احساس مجھے کتنا زندہ رہنے دیتا۔۔۔"

"تمھارے کھیت بدھار بھی تو ہوں گے۔"

"ہیں تھوڑے بہت۔ چاچا کا پریوار تو آج تک کھیتی پر ہی زندہ ہے۔ بابو جی

بھی کھیلیہر آدمی ہیں۔ صرف میں ہی نہیں پتہ نہیں، کم عمری میں نہ جانے کہاں سے گہرے گہرے لفظوں کو پڑھنے کی عادت پڑ گئی۔ تب سے ۔۔۔"

پروف ریڈر ہوجانے کے دو ایک روز بعد اُس نے ایک چھوٹی سی کویتا لکھی مجھے دکھائی تھی۔

"دیکھ کیسی ہے ؟"

مَیں نے بے مَن سے مُڑا تڑا وہ کاغذ ہاتھ میں لے لیا۔ لکھا تھا:

"مَیں جہاں ہُوں
جہاں لیٹا ہُوں
وہاں سے سپنوں کی چھت نہیں جھانکتی
کاغذی بستروں کی ہر رات ایسی ہی ہوتی ہے
پریشانی۔ اُلجھنوں کی ہر صبح ایسی ہی ہوتی ہے
اور دُکھ کا چہرہ بھی سدا سے ایسا ہی رہا ہے

تو رات آنسوؤں میں کیوں گزاروں ؟
دن سے دوزخ کا احساس کیوں پالوں ؟
اور دُکھ کاغذ پر کیوں اُتاروں ؟
تو کیا اپنے اپاہج ہونے کے بے جان سے ناٹک کو سماپت کرنے کے لئے
سپنوں کی ایک چھت نہیں بنانی چاہیئے مجھے
ابھی اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے کہ چھت کیسے بنے گی ؟
لیکن بنے گی چھت اور ضرور بنے گی ایک دن"

ایک دو بار کویتا کو اُلٹ پھیر نظروں سے دیکھنے کے بعد مَیں نے پوچھا۔

"کیوں، یہاں خوش نہیں ہو کیا؟"

"یہ تو صرف ایک کویتا ہے ساتھی"
"لیکن یہ تو سیدھے سیدھے تمھارا اپ کا احساب لگ رہا ہے"
"پتہ نہیں۔ مجھے اتنا زیادہ کچھ نہیں لگا جتنا لکھا ہے" اچانک وہ تیز آواز میں بولا "ساتھی سچ بتانا لکھتے سمئے ہم کچھ زیادہ ایکسر سائز تو نہیں کر لیتے شبدوں کی؟"

وہ ہنس رہا تھا۔۔۔ "شاید رہا ہو یہ احساس میرے بھیتر۔ لیکن اتنا طے ہے کہ یہ احساس بہت بھیتر کا ہے۔ ابھی کم از کم اتنی گھٹن اتنی تکلیف نہیں ہے مجھے"

مجھے چڑچڑاہٹ سی ہوئی۔ کھیج کر بولا "تم کویوں (شاعروں) سے یہی الجھن ہوتی ہے مجھے۔ چھوٹے شبدوں سے پوری دنیا بدلنے کی بات کیسے سوچ لیتے ہو۔ اس لئے تمھارے شبد صرف شبد رہتے ہیں۔ آگ اور بارود نہیں بنتے"

"ہاں ساتھی۔ بارود بننے کے لئے بھی تو ہمارے بھیتر ایک آگ چاہئیے اور ابھی بھیتر کی آگ صرف لکھنے تک ہے"

اتنا کہہ کر وہ پتہ نہیں کس سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر میں اس کے تیز تیز خرّاٹے پورے کمرے میں گونج رہے تھے۔ آج جلدی سو گیا تھا۔

یہاں برابر بجھی چادر سے اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا ہے ۔۔۔ کچھ تناؤ ہیں ہے ۔۔۔ چنتا ہیں ہے ۔۔۔ مگر ایک خاص بات ہے کہ وہ نئے فکر کبھی سنجو کر اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اتنا بولتا ہے کہ کبھی کبھی اوب سی ہونے لگتی ہے مجھے ۔۔۔ سالے ۔۔۔ سو ۔۔۔ سو ۔۔۔ جا ۔۔۔ مجھے بھی لکھنے پڑھنے دے ۔۔۔

اس رات وہ دس بجے تک نہیں آیا۔ قاعدے سے دس بجے تک آجانا چاہئیے تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ منڈی ہاؤس میں اس کے چکر کچھ زیادہ ہی بڑھتے جا رہے ہیں۔ میں اسے اکثر کہا کرتا کہ تو جسے کمٹ منٹ کہہ کر اس پوری بھیڑ چال سے جُڑنا چاہتا ہے، دراصل وہ صرف ایک شو گیم ہے، کمٹ منٹ نہیں میری

اس بات کا سوائے گمنی خاموشی کے اور چادر تاننے تک، اس کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ ہاں کبھی کبھی وہ شہد کی پوری مٹھاس اپنے شبدوں میں بھر کر کہتا ... نہیں ساتھی۔ دراصل ایسا بالکل نہیں ہے۔ ہر چیز میں غلط دیکھنے کی عادت کا جب تک انت نہیں ہو جاتا، تھوڑی بہت دُھند تو باقی رہے گی ہی، جو پورے منظر کو پوری طرح صاف نہیں ہونے دے گی ساتھی ... وہ ٹھہرا تھا، بولا۔ ساتھی ہم صرف اندھیرا ہی کیوں دیکھتے ہیں۔ سپاٹ اندھیرا۔ ساتھی ... سو گئے کیا ...؟ رات کے اندھیرے میں اس کے شبد دیر تک بجتے رہے۔ اس رات وہ کافی دیر سے آیا تھا۔ میں نے دروازہ اڑ کا کر چھوڑ دیا تھا۔ کیا پتہ کب نیند لگ جائے۔ پھر اسے دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا۔ رات میں نیند توڑ کر اُٹھنا بُرا لگتا ہے۔ صبح صبح اُٹھ کر جانا بھی تو پڑتا ہے۔ کندھے میں پڑے جھوے میں پوری تھکن بند کر کے۔ ایک بجے کے لگ بھگ محسوس ہوا۔ دروازہ ہلکے سے چرمرایا ہو۔ بہت دھیرے سے کسی نے اُسے ٹھیلا ہو۔ پھر کُنڈی لگانے کی آواز بھی آئی۔ چادر سے تھوڑا منہ نکالے سو جانے کی اداکاری کرتے ہوئے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ آکر دروازے پر ٹھہر گیا ہے۔ پیروں سے چپل الگ کر رہا ہے۔ چہرے سے ہوائیاں اُڑ رہی ہیں ... پلٹ کر وہ پاس کے باتھ روم نل پر چلا گیا۔ منہ ہاتھ پر پانی مار کر اب وہ لوٹا ہے ... موڑی ہوئی چادر نکال کر بچھائی ہے ... اب وہ غور سے میرا چہرہ پڑھ رہا ہے کہ میں سچ مچ میں سو رہا ہوں یا ...

"ساتھی ...!" وہ بہت دھیمے سے بولا ہے ...

اور میں نے ایک دم دونوں آنکھیں کھول دیں۔ ناراض بھی تھا اُس پر ...

"دو دن میں پر لگ گئے تمہارے۔ اتنی دیر کہاں کر دی ...؟"

"ساتھی چائے بناؤں ... پیو گے؟" وہ جیسے اپنے آپ کو سمیٹ پانے کی کوشش میں لگا تھا۔

"کوئی واقعہ ہو گیا کیا؟" اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ کر میں چادر سمیٹ کر بیٹھ گیا۔

"کہاں گئے تھے آج ..."

بتاتا ہوں ساتھی"

اتنا کہہ کر وہ اسٹوو میں پمپ مارنے لگا۔ اسٹوو کا تیل نکالنے، ماچس جلانے، پن مارنے اور بکھرے ہوئے شعلوں کے چیخنے تک میں اُس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ پڑھ چکا تھا۔ لگا تھا، ایک آگ اس کے چہرے پر بھی سُلگ رہی ہے ... انجانی سی آگ ... جو اپنے ہی پریویشں (ماحول) سے اٹھی ہے ... جو اُسے جُلا بھی رہی ہے ... توڑ بھی رہی ہے۔ حساب سے چائے کے کپ میں دو بار پانی لے کر چائے دانی میں ڈالنے، اسٹوو پر چڑھانے تک وہ معمول میں لَوٹنے کی کارروائی کر چکا تھا۔ میرے کچھ پوچھنے تک اپنی جیب سے مُڑا تُڑا کاغذ نکالا اور بولا "لو اسے پڑھ ڈالو۔ پُرانی عادت ہے میری، جو باتیں کچوٹتی ہیں وہ اسی طرح ان بے معنی پُرزوں پر لکھ ڈالتا ہوں۔ اور دو ایک دن انھیں ڈسٹ بن میں ..."

ایک عجیب سی اُداسی میں ڈوب گیا تھا وِنئے۔

میں پڑھنے لگا ... لکھا تھا:

"خالی پیٹ تمھارے ساتھ شامل نہ ہونے کا دُکھ ہے مجھے
اس لئے بھانپ سکتا ہوں تمھاری بھوک
دیکھ سکتا ہوں تمھارے پیٹ کی سوکھی انتڑیوں میں لگی ہوئی آگ
اور اِسی لئے جُڑتا ہوں پڑھے لکھوں کے مجمع سے
تمھاری انتڑیوں میں سُٹی بھوک کے مسئلے کے حل کے لئے
وہ سب تمھارے بارے میں سوچتے ہیں
ہاں، سب تمھارے بارے میں سوچتے ہیں
اس لئے کہ اُنھوں نے پڑھ رکھا ہے مارکس اور لینن کو
اُنھیں شوق ہے مزدوروں کے جلوس میں شامل ہونے کا
میں بھی شامل ہوتا ہوں پڑھے لکھوں کے اس جلوس میں

ممکن ہے یہ بھی ایک کارروائی ہو۔ زندگی کو جاننے اور سمجھنے کی یہ

غور سے پڑھی میں نے وہ کویتا۔ دو ایک بار پڑھتے ہوئے چہرہ بھی دیکھا دنئے کا۔ پھر اس مڑے تڑے کاغذ پر آنکھیں لرز یں ... پڑھ چکا تو انجانے میں ہی یہ سوال میرے منہ سے نکل گیا۔

"کہاں گئے تھے آج؟"

"فرید آباد"

"کیوں؟"

"بہار کے سیلاب زدگان کے لئے فنڈ جمع کرنے تھے"

"اور ...؟"

"نکڑ ناٹک کرنے تھے"

"کون کون گیا تھا؟"

"نشاط قیصر کے ساتھ ایکٹا تھیٹر کے کچھ لوگ"

"کوئی خاص بات؟"

"ہاں ایک چھوٹی سی مڈبھیڑ ہوگئی پولیس سے"

اس نے ٹھنڈی سانس بھری "ساتھی کہہ سکتے ہو، پڑھے لکھوں کے اس مجمع کا ایک جوکر میں بھی تھا جو ان کے ساتھ ان کے پیٹ کی بھوک کا حل ڈھونڈنے گیا تھا ساتھی۔ سچ بتانا، کیا یہ غلط ہے ... جب اندر ایک آگ کوندتی ہے کہ روز روز کے فساد اور دنگوں میں اپنا خون جل رہا ہے۔ اپنے مارے جا رہے ہیں۔ اپنی دھرتی سرخ ہو رہی ہے تو ساتھی، کیسے ان سے خود کو نہ جوڑنے کی بات اٹھے کہ یہی مقصد تو کھیتوں کھلیانوں سے ان چوڑی چوڑی مہانگری کی سڑکوں تک لے آیا ہے۔ ... ساتھی مانو یا نہ مانو۔ کچھ کام ہو رہا ہے۔ اخبار کے سرخ حاشیے پر پہلی خبر جب آنکھوں سے گزر کر نکڑ ناٹکوں کا لباس اوڑھ کر فنڈ جمع کرتی ہے تو لگتا ہے ... ایک

کارروائی یہ بھی ہے ... دُکھ کے ماروں سے خود کو جوڑنے کی ... سب کے لئے زندگی کی ایک سمت کو محسوس کرنے کی .. "

اس سے پہلے کہ وہ آگے بولتا، میں نے بیچ میں بات کاٹ دی۔ "کہیں کچھ کنفیوزڈ ہو تم۔ تھوڑا نہیں بہت۔ جن سے جُڑ رہے ہو یا جُڑنے کی کوشش کر رہے ہو اس پُورے گروپ کو پڑھے لکھوں کا مجمع کہہ کر کیا بتانا چاہتے ہو تم؟"

"اس لئے ساتھی کہ سوکھا اور باڑھ پیڑتوں کے لئے فنڈ جمع کرنے تک مسئلہ وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ تب لگتا ہے، ذہنوں میں ہی اُگتی ہے کہیں گمبھیر گمبھیر لفظوں کی کھیتی اور خود کو اینٹلکچوئل بنانے کی مہم تک سب ایک جھوٹی اور ڈھوتی ہوئی کارروائی میں شامل رہتے ہیں۔"

تب لگا تھا، ایک راستہ بنا رہا ہے وہ یا ایک سیدھے راستے پر چلنے کی کوشش ہے اس کی۔ مگر یہ راستہ ابھی پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ اس لئے جب اپنی بات کرتا ہے تو اگر مگر میں اُسے ڈفنیڈ کرنے کی کوشش یا کارروائی بھی چلتی رہتی ہے اس کے اندر۔ لیکن اتنا طے ہے کہ اپنی سطح پر اُسے بہت ایماندار پایا تھا اور اسی لئے لگا تھا کہ یہاں کا گلیمر ورلڈ اس کے اندر کے آدمی کا استحصال تو نہیں کر رہا ہے۔ اس کے بھولے پن کے ساتھ۔ شبدوں میں غریبی کا چہرہ دکھاتے اور پڑھاتے ہوئے اس کا پُورا کیریر داؤ پر تو نہیں لگایا جا رہا۔ اس لئے کہ ان تحریکوں سے جُڑے جن زیادہ تر لوگوں کو میں جانتا تھا وہ بڑے بڑے عہدوں پر تھے، اس لئے کسی بھی لڑائی لڑنے کی بات آسانی سے کر سکتے تھے اور وہ دوسرے جو اپنے بھولے پن اور کمٹمنٹ کے سہارے خالی جیبوں کے ساتھ ان تحریکوں سے جُڑے تھے۔ اُن کے بھوک سے سلگتے چہرے بھی دیکھے تھے میں نے اور ایک نہیں کئی کئی بار ــــ اس لئے ونئے کے اس طرف بڑھتے رجحان سے مجھے تھوڑی چوٹ پہنچی تھی۔

چائے پینے، کپ پائیتانے رکھنے اور چادر پر لیٹنے تک ونئے پھر باتیں کرنے کے موڈ میں آ گیا تھا۔ بولا۔

"ساتھی اب سوچ لیا ہے۔ اچھا برا جیسا بھی سہی پر جوڑوں گا خود کو اس تحریک سے اور ایسے لوگوں کے ساتھ ـــــ ساتھی، ایسا کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں میری آتما کی تسلی ہو جاتی ہے۔ کیا یہ کم ہے ؟"

بہت دنوں سے چپ رہنے کی کارروائی کا میں نے بھی انت کر دیا۔ جھلا کر بولا۔

"ہاں یہ بہت کم ہے ۔ ۔ ۔ اس لئے کہ کچھ کرنے کے بدلے تم لوگ "واد" کے چکر میں زیادہ رہتے ہو۔ چین اور رُوس کے اتہاس کا مطالعہ کرتے ہوئے تم خود اپنے وچار دھاراؤں کے جغرافیہ کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ غریبوں کی لڑائی سے الگ تم الگ الگ مورچوں اور الگ الگ "واد" کے چکر میں زیادہ پڑتے ہو۔ جس نظریے کی وکالت کرتے ہو، وہ بھی میرے نزدیک ایک طرح کی بندش ہے۔ نہیں تو چین جیسے ملک میں چھاتر کرانتی کا مطلب کیوں نہ جمہوریت کی عوامی مانگ سمجھی جائے ؟ کیا روس میں بھڑکے ہنگامے کمیونسٹ ورلڈ کے لئے چنوتی جیسے نہیں ہیں ؟ تمہارا مارکس وادی نظریہ یا اس نظریے پر کی جانے والی حکومت سے تمھیں کیا کسی سطح پر راجیہ شاہی کی بو محسوس نہیں ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے نظریے کے بچاؤ کے لئے تم بھی لاکھوں کی فوج پر گولیاں چلا سکتے ہو ۔ یہ پیریسترویکا اور گلاسنوست کیا ہے ؟ لیبرٹی اور پوزیشن کے اس مانگ کے اشارے کیا ہیں ؟ کمیونسٹ ورلڈ میں اچانک پھوٹ پڑنے والا یہ عوامی بدلاؤ کیا کہہ رہا ہے ؟

"ساتھی، اس کا مطلب ہے ایک نظریہ پر جماؤ" ونئے دھیرے سے بولا۔

"غلط" میں نے پھر کہا "نظریے کو تحریک اور تحریک کو مذہب سے جوڑتے ہوئے تم بھی اپنے مذہبی خیالات کا مرکزی نقطہ دھرم کے انھیں آدرشوں کو بنا رہے ہو۔ یہ پورا نظریہ جس کی نفی کرتا ہے"

ذرا ٹھہر کر میں نے پھر پوچھا۔

"تم نے مارکس پڑھا ہے ؟"

"نہیں"

"لینن ؟"

"نہیں"

"مارکس وادی وچار دھارا پر کوئی کتاب؟"

"نہیں"

"کوئی بات نہیں غلطی دراصل تمہاری نہیں ہے۔ غلطی تمہاری بھاوکتا (جذباتیت) کی ہے، جسے یہاں کے ماحول میں کیش کیا جاتا ہے۔ تمہارے جیسے بہت سارے اس طرح کے ساتھیوں نے بھی مارکس اور لینن کی وچار دھارائیں نہیں پڑھیں۔ اس لئے سوچنا پڑتا ہے کہ برابری کی یہ کتاب تم کس کارخانے میں چھپواتے ہو۔ ظاہر ہوا جہاں بھاوکتا بیٹھی ہے، سنجیدہ لفظوں سے نکلے احساس کو جگہ دینے کے لئے۔ ہے نا..؟

"ساتھی" ونئے اچانک پلٹا تھا۔ "ابھی تم جو کہہ لو۔ جتنا کہہ لو... کچھ بھی نہیں بولوں گا میں۔ لیکن اتنا طے ہے کہ بھائی کو بھائی ماننے کے لئے کسی دوسرے گواہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جذبات سے میرے رشتے کو تم جیسا بھی کچا سمندھ کہہ لو۔ لیکن یہ رشتہ "آہ" سن کر آج بھی جگا ہے اور کل بھی جگے گا۔ برابری کتابوں میں بھلے نہ اگتی ہو، نہ پڑھی ہو پر بغیر کتاب پڑھے بھی آگ میں جھلس رہے شخص کو بچانے کی کارروائی ہو سکتی ہے۔ اسے بچانے کے لئے کتاب میں لکھے ہوئے ہمدردی شبد کو پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میں ایک طنزیہ ہنسی ہنسا۔ "تو جس نظریہ کی بنیاد پر تم اپنی جھونپڑی کھڑی کرنا چاہتے ہو، اس نظریہ کو پورا پورا جاننے سے تمھیں کوئی مطلب نہیں۔"

"ایسا میں نے نہیں کہا۔" ونئے شانت ہوا۔ "پڑھوں گا۔ دیکھوں گا لیکن جب تک نہیں پڑھا ہے تب بھی برابری کا ارتھ جاننے کا جواز تو ہے ہی میرے پاس۔ اور یہی میرے لئے بہت ہے۔"

اس واقعہ کے بعد ونئے میں بہت زیادہ تبدیلی آگئی تھی۔ اب زیادہ تر وہ غائب رہنے لگا تھا۔ ایسا بھی ہوتا جب کئی کئی رات وہ نہیں آتا۔ آنے پر بھی مصروف ہونے کا بہانہ بنا دیتا۔ ایکتا نکڑ منچ کا وہ ایک خاص حصہ بن گیا تھا۔ اکثر دفتر سے بھی غائب

رہتا۔ اس لئے ایک بار اُسے پروف دیکھنے کے کام سے ہٹا دیا گیا تھا۔ میگزین چھپ کر آنے کے بعد بھی کافی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ معافی وافی مانگنے کے بعد اُسے دوبارہ رکھ تو لیا گیا، لیکن وارننگ دے دی گئی کہ دل لگا کر کام نہیں کیا تو کسی سمئے بھی اُسے ہٹایا جا سکتا ہے۔

مَیں نے بھی ڈانٹا تھا۔ "کیوں قبر کھود رہا ہے اپنی۔ زمین پر آ گیا تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ بھوکے پیٹ رہ کر کتنی سمسّیا (مسائل) سُلجھائے گا تو۔ اور بڑی باتیں کرنے کے لئے بھی پیٹ کا بھرا ہونا ضروری ہے۔"

لیکن وہ مانا نہیں کبھی کبھی لگتا ہے جیسے یہ بھی ایک نشہ ہو۔ ونئے کو اس نشے میں مزہ ملنے لگا ہو۔ اس بیچ اس میں بہت سارے پریورتن (تبدیلی) آئے تھے۔ وقت کا پرندہ اُڑتا اُڑتا تین چار سال آگے بڑھ گیا تھا۔ بھولے بھالے کلین شیو رہنے والے ونئے کے چہرے پر جنگل اُگ آیا تھا۔ ایک کالا چشمہ لے لیا تھا۔ پتلا دُبلا، لمبا قد، سانولا گندمی چہرہ، بڑھی ہوئی داڑھی، گھنے بڑھے ہوئے بال، پیروں میں ڈالی گئی کولہاپوری چپل، جینز کی پینٹ، کھادی کا کُرتا، مَیں اُسے چھیڑتا ___ کہتا کہ اس حُلیے کی ذمّہ داری بھی اس کی وہی بیمار و چار دھارا ہے، اس پر وہ ٹھٹھا مار کر ہنستا۔ پھر اتنا کہتا ___ "اچھا لگتا ہے۔ ایزی رہتا ہوں اس ڈریس میں۔ اکثر گھر بیٹھ کر بھی وہ کسی انقلابی گانے کی دُھن بنانے میں مگن ہوتا جسے دوسرے دن اُسے کسی نکڑ سبھا میں گانا ہوتا تھا۔ تب ساری ساری رات اُس کی ریہرسل چلتی رہتی۔ اس بیچ لگا تھا، وہ صرف پُروف ریڈر بن کر رہ جائے گا۔ وہاں سے نکلنے کی اُسے کوئی جلد بازی نہیں ہے۔ کوئی دوسرا ٹھور ٹھکانا نہیں دیکھتا ہے۔ خانہ بدوش نکڑ ٹولیوں کے ساتھ ساتھ گھومتا رہتا ہے یہاں وہاں۔ کبھی کبھی پُورے سنڈے۔ میری بات کا اتنا اثر ہوا کہ اب وہ اپنے ساتھ کچھ موٹی موٹی کتابیں بھی لانے لگا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ کتاب لا کر صرف جمع کر رہا تھا۔ اس لئے کہ انھیں پڑھنے کی ابھی اُسے فرصت نہیں تھی۔

زندگی کی یہ دَوڑ کچھ کچھ ہماری ایک طرح ہی بندھی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے کوئی

جاب سٹفیکشن تھا، لیکن بس ٹھیک ٹھاک گزرنے میں ہم خوش تھے۔ شادی کا خیال مجھے آیا تھا نہ وِنے کو۔ ہاں کبھی کبھار لگتا ایسا کب تک چلے گا۔ کتنے دنوں تک؟ کیسا جینا ہے یہ بھی۔ اسٹیریو ٹائپ بندھی ٹکی مجبوریوں پر جینا، جہاں آگے کے لئے کوئی سوپن (سپنا) نہیں جاگتے، نہیں جاگتی کوئی خواہش، کسی خواہش کی سپنیلی آگ۔۔۔ سب ٹھہرا ہوا، منجمد اور روز کی طرح اُباؤ اور اب اُباؤ پن کے دھوئیں کو تیز کرتے وِنے بھی آگیا تھا۔ کبھی سوچتا، کیا تھوڑے میں خوش رہنے کی تسلّی، کسی مجبُوری بھری پیڑا (درد) کا نام ہے؟ کبھی اس خالی پن کو بدلنے کی خواہش ہوتی تو ذمّہ داریوں کے کتنے ہی سوال مُنہ پھاڑ دیتے۔ اتنے میں نہیں ہوگا۔۔۔ نہیں۔۔۔ پھر جھولے میں رکھے کاغذات میں کالے جادو کی طرح اُگے کالے کالے شبد ہوتے جنھیں لکھتے ہوئے کبھی بہت سوچنے کی تکلیف نہیں کی مَیں نے۔ بس گھسیٹ دینے یا پیلنے تک۔ اس سے آگے نہیں۔ ہاں اس دن وِنے رو پڑا تھا۔ اس روز روز کی مشینی کارروائی سے اوب کر۔

ساتھی گھر یاد آتا ہے۔ یاد آتے ہیں ماں باپ، بہن ۔۔۔ تب یاد آتی ہے میدانوں میں گلّی ڈنڈی کھیلتے، اوکی چِکا بچانے، گلی کوچوں میں گزارے گئے بچپن کی۔ یہ سب کہاں چھوٹ گیا۔ لاکھ چاہوں ساتھی۔ آخری وقت میں بھی اس ناسٹیلجیا کے اس گھیرے سے ہم باہر نہیں نکل سکتے۔

کہیں ایک زبردست آہ مجھے بھی جلا گئی تھی۔ لیکن آتما میں چاقو اُتارنے سے کونسا مسئلہ حل ہوتا ہے ... کیسی دیپاؤلی، دُرگا پُوجا، رام نومی، تہوارات، سب کہاں تھے۔ گھر سے ہوتے ہیں تہواارات کے رشتے ۔۔۔ پریوار سے پھوٹتی ہیں رسم و رواج کی بیڑیاں اور ان کے بنا ــــ صرف ایک اُباؤ تھکن.... مشین بننے تک کی کارروائی اور سمجھوتے کا زنگ لگا لوہے کا دروازہ۔

یہ اس کی مسلسل دَوڑ بھاگ اور آگے ہی آگے رہنے کا نتیجہ تھا کہ روس کو جانے والی ڈیلی گیشن (وفد) میں دوستوں نے اس کا بھی نام ڈال دیا تھا۔ اس دن بڑا خوش تھا وِنے۔ آتے ہی کہنے لگا ـــ ساتھی، روس جارہا ہوں۔ پیریسترو ئیکا اور گلاسنوست سے نکلے شبد

(لفظ) کو یہاں کے ماحول میں اتنی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا، جتنا وہاں کی فضا میں دیکھ کر ناپ سکتا ہوں۔ ساتھی اس موقع کو کیوں مِس کیا جائے۔ ہم وہاں ری پریذینیٹ تو کر سکیں گے اپنے یہاں کے مسائل کو، وام پنتھ (بائیں بازو) سے جڑی سمسیاؤں کو۔۔۔۔

اس دن کافی دیر تک وہ روس کی باتیں کرتا رہا۔ زار کے ظلم وستم کی، بالیشوک کرانتی کی، سائبیریا بھیجے گئے دوستوفسکی باتیں، گورکی کی ماں کی باتیں۔ اس کے لہجے سے جوش اور چنگاری پھوٹ رہی تھی۔ زندگی پھوٹ رہی تھی۔

"لینن چوک بھی دیکھوں گا ساتھی۔ سُنا ہے پشکن اور دوستوفسکی کے گھر کو میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ وہاں پرانے بوڑھوں میں گوگول کے گرم کوٹ کو تلاش کروں گا ساتھی۔ تم نہیں جانتے کتنا اکسائیٹڈ ہوں میں وہاں کے جانے کے خیال سے۔"

میں اتنا ہی کہہ سکا۔ "زیادہ خواب مت پالو۔ نہیں جانتے پاش نے کیا کہا تھا۔۔۔۔ سب سے خطرناک ہوتا ہے ہمارے سپنوں کا مر جانا"

اور اس کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد "پاش" کی ہی کویتا (نظم) اس کے چہرے پر چھلک آئی تھی۔ جب ایک نیا تیور لئے اُبال لے رہا تھا میرے سامنے۔

"ساتھی، اب میں نہیں جا رہا ہوں۔ جا رہے ہیں وہ سب بوڑھے جنہیں کوئی نہ کوئی روگ ہو گیا ہے اور اپنے اپنے روگ کے علاج کے لئے جن کا روس جانا ضروری ہو گیا ہے۔ ہاں ساتھی۔ تم حیرت کرو گے۔ میں ابھی ابھی اُن بوڑھوں سے مل کر آ رہا ہوں جو ڈیلی گیٹ کے طور پر روس جا رہے ہیں۔ ان کی آپس کی باتیں سُنی ہیں میں نے۔ کسی کو گٹھیا کا روگ ہے، کوئی دل کا روگی ہے۔ روس میں سب کی صحت کے ٹھکانے پڑے ہیں۔ بس اتنا ہے ان کا کمٹمنٹ۔ سچ یہاں سویا ہے ساتھی۔ اس گٹر میں۔ یہ وہی لوگ ہیں۔ منچ سے جن کی باتیں گرم لوہے سا گرما جاتی ہیں دلوں کو۔ آگ کے شعلے کی طرح دہلا جاتی ہیں لوگوں کو۔ مگر سچ صرف اتنا ہے ساتھی کہ اس پورے لیکچر اور کمٹمنٹ سے الگ وہ صرف اپنا ——— اور اپنا علاج کرانے روس جا رہے ہیں"

وہ کافی دیر تک بولتا رہا۔ اس بیچ میں جان بوجھ کر چپ بیٹھا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ

وہ کڑواکے دار بارش کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر برس لے۔ ایسا کرتے ہوئے کم سے کم وہ ذہنی طور پر شانت تو ہو جاتا۔ ہاں، یہ احساس مجھے تھا کہ اس کے اندر کی جس معصومیت کو جذباتیت کے نام پر کیش کرنے کی کوشش یہاں کے ماحول نے کی تھی۔ وہ کوشش کہیں زخمی ہوئی تھی، ورنہ آج بے موسم وہ اس طرح ٹوٹ کے برستا نہیں۔ پھر پتا نہیں، کہاں وہ پانچ چھ دنوں تک غائب رہا بنا بتائے۔ دوسرے دن جب میں شام کے وقت گھر لوٹا تو زمین پر بچھی چادر پر ویسا ہی کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پڑا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی لئے میں نے اسے ہاتھوں میں اُٹھا لیا۔ کاغذ دتنے کا ہی تھا۔ گھسیٹ کر چند لائنیں لکھی ہوئی تھیں۔

"کبھی کبھی بہت تھکے ہونے کا احساس ایک فرار چاہتا ہے
کہ وہ سب کچھ نہ ہو جو روزمرہ کے اصول کا ایک حصہ رہا ہو۔
وہی کمرہ، وہی چہرہ، وہی تنہائی
کبھی کبھی بہت تھکے ہونے کا احساس ایک فرار چاہتا ہے
میں جلد آؤں گا ساتھی
پتہ نہیں اس وقت تک میری نوکری رہے گی یا نہیں
تم آفس فون کر کے بیماری کا بہانہ بنا دینا
آگے دیکھا جائے گا۔۔۔"

دوسرے دن میں نے اُس کے آفس فون کر دیا۔ دتنے بیمار ہے تیز فیور۔ ابھی نہیں آسکتا۔ پانچ چھ دنوں کے بعد وہ حاضر تھا۔ گھر آیا تو کمرہ پہلے سے کھلا تھا۔ اندر اس کی اپنی تنہائی کی محفل جمی تھی، یعنی ایک بیئر کی بوتل اور گلاس پڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھل گیا۔ آنکھیں چمک گئیں۔ مجھے غصہ آگیا۔ "کہاں گئے تھے؟"

"تمھارے لئے ایک پیگ بناؤں ساتھی؟"

"رہنے دے۔" میں پھر تاؤ کھا گیا۔ "بہت بھاؤک (جذباتی) ہو گئے تو جیون سے نہیں جی پاؤ گے پیارے۔ ہارتے رہو گے۔۔۔"

ونئے نے جلدی جلدی گلاس میں رکھا پیگ خالی کیا۔ اس کی آنکھوں میں مدہوشی کے ڈورے تیر گئے تھے۔

میں بہت عام طرح سے نہیں جی سکتا ساتھی۔ اندر کچھ ہے جو ایک بڑے انقلاب کے لئے چیختا رہتا ہے۔

پھر اس نے بتایا کہ وہ اپنے ایک رنگ کرمی دوست کے یہاں گیا تھا۔ وہیں رہا تین روز۔ اس بیچ کہیں گیا نہیں۔ اس کی بیوی ہے۔ دو چھوٹے بچے ہیں۔ رمیش نام ہے۔ رمیش بھی ایکٹا (ٹکڑا) منچ سے جڑا ہوا ہے۔ بہت جذباتی انسان۔ شاندار انسان ... وہ پھر دیر تک بولتا رہا کہ ان پانچ چھ دنوں میں اس نے کیا حاصل کیا۔ زندگی کو کس نئے روپ میں دیکھا۔ اس کی آواز چھلچھلا آئی تھی۔

"دوست رمیش کی پتنی بڑی پیاری ہے۔ اتنی جتنی ایک بہن ہو سکتی ہے اور اس کے دونوں بچے... اتنے کیوٹ کہ ... ایک تو ابھی کچھ مہینوں کا ہے۔ شیشی میں دودھ بنانا، پلانا، سب میں ہی کرتا تھا۔ تم یہاں رہ کر خود کو مشینی بنا کر سوچ بھی نہیں سکتے کہ زندگی کا سکھ یہ بھی ہوتا ہے کہ جب پتنی ہوتی ہے اور بچے ہوتے ہیں۔ ایک بڑے انقلاب کی تیاری سے پہلے مجھے بھی لگتا ہے کہ میرے پاس ایک گھر ہونا چاہیئے۔ بیوی بچے ہونے چاہئیں، جہاں اپنے اندر کے ہر طرح کے فرسٹریشن کو قید کر کے، اپنے ذہن کو آزاد کر کے کوئی بڑی لڑائی لڑ سکوں۔ کیوں ساتھی؟"

میں نے اُسے اس پرانی گھٹنا (واقعہ) کی یاد دلائی اور پوچھا — انقلاب اب تک تمہارے وجود سے نکلا نہیں ... اب تک پنپتا ہے تم میں؟

"ہاں ساتھی۔ شاید حیرت کرو تم۔ لیکن ایک گھر دیکھنے کے بعد ایک سُندر سے چھوٹے سے گھر کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد پھر وہیں جھک گیا ہوں۔ غلطی دراصل میرے اس نظریے کی تھی، جو وہاں ایک ظاہری غرض کو لے کر تھا۔ نہیں سمجھے۔ کیا ضروری ہے کہ ایک تحریک سے جڑے سارے لوگ ایماندار ہوں۔ ایمانداری اور مضبوطی تو دراصل اپنے اندر ہونی چاہیئے۔ یہ میرے اب تک کے کمٹمنٹ کی کتنی بڑی ہار تھی کہ صرف وہاں نہ جانے

کے آکروشش، میں اس پُوری تحریک سے بدظن ہو اُٹھا تھا۔

پھر زندگی کے کچھ اور سال ہوا میں پھڑ پھڑا کر اُڑ گئے تھے۔ پروف ریڈر سے سب ایڈیٹر بننے کی اس کی چھلانگ کافی لمبی تو نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن اتنا طے تھا کہ مہانگری کے 'آرٹ اینڈ کلچر' سے جُڑے زیادہ تر لوگوں سے اس کی پہچان کے دائرے بڑھ چکے تھے۔ اکثر وہ کمرے میں ہی بھیڑ لگائے رہتا۔ کبھی کبھی مجھے اس شور شرابے سے چڑ بھی ہوتی۔ ایک دو بار تو میں نے غصّے میں کہا بھی تھا۔ یار ایسا برابر چلے گا تو مَیں کمرہ بدل دوں گا۔ تم ہی رہنا یہاں۔ مَیں اس ہنگامے میں لکھ پڑھ نہیں پاتا۔ لیکن جانتا تھا ونئے کی مجبوری۔ مہینے کے ایک ہفتہ بیتتے بیتتے اس کے تنگ ہوتے ہاتھوں کے قصّے۔ بھلا کہاں جائے گا وہ؟ احساس ہوا تھا کہ وہ اپنا پُورا کیریئر کسی مرگ ترشنا کے لئے ہی داؤ پر لگا رہا ہے۔ جہاں اسے کچھ نہیں ملے گا، سوائے شہر میں کل چھبنے والے اُن پلوؤں کے جو اُسے جیون بھر ڈستے رہیں گے۔ مہانگری کی اِس طرح کی کوئی بھی سبھا ہو، سمّیلن ہو، گوشٹھی ہو۔۔۔ اب ونئے ہر جگہ موجود رہنے لگا تھا۔ آگے ہی آگے۔

اسی بیچ ایک بھیانک بات ہو گئی۔ شہر کی آب و ہَوا اچانک بدل گئی۔ مہانگر کے ماحول میں فرقہ وارانہ دنگوں کی سرپھری ہَوا چل گئی۔ ایکتا اُنکرڈ منچ سے جڑے لوگوں کے کام اب زیادہ بڑھ گئے تھے۔ شہر کی بارودی فضا جہاں ایک طرف کرفیو کی آغوش میں سانس لے رہی تھی۔ پُورا شہر سہما سہما اپنے اپنے گھونسلوں میں فضا کے شانت ہونے کے انتظار میں تھا۔ وہیں ونئے اپنے نئے نئے ناٹکوں کی ریہرسل میں لگا تھا۔ اکثر رات گئے چوروں کی طرح آتا۔ کپڑے بِن بدلے ہی سو جاتا پھر صبح کو میرے اُٹھنے سے پہلے ہی کہیں غائب ہو چکا ہوتا۔

اس دن وہ آدمی رات گئے آیا۔ دروازہ ہمیشہ کی طرح مَیں نے بھڑا کر چھوڑ دیا تھا۔ اسٹوو میں پمپ مارنے کی آواز سُن کر میری نیند اُچٹ گئی۔ دیکھا ونئے آ گیا ہے۔ چائے چڑھا رہا ہے۔ میری اور اچٹتی نظر ڈال کر بولا۔

"چائے پیو گے ساتھی؟"

لیکن اس 'ساتھی' میں وہ پہلے والی مٹھاس نہ تھی۔ چہرے سے بھی کسی انجانے خطرے کی بُو آ رہی تھی۔

اسٹوو کچھ پل چیختا رہا۔ پتی ڈالنے اور کچھ دیر تک کھولنے کے بعد اُس نے چیختے اسٹوو سے ہوا نکال کر اُسے شانت تو کر دیا پر خود بھڑک گیا۔

"لو ساتھی۔ چائے پیو۔ کیسی آزادی ساتھی۔ کیسی لیبرٹی۔ سب ایک گھناؤنا مذاق ہے ہمارے ساتھ۔ سب کو گونگے تماش بینوں کی طرح رہنا ہے۔"

میں نے چائے کا پہلا گھونٹ لیا پھر پوچھا۔

"کوئی گھٹنا گھٹی کیا؟ پھر کہیں پولیس سے مُڈ بھیڑ تو نہیں ہوئی۔"

"ہوئی"۔ وہ اس لفظ کو کھینچ کر بولا۔ آپ اسے غلط نہیں کہہ سکتے۔ کہیں گے تو پولیس کے کتے آپ کو پیٹیں گے۔ سرکار بھی کتوں کی ہے۔ وہ آپ ہی کو اپرادھی ٹھہرائے گی اور آپ کا قصور۔ قصور صرف اتنا ہے ساتھی کہ آپ سچ کا اعلان کر رہے ہیں۔"

"کہاں کیا تھا ناٹک؟"

"وہیں، فرید آباد میں۔"

میں تھوڑا کھیج کر بولا۔ "تم یہاں صرف ناٹک دکھانے آئے ہو یا اپنا کوئی کیریئر بنانے۔ ایک دن جب خود ناٹک بن جاؤ گے تو کوئی تمہارے حال پر تھوکنے بھی نہیں آئے گا۔"

"یہ ناٹک نہیں ہے"

پہلی بار دیکھا تھا جذبات کی رَو میں ونئے کو چیختے ہوئے۔ "یہ ناٹک نہیں ہے ساتھی۔ یہ تو سڑے گلے رینگتے کیڑوں تک کو دکھانے کی کارروائی ہے، جسے وہ جیون کہتے ہیں۔ سچ کہنا ساتھی۔ اپنی بیوی بچوں کی چنتا کیا۔ ہمیں دوسروں کے دُکھ سکھ کے احساس سے کاٹ نہیں ڈالتی؟ تو پھر اپنی بیوی بچوں میں ایک سُکھد (سکھی) جیون کی تلاش سے دوسرے گھروں میں اُسی سُکھد آنند کا احساس نہ ڈھونڈ پانے کی غلطی کیا ایک غیر مہذب جنگلی پن نہیں ہے؟"

اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں ۔۔ وہ ہمیں مجمع لگانے نہیں دیتے ۔نعرے لگانے سے روکتے ہیں۔ ہمارے جھنڈے پر پھبتی کستے ہیں ۔" سیٹو" کا ذکر آجائے تو تاؤ کھا جاتے ہیں ۔کہتے ہیں اِسک وِسک کے ناٹک کرو۔ حوالات میں ڈالنے کی دھمکی دیتے ہیں ۔

" کوئی مار پیٹ ہوئی کیا ؟"

ٹھنڈی چائے کا آخری گھونٹ ونئے نے اپنے گلے کے حوالے کیا ۔

" نہیں، پولیس والے وارننگ دے کر گئے ہیں آج ۔ لگاؤ مجمع کل پھر دیکھیں گے ۔ نشاط کہتا ہے کل بھی مجمع لگے گا۔ ہم سب کہتے ہیں جو ہو گا دیکھا جائے گا"

" بات بڑھانے سے فائدہ ہی کیا ہے "

" اسے ضد کہہ لو۔ پر جو ہوگا اسے کل بھگتیں گے "

ونئے نے چادر کھینچ لی اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔ ایک سہما سا ڈر لئے میں لیٹ گیا۔ لیکن اس رات کافی رات تک مجھے نیند نہ آسکی۔ لیکن دوسرے دن جو ہوا اس کا اندازہ تو پہلے ہی لگ گیا تھا مجھے ۔چھ بجے اُن کے ناٹک کا وقت تھا اور سات بجے تک پولیس کے ذریعہ نشاط کی غیر انسانی ڈھنگ سے ہوئی ہتیا (قتل) کی خبر پورے شہر میں پھیل چکی تھی۔ اُس وقت میں دفتر میں ہی تھا جب ٹیلی فون کا چونگا میرے نام بج اٹھا اور میرے ایک صحافی دوست نے یہ بُری خبر مجھے سُنائی ۔خبر سُنتے ہی مَیں نے ایک ہلکی سی چیخ ماری تھی ۔ پھر چھوٹتے ہی پوچھا " ونئے کی کیا خبر ہے ؟"

" ابھی کچھ پتہ نہیں "

اب آگے پوچھنے کی ہمت نہ جُٹا سکا۔ میرے پورے وجود میں گہرے سناٹے کے سرخ شعلے رکھ دیئے گئے تھے ۔ نشاط کو میں بھی جانتا تھا۔ بہت اچھی طرح تو نہیں پھر بھی اس کی ایکٹیوٹیز کو جانتا تھا۔ ایکتا نکڑ منچ سے جڑاؤ اور اس کے زبردست کمٹمنٹ کا میں بھی قائل تھا۔ باڑھ اور سوکھا پیڑتوں کے لئے گھر گھر جا کر فنڈ اکٹھا کرنا، فرقہ وارانہ دنگوں میں مارے گئے لوگوں کے گھر والوں کو آرتھک سہایتا (مالی مدد) دینا ان کی لمبی تفصیل تھی ۔ نشا کے سب جاننے والے اس کے اُن کام کے طریقوں سے واقف تھے ۔ آنکھوں کے سامنے

اب بھی وِنئے کا سلگتا ہوا چہرہ تیر رہا تھا۔

یہ خبر اتنی بھیانک تھی کہ مَیں نے فوراً آفس چھوڑ دیا۔ اندر تک جیسے تیز کپکپی (کپکپاہٹ) اتر آیا تھا۔ کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ اب ایک ہی اڈہ تھا منڈی ہاؤس جہاں پورے سماچار کے ملنے کی امید بندھی تھی۔ یہ بھی تھا کہ جب تک وِنئے نہیں آجاتا میرے بھیتر کی اگنی شانت نہیں ہوسکے گی۔ منڈی ہاؤس میں ایک عجیب سا کولاہل میرے انتظار میں تھا۔ وہاں جو خبر مل سکی اس کے مطابق کسی بنے بنائے پروگرام کی طرح پولیس کا حملہ جیسے کسی دشمن سینا پر کیا جاتا ہے۔ ٹھیک ویسے ہی مورچہ سنبھالا تھا پولیس نے۔ آنسو گیس چھوڑی تھی۔ نشا طنے سب کو بھاگ جانے کے لئے کہہ کر خود ہی مورچہ سنبھال لیا تھا۔ نشاط کا شو (لاش) نکڑ کے استھان کے پاس ہی ایک نالے سے برآمد ہوا تھا۔ یہ بولنے کی آزادی پر حملہ تھا۔ منڈی ہاؤس میں تیز تیز بولتی آوازوں سے اتنا ضرور لگا تھا کہ یہ آگ جلدی شانت نہیں ہو پائے گی۔

اس رات کافی انتظار کے بعد بھی وِنئے نہیں آیا۔ ساری رات بے چینی میں گزری۔ کروٹیں بدلتا رہا۔ پولیس کے ذریعہ زخمی کئے گئے کچھ اور آدمیوں کی خبریں بھی مجھے مل گئیں۔ یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں ان میں وِنئے نہ ہو۔ دوسرے دن صبح نو بجے کے آس پاس دفتر جانے کے لئے تیار ہی ہو رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو اچانک ایک پل کو ٹھٹھک گیا۔ سامنے وِنئے تھا ... لاش جیسا سرد ... سارا آکروش جیسے اس نے اپنی آنکھوں اور چہرے پر بھر رکھا ہو۔ کچھ بولا نہیں۔ دروازہ بند کرنے تک وہ چپ چپ میرے ساتھ بھیتر آگیا۔ مَیں صرف اس کا سلگتا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا ... کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں جٹا پایا۔

"چائے پیوگے؟" آہستہ سے پوچھا مَیں نے۔

اُس نے بس منڈی ہلا دی۔

پمپ مارنے اور چائے پڑھانے تک مَیں نے کئی بار اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہ منہ نیچا کئے کسی گمبھیر فکر میں ڈوبا تھا۔

اس کی طرف چائے بڑھانے تک کچھ پوچھنے کی ہمت پیدا کر سکا تھا مَیں۔

"وننے ۔ یہ سب ؟"

"ساتھی ۔ ۔ ۔" درد کا احساس ہوتے ہی ایک دم سے اس کی آنکھیں چھلچھلا آئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا ۔ ہچکیاں تھم آئیں ۔ میں اب تک گم صُم اس کے وجود میں چھپے زخم کا اندازہ لگا رہا تھا ۔ وننے پولیس کی مار سے تو بچ گیا ، پر اس گھٹنا کا ایک چشم دید گواہ تھا ۔ پتہ نہیں کیا سوچ کر اُس نے میری طرف دیکھا اور کہنا چاہا ۔۔۔ تم روٹیوں کی دُکانوں پر فوج تو نہیں بٹھا سکتے نا ۔ بٹھاؤ گے تو بھوگی عوام دُکانوں پر تو حملہ بولے گی ہی "

اصل کارروائی تو بعد کو ہوئی تھی ۔ دو چار روز اور گزرے ۔ نشاط کی موت حقیقت میں جنگ کا بگل بن کر آئی تھی ۔ میڈیا ورلڈ نے اُسے ہیرو بنا دیا تھا ۔ دھواں دھار اداریے ، جلوس در جلوس ، ہنگامے ، ہڑتالیں ۔۔۔ بندی ۔۔۔ وننے بھی دن رات ان کارروائیوں کا ایک حصّہ رہا تھا ۔ وجہ یہ بھی تھی کہ پولیس آکرمن (حملہ) کی پوری کارروائی اس کے سامنے ہی ہوئی تھی اور اسی کے شبدوں میں ، اب اُس نے بھی ویسے ہی ہٹیلے پن سے مورچہ لینے کی ٹھان لی ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ اس پورے ہنگامے سے وہ بہت زیادہ جذباتی دکھتا تھا اور اس جذباتیت کو آسانی سے اس کے چہرے پر تلاش کیا جا سکتا تھا ۔ اس رات وہ کافی تھکا ہوا تھا ۔ کئی روز کی تھکان تھی ۔ پورے پورے دن اور رات کی تھکن ۔۔۔ اس دن سونے سے پہلے وننے کی لرزتی آواز کی کپکپاہٹ میں ایک عجیب سا ہیجان چھُپا تھا ۔

" دیکھا نہ ساتھی ۔ ایسے آتی ہے کرانتی ۔ ۔ ۔ اب مجھے نشاط کے مرنے کا اتنا دُکھ نہیں ہے ۔۔۔ گورکی کو پڑھا ہے تم نے ۔۔۔ اس کی ماں ، پڑھی ہے ۔ یاد ہے پاویل ولاسوف کی ۔۔۔ اس مزدور کی ۔۔۔ جو اچانک ہی انقلاب کا ایک تیز سُور بن گیا ۔ لگتا ہے کہ نشاط نے بھی مرتے مرتے اسی پاویل کی بھومیکا نبھائی ہے ۔ تمھیں کیا لگتا ہے ساتھی ۔ یہ آگ رُک پائے گی ۔۔۔ تھم پائے گی ۔۔۔ ؟"

اس دن چپ رہا میں ۔ اچھا نہیں لگا ۔ کچھ کہتے ہوئے ۔ سچ تو یہ ہے کہ تھوڑا ڈر دماغ مجھ میں بھی تھا ۔ اس لئے دل سے یہ آواز ضرور اُٹھ رہی تھی کہ اس کارروائی کو ابھی آگے بھی جاری رہنا چاہیئے ۔ منڈی ہاؤس میں نشاط کے نام پر ادھر لگاتار سبھاؤں کا آیوجن ،

ہو رہا تھا۔ اس رات ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ گھر لوٹا تو دیکھا ... ونئے کی چادر پر مڑا تڑا ایک چھوٹا سا پرزہ پڑا ہے ... کھولا تو ایک عجیب سا احساس مجھے دہلا گیا تھا۔ اس کا مطلب ونئے بیچ میں آیا تھا۔ پرزہ کافی دیر تک میرے ہاتھوں میں کانپتا رہا تھا۔

"ہم موک درشک (گونگے سامعین) ہیں
کچھ نہیں بولتے
کچھ نہیں کہتے
چھوٹے شہروں سے
جنم سے ورثے میں ملی بھاوکتا سینچنے
یہاں کٹھ پتلیاں بننے آئے ہیں ہم
اور روندے جاتے ہیں پاگل سینا کے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے
وہ مزدوروں اور ان کی سمسیاؤں کی باتیں کرتے ہیں
باتیں کرتے ہیں وہ مارکس، لینن اور ماؤ کی وچار دھاراؤں کی
یہ سب محض ایک عیاشی ہے ان کے لئے
ذہنی عیاشی
اور ہے اپنے ہی جیسے چند بورژوا سنکیوں کے بیچ فلاسفر کہلانے کا احساس
اپنی گمبھیرتا سے کسی چالاک شاسک کی طرح میٹھی میٹھی باتیں کرکے
وہ کسی جونک کی طرح لہو چوستے ہیں ہمارا
ہم سب موک درشک ہیں
ہم کچھ نہیں کہتے
کچھ نہیں بولتے"

پھر یہی کویتا اس کے چہرے پہ بھی لکھی دکھائی دینے لگی۔ میری خواہش ہوتی کہ اس سے کہوں۔ تم پاگل ہو ... یا بن رہے ہو ... بھاوکتا کے لفظ پیچھے سے آدمی کی پیمائش

بھی نہیں ہوتی۔ پارٹی تو الگ چیز ہے لیکن یہاں تو تم وقتی بھاؤکتا کے بہاؤ میں کسی بھی حالت یا واقعے کو لے کر، چاہے قصوروار چند لوگ کیوں نہ ہوں، تم پوری پارٹی کو ہی غلط سمجھنے کی بھول کر رہے ہو۔ ایسے کئی موقعوں پر میں نے دیکھا تھا۔ اس نے چھوڑ دوں گا، بے کار ہے۔۔۔ جیسے شبد بھی اپنی زبان سے نکالے تھے۔ مجھے لگا کہ کہوں۔۔۔ کہ دراصل تم نے اپنا ایک الگ تصوّراتی محل تعمیر کیا ہے اور جب بھی کبھی تم اس محدود دائرے سے باہر دیکھتے ہو تو تمہیں غلط لگتا ہے۔۔۔ کہنے کو کتنے ہی باتیں تھیں، لیکن فائدہ ہی کیا تھا۔ ونئے دن بدن کمزور اور ہارا ہوا سا لگنے لگا تھا۔ کئی بار اس نے دفتر سے ملنے والے پیسے کو لے کر بھی اداسی ظاہر کی تھی۔ اسے میں صاف دیکھ رہا تھا۔ ہاں گھر لوٹنے کی بات کہہ کر اس نے اپنا منشا صاف کر دیا تھا۔۔۔ کہ اب وہ پوری طرح اپنے کھوکھلی بھاؤکتا سے ہار چکا ہے۔ نہیں تو کامریڈ نشاط والے سیمیلن کو وہ اس طرح بیچ میں چھوڑ کر نہیں آتا اور اپنا یہ فیصلہ نہیں سناتا۔

"مجھے لگتا ہے یا تو میں مورکھ (بیوقوف) بن رہا ہوں یا بنایا جا رہا ہوں۔ یہ لڑائی غلط مورچے لے رہی ہے۔ اب لگتا ہے کہ یہ پوری کارروائی نشاط کی موت کو کیش کئے جانے کے لئے ہو رہی ہو۔ دراصل انقلاب کی مشعل چند غلط بورژوا سوچ والے پونجی پتی ہاتھوں میں چلی گئی ہیں اور وہ اس کا راج نیتک استعمال بھی کر رہے ہیں۔ دراصل نشاط کی موت کا سوگ نہیں منایا جا رہا، جشن منایا جا رہا ہے۔۔۔ وقت کے پنّوں پر اب صرف ونئے کے لوٹنے کی داستان درج ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں وہ چپ چاپ میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا ہے۔۔۔ ساتھی۔۔۔ اب واپس لوٹنا چاہتا ہوں ساتھی۔ ان سب نے تھکا دیا ہے مجھے۔۔۔ چھ۔۔۔ سال چھ مہینے۔۔۔ ان مہینوں میں صرف ایک خوشگوار لمحے کے تصوّر میں میرا استحصال ہوا ہے۔ ساتھی، گاؤں یاد آ رہا ہے۔ یاد آ رہی ہے وہاں کی مٹّی۔۔۔ ساتھی مجھے گاؤں بلا رہا ہے۔۔۔

چھک۔۔۔ چھک۔۔۔ چھک۔۔۔ چھک۔۔۔ گاڑی پتہ نہیں کب کھلی۔ میں بھی جیسے اتنے برسوں کے ڈراؤنے خواب سے جاگا۔ ایسا کیوں ہوا؟ ونئے میں یہ پریورتن

کیوں آیا؛ جس گھٹنا کو لے کر اتنا روما نچ سے بھر گیا تھا وہ، وہی گھٹنا اس کے لئے یاتت سے لبریز کیسے ہوگئ۔ نشاط کی موت سے وہ دیش میں جس سنہرے اُجالے کے اتہاس لکھنے کی بات کرتا تھا، اچانک وہ کارروائی بورژوا سوچوں والی مانسک (ذہنی) عیاشی کیسے بن گئی؟"

اب آنکھوں کے سامنے بس ایک ہی کویتا تیر رہی ہے ... آخری کویتا ... جانے سے قبل لکھی ہوئی کویتا ... جو اس کے پورے ٹوٹے پھوٹے وجود کا آبھاس (احساس) دے رہی ہے۔

"ایک عیاشی یہ بھی ہے
ذہن میں پل رہی پونجی وادسوچ کے پنّوں پر
غریبی اور اس سے جڑے ہوئے مسائل کا چہرہ بنانا
اس سے بھی بڑی عیاشی ہے
ایک اچھے نظریے کو بنیاد بنا کر
بچپن سے پالے گئے اپنے جذبات کا استحصال ہوتے دیکھنا

(یہ کہانی یہاں ختم ہوتی ہے)

نوٹ، آج بہت دنوں بعد اس کا خط آیا ہے ...

ساتھی!

یہ پتر تمہیں گاؤں سے لکھ رہا ہوں۔ بہت بدل گیا ہے اپنا گاؤں۔ بابوجی نہیں رہے ... پریوار والوں نے جیسے میری بھکرمتا کو دیکھ کر مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ ابھی تک کچھ کر نہیں پایا ہوں۔ گاؤں کو سمجھنے میں لگا ہوں۔ ہوسکتا ہے جلدی ہی ہاتھوں میں ہل اُٹھاؤں۔ لیکن ہل اُٹھانا کیا ایک پرکار (طرح) کا فرار ہوگا میرے لئے؛ نہیں ساتھی مجھے لگتا ہے۔ جیون کے اس ناٹک میں صرف مَیں نے اپنی بھومیکا بدلی ہے۔ اسے نہیں سے انسان کے جیون سے جڑی ہار جیت کا پرشن (سوال) نہیں بنانا۔ ہاں، کبھی کبھی ایک پرشن مجھے ستاتا ہے کہ یہ پوری جنگ کیا بغیر کسی جیت ہار کے

میں نے ختم کر دی یا اپنے طور پر میں جس تجزیہ کے دَور سے گزرا وہ صحیح تھا۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں ہی غلط ہوں۔ دراصل اپنے طور پر کوئی بھی رائے متعین کرتے ہوئے بھولنے بھٹکنے جیسی بات ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے میری واپسی میری اَدھ پکڑی سوچ کا نتیجہ رہی ہو۔۔۔

اپنے اس تجزیہ کے سہارے میں پھر اسی نقطے پر پہنچ رہا ہوں کہ کیا یہ سب کچھ میری بھاؤکتا (جذبات) کا کرا دھرا ہے۔ شاید ایسا ہے۔ اس لئے ایسی کسی تحریک سے جڑاؤ سے پہلے ہمیں اپنی اس کھوکھلی بھاؤکتا کا بھی اَنت (خاتمہ) کرنا ہوگا۔ ہاں ساتھی "ہل" اُٹھانا اس مجبوری کا کہیں سے کوئی حل نہیں ہے۔ پر ایسا کرتے ہوئے اب تک کی اپنی بھاؤکتا کو پتھر کی طرح تراشتے ہوئے لگتا ہے۔ کہیں ایک جنگ کا من بنا رہا ہوں میں۔ لیکن کیا دوسروں کو بھی اس طرح جنگ کا من بناتے ہوئے، اسی طرح گاؤں لوٹ کر ہاتھوں میں "ہل" اٹھانا ہوگا؟ نہیں ساتھی۔ میں ایسا نہیں مانتا۔ اس کے لئے مجھے اپنے سپنوں کی وہ چھت توڑنی پڑی ہے جس کی کھوج مجھے مہانگری لے گئی تھی۔ ہو سکتا ہے مجھے نئے سرے سے اس جنگ کے لئے کوئی اسٹریٹیجی تیار کرنی پڑے۔ ابھی اس کا خاکہ کیا ہوگا۔ یہ صاف طور پر میرے ذہن میں نہیں ہے۔ پھر بھی اسے لے کر بار بار سوچ رہا ہوں اور گاؤں میں اپنے ہی جیسے نوجوانوں کا ایک منچ تیار کر رہا ہوں۔

ساتھی، تم نے ایک بار کہا تھا، میں تھوڑا نہیں بہت کنفیوزڈ ہوں۔ اس لئے ان سب باتوں کے باوجود میری سوچ وہیں مُڑ رہی ہے کہ کیا یہ سب ایک تحریک سے روحانی وابستگی، یہ سب صرف زندگی کو اپنے نظریے سے دیکھنے اور پہچاننے بھر ہے۔ آنکھیں بند ہونے کے بعد دوسرے اسی تخلیقی مراحل کا ایک حصّہ بن جاتے ہیں۔۔۔ اور ناٹک لگاتار چلتا رہتا ہے۔۔۔ تو کیا سچ صرف اتنا ہے ساتھی؟ تو کیا ہم سب جادوگر کے بند ڈبّے سے نکلنے والی مُرغی ہیں یا کسی اَنہونی کی پرتیکچھا میں اس ناٹک کا حصّہ بنے رہتے ہیں؟ مجھے پُورا جیون کسی سچ کی کھوج جیسی سچّائی سے انکار نہیں ہے۔۔۔ سارے دھرم، ساری تحریکیں، سبھی اس کھوج کو لے کر جنمی ہیں۔۔۔ ہر دَور، ہر صدی میں — اور یہ پوری کھوج

کسی مرگ ترشنا جیسی ہے ... کبھی ختم نہیں ہونے والی۔ جیون کا راز بنے رہنے میں ہی ہے ... اس لئے کہ اس راز میں ہی جیون کا سوندریہ (خوبصورتی) چھُپا ہے ... کیوں ساتھی؟ اس لئے میں نے بھی سچ کی اس کھوج کی حصّہ داری میں اپنا من بنالیا ہے۔

لیکن کیا میرے ناٹک کا خاتمہ (انت) آنے والا سمے کرے گا یا میں خود طے کروں گا۔ ابھی اس مدّے تک نہیں پہنچا ہوں۔ لیکن اتنا طے ہے کہ اس ناٹک میں اپنی بھومیکا کا چناؤ خود میرا کیا ہوا ہے۔ اس لئے مجھے مہانگری سے گاؤں واپسی یا اس کی بھومیکا پر کسی طرح کا پچھتاوا نہیں ہے۔

اچھا اب بند کرتا ہوں ساتھی　　　　تمھارا ہی
دنئے

آجکل ۱۹۹۱ء ◆◆

ہجرت

سفر شروع ہوگیا تھا... زندگی کو نئے سرے سے جینے کی تیاری بھی مکمل تھی۔ پورا گھر بار اٹھ کر ٹرین کے اس چھوٹے سے کیبن میں سمٹ آیا تھا۔ اُوپر والی دونوں برتھ پر ہرمیت اور گرجیت کی بیویاں آرام کر رہی تھیں۔ گرجیت کی لڑکی مینو اور ارپنا چپ چاپ کچھ کھیلنے میں مصروف تھیں۔ ہرمیت کا بچہ پرتیپال جگجیت کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے سٹا ہوا آتے جاتے مناظر سے بور ہو کر بوڑھے وجود کے کھوکھلے پن پر پتھر برسانے لگتا۔

"لکھی! کچھ بات کرونا..."

"اپنا پنجاب کب آئے گا لکھی..."

"اپنا پنجاب بھی کیا ایسا ہی ہوگا اپنے شہر جیسا؟"

"اپنا مکان کتنا اچھا تھا لکھی۔ کتنا اُونچا، کتنا شاندار، فرج، ٹی وی سب... وہاں یہ سب مل جائے گا لکھی؟"

اس کی بک بک سُن کر ہرمیت نے ڈانٹا "لکھی کو پریشان مت کرو۔"

بوڑھا جگجیت ان کے لئے بس لکھی تھا۔ لکھی سے زیادہ نہیں۔ پتہ نہیں کن جذبوں کے تحت معصومیت کے سوال سے گھبرا کر جگجیت نے پرتیپال کو گود میں بھینچ لیا۔ پرتو کو باپ کی ڈانٹ بُری لگی تھی۔ گرجیت اب بھی سامان طار رہا تھا۔ دو ٹرنک... دو سوٹ کیس... تین چھوٹے تکیے... دو بریف کیس... جن پر سر رکھے دونوں کی بیویاں

آرام سے لیٹی پڑھ رہی تھیں۔۔۔ ناچتی انگلیوں پر اب بھی حساب چل رہا تھا۔ آنکھیں الجھی ہوئی تھیں۔ دماغ کچھ پریشان سا تھا۔ جگجیت سب کچھ دیکھ رہے تھے ۔۔۔ کھوئی کھوئی آنکھوں سے۔۔۔ ہجرت کی ایک اور کہانی کو۔۔۔

لکھّی اپنے پنجاب میں بڑی بڑی بسیں چلتی ہیں نا۔۔۔ بہت بڑا شہر ہے نا۔۔۔ پرتپال پوچھ رہا ہے۔۔۔

معصوم دل میں کتنے خنجر اتر گئے پرتپال بولے جارہا ہے۔۔۔ لکھی پتا جی تو بتلاتے ہیں کہ تمھارا بچپن وہیں گزرا ہے تم نے تو پورا پنجاب دیکھا ہوگا لکھی۔۔۔ مجھے تو سارے شہر ایک سے نظر آتے ہیں۔ پنجاب کیسا ہوگا لکھی؟"

ہرمیت نے پھر آنکھیں تریریں۔ پرتپال چپ ہوگیا۔ جگجیت نے چپ چاپ پرتپال کے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کردیا۔

پر تو پھر شروع ہوگیا۔ لکھی ہم پنجاب کیوں جارہے ہیں۔ سب کچھ کیوں بیچ دیا۔ دکان گھر سب کچھ؟

پرتپال کی معصوم آنکھوں میں سوالوں کے کتنے ہی زہریلے خنجر اُترے ہوئے تھے مگر اس بار ہرمیت کچھ نہیں بولا۔

اس بار گرجیت نے سامانوں کی گنتی بھی نہیں کی۔ سوال سنتے ہی جیسے کاٹھ مار گیا ہو۔۔۔ چپ چاپ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کسی نے بھی پرتپال کو کچھ نہیں بولا۔ مگر دیر سے خاموش جگجیت اس بار چپ نہ رہ سکے۔

بیٹے ہماری قسمت میں بس ہجرت لکھی ہے۔ ہجرت جس کا مفہوم تمھارا معصوم ذہن ابھی نہیں سمجھ سکتا۔ لاہور سے آرہ اور آرہ سے پنجاب۔ پتہ نہیں اس بوڑھی تقدیر میں اور کتنی ہجرت لکھی ہے۔

آواز کانپ گئی تھی۔ بھرّا گئی تھی۔ ایک ساتھ سب نے محسوس کیا۔ لکھی کی آواز بھیگ گئی ہے اور لکھی ان باتوں سے بے نیاز پھر سے دوڑتے مناظر کو دیکھنے لگ گیا تھا۔ دوپہر ڈھلنے کو تھی۔ سردی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی تھی۔ بوڑھے ہاتھوں نے آہستہ سے ہاتھ

بڑھا کر کھڑکی سے شیشہ کھینچ دیا۔ پرتیپال کو ہربیت نے گود میں لے لیا۔
"لکھی۔۔۔ آپ آرام کہیں"
آرام کے نام پر لکھی چپ سے ہوگئے۔ کچھ بولے نہیں۔ ہاتھ بڑھا کر باسکیٹ سے اُردو کا کوئی رسالہ نکال لیا اور جیب سے پڑھنے کے لئے چشمہ نکالا، تو ہاتھ میں قرآن پاک کا نسخہ آگیا۔۔۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ جاتے وقت ملک زادہ نے کہا تھا،
جگجیت تو جا رہا ہے، شاید یہ آخری ملاقات ہے ہم لوگوں کی۔ بھولنا نہیں وقت کے تھپیڑوں میں بھی دیکھ ہم نہیں بدلے۔ کچھ بھی نہیں بدلا جگجیت، صرف وقت بدل گیا ہے اور تو جانتا ہے کہ بدلتا صرف وقت ہی ہے۔ جاتے وقت سوائے ان آنسوؤں کے ہم تجھے دے بھی کیا سکتے ہیں۔ مگر قرآن پاک کی یہ سورہ رکھ لے، راستے میں تیری حفاظت کے لئے کافی ہے۔
حفاظت ۔۔۔ جگجیت کے آرام میں خلل پڑ گیا تھا۔ لیٹ نہیں سکے۔ سارے جسم میں بے چینی بھر گئی۔ قرآن پاک کے نسخے کو آنکھوں سے لگایا پھر جیب میں احترام سے رکھا۔ آنکھوں کو کتنا کچھ ڈس گیا۔۔۔ اُردو کا رسالہ ہاتھوں میں کانپ گیا۔۔۔ ملک زادے اطمینان سے رہ۔ تیرا خدا حفاظت کر رہا ہے میری۔۔۔ آنکھوں میں کتنے ہی لہو لہو منظروں کا آتش فشاں پھٹ گیا۔
"ملک زادے ۔۔۔ اس ہجرت کے لئے میں تیار نہیں تھا۔ شہریار اور شہرزاد کی کہانیاں تیرے ہی شہر میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ خسرو پرویز کی کہانیوں کے دن گزر گئے۔۔۔ آرام کے باغیچے میں اب داستانوں اور کہانیوں کے پھل نہیں اُگیں گے بس دُعا کرنا کہ جہاں جا رہا ہوں وہاں کی خمیر اپنا لے۔۔۔ بس"
جھرّی بھری پلکیں بھیگ گئیں۔ کانپتے ہاتھوں سے چشمہ تھاما چشمے کو غور سے دیکھتے رہے۔ پلکوں پر خلوص اور محبت کا کتنا بڑا قرض لئے یہ شہر چھوڑ رہے تھے لکھی ۔۔۔ گاڑی رُک گئی تھی۔
"یہ کونسا جنکشن ہے لکھی؟" پرتیپال پوچھ رہا تھا۔
اپنا بہار ختم ہوگیا۔ ہم بہار سے باہر آگئے ہیں۔ مسکراتے ہوئے جگجیت بولے۔

پرتیپال ہنسنے لگا۔ ہم بہار کو پیچھے چھوڑ آئے ... ننھے ننھے ہاتھ تالیاں بجانے لگے
لکھی تو نے پورا انڈیا گھوما ہے ... سچ بتانا، شہروں میں فرق ہوتا ہے کیا؟ سب کچھ
تو اپنے بہار جیسا ہی لگ رہا ہے۔
جگجیت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ بہو کی طرف دیکھ کر بولے۔ سردی بڑھ گئی
ہے۔ پرتیپال کو گرم کپڑے دے دو۔ پھر پتہ نہیں کیا سوچتے ہوئے پرتو سے بولے۔
"فرق تو بس گاؤں میں ہے پگلے، شہر تو ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔"
شہر کے نام پر لاہور کی یاد آ گئی۔ "بین" اور "سیاپے" کی دردناک فضا۔ جب
وہ لاہور چھوڑ رہے تھے موراں بہن، نوراں آنٹی، اور کتنی ہی آنکھیں ... چھوٹے بھائی
امریندر کی خون میں سنی ہوئی لاش ... سینے پر دو ہتھڑ مارتی ہوئی امریندر
کی دیو تگت ودھوا کتنے ہی پتے اپنے پھولوں جیسے سینے میں اُگائے جا رہی تھی ____
اُچی پگڑی والیا کتھے چھٹ گیا رے لال چوڑی والی نوں۔ ہائے ہائے شیرا ہائے ہائے میرا"
امریندر تمہیں رہا لاہور کے خونی نظارے آنکھوں میں گھوم گئے۔ گزری ہوئی تاریخ
کا رتھ پیچھے اور آگے بڑھا۔ جب ایک نئے شہر کو، ہجرت کے لئے ایک بانکا جوان اپنے قدم
تیز کر رہا تھا۔
خرماں والیاں، بختاں والیاں تیری مدد کرتے۔
نندی نے آنسو پونچھے۔ چھوٹے ہرمیت اور گرجیت کو سینے میں بھرا۔ آنکھوں
میں کتنے ہی تیر لئے جگجیت کے روئے روئے سے چہرے کو دیکھتی ہوئی بولی سب
سامان بک گیا؟
ہاں جو تھا سب بک گیا اب سفر شروع ہو گا۔ ایک نیا سفر۔
باہر مکان کے نئے وارث کھڑے تھے۔
بچے رکشہ پر سوار ہو گئے تھے۔ سامان لد گئے تھے۔ جگجیت پھٹی پھٹی آنکھوں سے
"سیاپا" اور "وین" کرتی آواز کو سنتے رہے۔ رکشے پر نندی کے ساتھ بیٹھ تو
گئے مگر پھر اتر گئے۔ شاید کچھ رہ گیا ہو اسی بہانے ایک بار پھر اندر چلے آئے۔ مکان کو

خوب غور سے دیکھا اونے پونے جتنی بھی قیمت لگی تھی بیچ دیا تھا۔ دیوار و دَر کو نم آلودہ آنکھوں سے گھورتے رہے۔ یہی تو وہ دہلیز تھی جہاں پہلی بار نندی سُرخ جوڑا پہنے اُتری تھی۔ اسی دہلیز پر تیما امریندر کا دکان سے لوٹنے کا انتظار کرتی تھی۔ اسی دہلیز پر خون میں سنی امریندر کی لاش پڑی تھی ۔ ۔ ۔ کچھ بوڑھے ہونٹوں سے نکلی خوفزدہ آواز اندر اندر گونج گئی ۔ ۔ ۔ پورا لاہور جل رہا ہے لگتی ۔ ۔ ۔ پورا لاہور ۔ ۔ ۔ سب گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ تو بھی بھاگ جا پتہ نہیں کب کیا ہو جائے "

تاریخ کا رتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رُکا۔ یہ کرائے کا مکان تھا پڑوسیوں نے خوش آمدید کہا۔ لُٹنے پر بھی وہ سوا لاکھ کے تھے۔ یہ آزادی ملنے کے کچھ پہلے کا زمانہ تھا کتنے یار تھے جو پورے پورے لٹ گئے۔ برباد ہو گئے مگر کسی نے بھیک نہیں مانگی۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ اپنی نظروں کے مجرم نہیں بنے ۔ کتنے سکھ دوست تھے جو سڑکوں پر سوئی تاگا اور کپڑے کا بنڈل لے کر گھر گھر بیچتے ہوئے نظر آتے۔ تجارت کے نام پر ایک بار پھر نئے سرے سے جینے کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ لُٹنے کے بعد بھی یہی کہتے رہے سکھ قوم نے گرو گوبند سنگھ، گرو تیغ بہادر اور بندہ بہادر جیسے شیروں کو پیدا کیا ہے۔ ہم جنگجو قبیلے کے لوگ ہیں۔ ہارنا نہیں جانتے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کپڑے کا بنڈل لے کر گھر گھر دوڑنے والے محنت کش تیزی سے ترقی کرنے لگے۔ کرائے کے مکان سے باہر نکل کر اپنے اپنے گھر بننے لگے۔ دُکانیں اُونچی اٹھنے لگیں ۔ پھر نہ سوئی تاگہ تھا نہ کپڑے کا بنڈل ۔ نہ گھر گھر چلانے کا کام ۔ ۔ ۔ اب بزنس بڑھ رہا تھا، ترقی ہو رہی تھی، کپڑے کے نئے نئے مارکیٹ کھل رہے تھے اور عمارتیں روز روز بلند ہوتی جا رہی تھیں ۔ ۔ ۔

ایسے میں سردار باڑی میں ایک اور مکان اُٹھا۔ اونچا سا، تین منزلہ۔ یہ مکان جگجیت کا تھا۔ جگجیت کے خون پسینے سے بنایا ہوا۔ نندی نے مکان کے کتنے ہی نقشے دیکھے اور اپنے رنگ کا نقشہ پسند کیا۔ یہ کھڑکیاں یہاں ہونی چاہئیں۔ کچن یہاں ۔ ڈرائنگ روم یہاں۔ جب تک مکان بنتا رہا نندی خود بھی پریشان رہی۔ سارا سارا دن مکان میں لگی رہی۔ ہرمیت اور گرجیت سے بھی خوب خوب کام لیتی ۔ وہ منع بھی کرتا ۔ ۔ ۔

نندی تھک جاؤگی۔ مکان بنانا آسان نہیں ہوتا۔ ۔ ۔ نندی کا جواب ہوتا، تم دُکان دیکھو جی۔ مجھے چھوڑ دو۔ پتہ نہیں تئے مکان سے نندی کو کیا لگاؤ تھا۔ کیسے خواب تھے مگر جب مکان بن گیا، رنگ چڑھ گئے تو وہ خود بھی بھونچکا رہ گیا۔ ۔ ۔ نندی یہ تو اپنا لاہور کا گھر ہے۔ ۔ ۔ لاہور کا گھر۔ ۔ ۔

ہاں جی۔ ۔ ۔ نندی رو رہی تھی۔ ۔ ۔ سسکیاں لے رہی تھی۔ ۔ ۔

"ہم لاہور میں لوٹ گئے نندی"

پھر نندی کے ساتھ ساتھ وہ باہر والی دہلیز پر بیٹھ گیا۔ یاد ہے اس دہلیز سے پرتیما یاد آتی ہے۔ نندی آہستہ سے بولی۔

آنکھوں میں امرِیندر کی خون میں سنی لاش گھوم گئی۔ لاہور کے ہنگامے یاد آگئے۔ آنکھوں میں کتنے ہی خونی منظر رینگ گئے۔ دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ ۔ ۔ آواز آئی "بھابھی"

"ملک زادے اندر آجا" جگجیت آواز پہچان کر بولے۔

ملک زادہ اندر آگیا۔ خاموش سا جب تک مکان بنتا رہا ملک زادہ وقت پر آتا رہا۔ گھر سے کچھ نہ کچھ بنا کرلے آتا۔ نندی کو ملک زادہ کی بیوی کی بنائی ہوئی موری روٹی اور بھاجی خوب پسند تھی۔ شوق سے کھاتی۔ ملک زادہ اس کے پاس بیٹھ کر پرانی داستان کی کڑیاں جوڑنے لگا۔

"اب تم کافی دُور آگئے جگجو۔ شاید اب ملاقات کے لئے روز وقت نہ مل پائے"

"میرا گھر تجھے پسند نہیں ہے شاید" جگجیت مسکراتے ہوئے بولے۔

"تیرا گھر نہیں، بھابھی کا گھر۔ ۔ ۔ پسند کیسے نہیں آئے گا" ملک زادہ ہنسا۔

"کہتے ہیں کہ ایک بار روم کے بادشاہ نے۔ ۔ ۔"

"بس کر، پھر کبھی شروع کرنا۔ ۔ ۔ ۔ تجھے اپنی داستان شروع کرنے کے لئے کوئی بہانہ چاہیئے"

ملک زادہ جا رہا ہے سر جھکائے۔ تاریخ کے رتھ پر خون کے چھینٹے پڑ گئے ہیں۔۔۔

ملک زادے، شہریار اور شہرزاد کی کہانیاں بوڑھے کے دل میں ہمیشہ گونجتی رہیں گی۔ خلوص اور محبت سے نکلی یہ کہانیاں ہزاروں ہجرت پر بھاری ہیں، مگر ہجرت کے ہر نئے سفر میں ملک زادہ کہاں سے ملے گا؟"

"بوڑھے کی آنکھوں میں جل بل کرتے آنسو تیر گئے ہیں"

"لکھی... آرام سے سو جاؤ، تمھاری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں لکھی"

پرتیپال کے معصوم چہرے کو دیکھتے ہیں جگجیت... کچھ کہتے نہیں۔ آنسو پونچھ لیتے ہیں آسانی سے... اپنی قوم پر غدّاری کا لیبل کبھی نہیں لگا۔ یہ قوم تو فاتح رہی تھی۔ شیر رہی تھی۔ نانک کے بھگتی اپدیش گونجتے تھے یہاں... مگر مذہب کے سب دھاگے ٹوٹ گئے... ایک ایک کر کے سکھ مذہب کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا جڑ دیا گیا۔ بہادر شیر کو بھرے بازار میں بزدل کہہ کر ننگا کر دیا گیا۔

دروازے بند تھے، کھڑکیاں بند تھیں۔ دکانوں پر شٹر گرے تھے۔ اچانک بالکل اچانک دو پاگل سکھوں نے پوری سکھ برادری کے نام غدّاری کا وارنٹ جاری کرا دیا تھا۔

دروازے پر پتھراؤ ہو رہے تھے۔ لوگ پاگلوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ وحشت کے بوکھلائے ہوئے ہاتھ شٹر توڑ رہے تھے۔ کتنی خبریں مل رہی تھیں۔ گرو نانک مارکیٹ میں بم پھینکا گیا۔ کھرانہ اسٹور جلا دیا گیا۔ ان کے سکھ دوستوں کی کتنی ہی دکانیں جلا دی گئیں۔ لوٹ لی گئیں۔ گھر میں عجیب سا دہشت بھرا ماحول تھا۔ بچے بند کمرے میں الگ پریشان تھے۔ ذہن سوچنے سمجھنے سے لاچار ہو رہا تھا۔ ہرمیت اور گرجیت کی بھی بُری حالت تھی۔ دروازے پر ہونے والی ہر تھاپ کے ساتھ بدن میں خوف اور تھرتھری سما جاتی۔ باہر پھینکے جانے والے ہر پتھر کے ساتھ ارپنا اور مینو کے رونے چیخنے کی آواز تیز ہو جاتی۔ جلتے ہوئے شٹر اور پاگل کر دینے والی چیخوں کے ساتھ پرتو مچل جاتا اور بوڑھے جسم میں کتنے ہی خنجر پیوست ہو جاتے۔

لکھی نے وحشت بھری کتنی ہی منحوس خبروں کے لئے خود کو تیار کر لیا تھا۔ ہرمیت کی دُکان لُوٹ لی گئی۔ گرجیت برباد ہو گیا۔ ظالموں نے سب جلا ڈالا سب کچھ لوٹ لیا۔ ہرمیت کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ گرجیت رو رہا ہے۔ اس کی پتنی رو رہی ہے۔ بچّے رو رہے ہیں۔ لکھی دوسرے

کمرے میں چلا آیا ہے۔ نندی اچھا ہوا، تو چلی گئی۔ کم از کم وحشت کا یہ ننگا رقص دیکھنے سے تو بچ گئی تا ۔۔۔ شہر میں کرفیو لگا ہے۔ پولیس جیپ دہشت بھرا سائرن بجاتی سڑکوں پر دوڑ رہی ہے۔ بچے بوڑھے ہی سو گئے ہیں۔ چاروں طرف تاریکی کی حکمرانی ہے ۔۔۔ ایسے میں دروازے پر ہلکی سی تھاپ پڑتی ہے مگر دروازہ مضبوط آواز گونجتی ہے۔

"لکھی دروازہ کھولو ۔۔۔"

دروازہ کھولا جاتا ہے ۔۔۔ ملک زادہ کھڑا ہے ۔۔۔ کچھ چاہیئے ۔۔۔ کچھ ضرورت ہے۔۔۔ تم لوگوں نے کھانا کھایا ۔۔۔ بہو نے ۔۔۔ لڑکوں نے ۔۔۔ بچوں نے ۔۔۔؟

ملک زادے! ہم غدار ہو گئے۔ لکھی رو پڑا ہے۔ کل تک دیش کے نام پر جو سکھ اپنے چوڑے چکلے سینے میں دشمنوں کی گولیاں اُتار کر شہید ہو جایا کرتے تھے۔ آج وہی غدار ہو گئے ہیں ملک زادے۔

"گھبرامت لکھی! سب وقت کا کھیل ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ملک زادہ سبزیاں لے آیا۔ گھی، دودھ، تیل لے آیا ہے بچوں کو اُٹھا کر کھانا کھلایا جا رہا ہے۔

"میں جا رہا ہوں" ملک زادہ کے چہرے پر گھبراہٹ ہے "کمبختوں نے مجھے دیکھ لیا تو مجھے بھی غدار ۔۔۔"

بند دروازہ سے جیسے دبے پاؤں آیا تھا۔ ویسے ہی چلا گیا ملک زادہ۔ دور اندھیرے میں پولیس جیپ کا سائرن پھر گونج اُٹھا۔ ہرمیت بوکھلایا ہوا کہہ رہا تھا " ایسا کب تک چلے گا لکھی۔ کب تک گھروں میں یوں قید رہنا ہوگا۔ بزنس وغیرہ سب چوپٹ ہو گیا ہے۔

پولیس جیپ میں بیٹھ کر ہرمیت اور گرجیت دونوں اپنی لٹی ہوئی دکان دیکھ آئے تھے۔ ایک بھی کپڑے کا تھان باقی نہ تھا۔ گھر آ کر دھاڑیں مار کر رو پڑے تھے دونوں۔ لکھی نے سمجھایا تھا۔ نادان بچو، سکھ برادری کو تجارت کے منافع بخش اصولوں پر فخر رہا ہے یہ سوئی تاگے اور کپڑے کے ایک ہی تھان سے کئی کئی منزلہ عمارتیں کھڑی کر لیتے ہیں۔ بازوؤں میں دم رکھ بیٹے! گھبراتا کیا ہے، جو پونجی بینک میں پڑی ہے اسی سے بزنس شروع کر دے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"پہلے باہر تو دیکھ لینے دو لکھی۔ باہر کی فضا اچھی نہیں ہے۔ ہمارے لباس، ہمارے چہرے پر وطن سے غداری کی کالک پوت دی گئی ہے اور امید نہیں ہے کہ آنے والی صدیوں میں یہ کالک اپنے چہرے سے ڈھل پائے گی۔"

کانپ رہا ہے ہر میت، ایک نئے فیصلے کے ساتھ دکان تو ختم ہو ہی چکی ہے لکھی۔ بزنس ٹھپ پڑ چکا ہے۔ جن کی دکانیں بچ گئی ہیں ان کے بزنس پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ ہم اپنگو بنا دیئے گئے ہیں۔ ایکدم سے اپاہج۔ اب صرف ایک ہی جگہ بچ گئی ہے ہمارے لئے، یعنی پنجاب۔

پنجاب ـــــ دھک سے رہ گئے تھے لکھی، یعنی پھر ایک نئی ہجرت کی تیاری ... کچھ بولے نہیں اپنے کمرے میں لوٹ آئے پنجہ صاحب پر نظریں دوڑنے لگیں ... بوڑھی تقدیر میں کیا صرف ہجرت ہی لکھی ہے۔ پہلے لاہور سے آرہ، اور اب آرہ سے پنجاب ... پتہ نہیں، اور کتنی ہجرت باقی ہے۔

مہندر کور، نورا بہن، نوراں آنٹی اور امریندر کے خون میں سنے جسم سے ہوتا ہوا قصاب کا چابک پورے ملک پر برس گیا تھا۔ ایک ساتھ سب کے سب ذبح کر دیئے گئے تھے اپنی بھتری چھری سے لہولہان ـــــ پنجاب میں امریندر کی دی ونگت ودھوا پرتیا پر بھی تو ہے۔ پنجاب سے جڑی کتنی یادیں ہیں۔ مگر یہ شہر ... اس شہر کے لوگ ... ہر دہلا دینے والے کھٹکے کے ساتھ چپ چپ ہونٹوں پر انگلیاں رکھے دلاسہ دیتا ہوا ملک زادہ، ملک زادہ کے قصے سب پیچھے چھوٹ رہے ہیں۔ سب پیچھے چھوٹ جائیں گے ... ٹرین پتہ نہیں کہاں پہنچ گئی ہے۔ بس صرف ایک منظر آنکھوں میں لہلہا رہا ہے۔ صرف ایک منظر فیصلے کی قاتل گھڑی آ ہی گئی۔ بوڑھا لکھی نندی کا کشن اپنے سینے سے دابے زار و قطار رو رہا ہے۔ نہیں بیٹے، نہیں۔ یہ نہیں بکے گا۔ نہیں چاہیئے ایسی ہجرت۔ یہ کشن نندی کا بنایا ہوا ہے۔ نندی نے کتنے پیار سے صوفہ سیٹ کے لئے یہ کشن تیار کیا تھا۔ یہ نہیں بکے گا۔"

"لکھی ضد مت کرو، پورے صوفہ کا سودا ہوا ہے۔ ٹی وی، فریج سب بک چکا ہے۔ ہم اپنے ساتھ زیادہ سامان نہیں لے جا سکتے۔"

لکھی رو رہا ہے۔ کشن کے مخملی غلاف میں منہ دیئے ... یہ گھر نندی کا ہی تو ہے ...

نندی کے ہاتھوں سے بنایا ہوا . . . اس گھر کی اینٹ اینٹ میں نندی زندہ ہے۔ یہ سب بک جائے گا؟ بک جائے گا کیا؟ بک چکا ہے۔ نندی لاہور کو نہیں بھولی۔ آرہ میں لاہور کا گھر تعمیر کر لیا۔ اب پنجاب میں پھر لاہور کہاں سے لاؤں؟ نندی . . . کشن . . . بوڑھا لکھی ہانپ رہا ہے۔ جھرّیوں میں آنسوؤں کی بوندیں جذب ہو گئی ہیں۔ دونوں بہوئیں نم آنکھوں سے بوڑھے سسُر کو دیکھ رہی ہیں۔ مینو، اُرپنا دھاڑیں مار رہی ہیں۔ پرتیپال سسکیاں لے رہا ہے . . . ہرمیت چُپ ہے۔ گرجیت حساب لگا رہا ہے۔

سب سامان باندھ دیا گیا ہے باہر رکشہ لگا ہے۔ ملک زادہ پھولی ہوئی آنکھوں سے اپنے جگنو کو دیکھ رہا ہے اور اس کے گھر کے سب لوگ کھڑے ہیں . . . جاؤ لکھی . . . اپنے پرائے بن جائیں تو جانا ہی پڑتا ہے مگر اس ہجرت کے لئے میں تیار نہ تھا۔"

ٹرین پتہ نہیں کون سے سُرنگ میں داخل ہو گئی ہے۔ ہلکا ہلکا اندھیرا چھا گیا ہے۔

"کھانا کھاؤ گے لکھی؟" ہرمیت پوچھ رہا ہے۔

لکھی اُٹھ کر بیٹھ گئے ہیں۔ پتہ نہیں کیا پوچھ ڈالا ہے بیٹے سے . . . کونسا سوال، خود بھی یاد نہیں۔ مگر گرجیت کے چہرے پر ایک نیا رنگ اُگ آیا ہے۔ چہرے پر سلوٹیں بکھر گئی ہیں۔ گرجیت بتا رہا ہے۔

"لکھی، بس وہی ایک منظر جس میں تم سینے سے کشن کو دبائے سسک رہے تھے پتہ نہیں کیوں اس وقت ایسا لگا، اس ہجرت سے موت بہتر تھی۔"

گاڑی رُک گئی تھی۔ شاید کوئی جنکشن آگیا تھا۔

قوس (گیا) ۱۹۸۵ء
(کہانی، ہندی

◆◆

مت رو سالگ رام

جس وقت کامریڈ نور محمد اسپتال لایا گیا اس کی لگ بھگ آدھی سانس اکھڑ چکی تھی۔ جسم کا کوئی بھی حصّہ ثابت نہیں بچا تھا۔ دماغ کا آدھا گوشت تک باہر آگیا تھا۔ اس کے بچنے کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی اور جس وقت کامریڈ نور محمد کو اسٹریچر پر لٹا کر ایمرجنسی وارڈ میں داخل کیا گیا ۔۔۔ وارڈ سے باہر آسمان کو گھورتی ہوئی دو آنکھیں تھیں، دو عجیب سی آنکھیں ۔۔۔ نہ یہ آنکھیں سہمی تھیں، نہ ان میں خوف وہراس تھا، بلکہ ان آنکھوں پر آسانی سے کسی کو بھی پاگل ہونے کا شبہ ہو سکتا تھا۔

یہ سالگ رام تھا۔ درمیانہ قد، دُبلا پتلا جسم، اندر تک دھنسے ہوئے گال، سانولا چہرہ، پتلی پتلی ٹانگیں، ایک میلا سا کرتا پاجامہ اور آدھی گھسی ہوئی ہوائی چپل پیر میں ڈالے۔ سر کے بال اُلجھے ہوئے، داڑھی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے بدن میں تیزی سے حرکت ہوئی۔ دونوں ہاتھ آپس میں التجا کرنے کے انداز میں اٹھ گئے۔ گلے سے بھنچی بھنچی رونے کی آواز نکلی اور وہ آس پاس کھڑے لوگوں کے سامنے جا جا کر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

"تم لوگوں نے نور محمد کو کیوں مارا بھائی۔ میں سچ کہتا ہوں وہ مسلمان نہیں تھا میری بات کا یقین کرو لوگو ۔۔۔ وہ مسلمان نہیں تھا ۔۔۔ وہ مسلمان نہیں تھا ۔۔۔"

"چلو چلو ..." کسی نے جملہ کسا ... "کوئی پاگل ہے"

سالگ رام نے گھور کر دیکھا ... اندر سے نفرت کی ایک تیز لہر اٹھی ... اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو اسے لگا، اس کے منہ سے کتے جیسی بھینچی بھینچی چیخیں نکل رہی ہوں۔ دانت نوکیلے اور سخت ہو گئے ہوں۔ وہ کسی کی طرف بھی لپک سکتا ہے۔ کسی کو بھی کاٹ سکتا ہے ... اچانک اس کے گلے سے ایک گھڑگھڑاتی ہوئی چیخ نکلی۔ اس سے پہلے کہ دوسرے لوگ متوجہ ہوں، وہ تیزی سے بھاگتا ہوا گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔

(۲)

سالگ رام جس وقت باہر آیا، دل و دماغ میں تیز تیز آندھیاں اُمڈ رہی تھیں۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ سارے منظر صاف صاف تھے ... ایک چھوٹا سا گھر، چارپائی بچھی ہے۔ کھاٹ پر ننگے بدن اس کا باپ بیٹھا ہے۔ سر منڈا ہوا ہے۔ پیچھے بالوں کی ایک چھوٹی سی چٹکی لٹک رہی ہے۔

سالگ رام — برف جیسے سرد الفاظ اس کے کانوں میں اُترے ... اشنان کرلیا سالگ رام ... مندر ہو آئے ... پھر شلوکوں کا جاپ شروع ہوتا۔ بیچ بیچ میں رسوئی میں کھانا پکاتی اماں کو گالیوں کا تھال پروسا جاتا۔ کیوں رے ... ابھی تک کھانا نہیں بنا ... کبھی کبھی شک لگتا ہے کہ تیری برہمن کی جات بھی ہے کہ نہیں۔

اندر ہی اندر سُلگ اُٹھتا سالگ رام ... کچی مٹی کی ڈھلائی سے زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھ رہی ہوتی۔ اُٹھ کر وہ اماں کے پاس رسوئی میں جاتا۔ اماں کی روتی آنکھوں کو دیکھ کر سوچتا۔ بھگوان کی پُوجا ارچنا تو سب بیکار ہے، جب من ہی صاف نہ ہو۔ ادھر سارے میں نانک پانڈے زور زور سے اشلوکوں کے پاٹھ میں مصروف تھے۔ کہاں نانک پانڈے اور کہاں سالگ رام۔ یہ نام کا چکر بھی عجیب ہے۔ کسی بھی بات میں سمجھوتہ نہ کرنے والے بابو نے دھرم کی راہ میں اس کے اس ہریجن نام سے سمجھوتہ

کر لیا تھا۔ ہوا یوں کہ تلک پانڈے کو جب بہت دنوں تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تو کہتے ہیں ایک پہنچا ہوا سادھو ان کے دروازے آیا تھا۔ الکھ نرنجن ... سو بھکچھا مانگی اور تلک پانڈے کی فریاد سُن کر بولا۔ "گھبرا مت برہمن پُتر۔ بچہ ہوئے گا۔ لیکن اس کا نام ہریمن کے نام پر رکھنا۔ سمجھ گیا نا بچہ۔

نام میں کیا رکھا ہے۔ یوں سالگ رام نے اس ماحول میں آنکھیں کھولیں جب گھر کی ایک ایک شے میں دھرم سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ بابوجی صبح ہی صبح بھکچھا مانگنے نکل جاتے پھر دوپہر ڈھلے یا شام ڈھلے واپس آتے۔ جب سالگ رام تھوڑا بڑا ہوا تو وہ بھی شامل ہونے لگا۔

تلک پانڈے کے گھر سے چند فرلانگ کی دُوری پر ایک مسلمان کا گھر ہے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے ایک بار سالگ رام کو دیکھ کر اس کا ہم عمر ایک لڑکا زور سے ٹھہکا مار کر ہنس دیا تھا... لڑکے نے سالگ رام کے ننگے سر اور پیچھے لٹکتی ہوئی چٹیا کو دیکھ کر کہا۔

"تیرے سر پر پونچھ"

سالگ رام غصے میں بولا۔ "ملیچھ کہیں کا"

لڑکے کی ہنسی اچانک غائب ہو گئی۔ اس نے سالگ رام کو بڑے غور سے دیکھا۔ غصے میں بھرا ہوا سالگ رام دندناتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ گھر پہنچ کر چھوٹے سے آئینے میں اس نے اپنی شکل دیکھی۔ اور اس کے سامنے اس کی عمر کے وہ سارے لڑکے گھوم گئے جو چہرے مہرے اور پہناوے سے کیسے سُندر دِکھتے تھے... اور ایک وہ ہے — پیروں میں کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ۔ بار بار کھُل جانے والی دھوتی — جھولتا ہوا کُرتا، ٹنڈا سر، باہر نکلی ہوئی چٹیا۔ اسے گھن آ رہی تھی خود سے۔ نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ سب — جیسے اُسے ایک اچھی بھلی دُنیا سے کاٹ کر کسی قید خانے میں قید کر دیا گیا ہو۔ مگر کسی بھی طرح کی بغاوت کے لئے لفظ کہاں تھے اس کے پاس۔ لفظوں کے گھنگھرو تو تلک پانڈے نے پیدا ہوتے ہی اس کے ننھے منے پاؤں سے کھینچ کر توڑ دیئے تھے۔

سالگ رام جیسے آگ کی نرم گرم بھٹی میں تپ رہا تھا ۔ ۔ ۔ اس رات کافی دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ صبح ہونے تک وہ اپنی سوچ پر ایک نئے فیصلے کی مہر لگا چکا تھا ۔ ۔ ۔ تلک پانڈے ہمیشہ کی طرح سویرے اُٹھ گئے۔ نہا دھو کر پوجا ارچنا سے فارغ ہو کر آواز لگائی۔

سالگ رام!

سالگ رام جیسے اس آواز کے انتظار میں تھا۔ آگے بڑھا اور اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

آج سے میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔

کیا ۔۔۔! تلک پانڈے کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ اُسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ جس موئے نے کل تک بولنا نہیں جانا تھا آج انکار کا لفظ کیسے سیکھ لیا ۔ ۔ ۔ اور سالگ رام نے اٹک کر اپنی بات ایکدم سے سامنے رکھ دی۔

مَیں پڑھنا چاہتا ہوں۔ میں پڑھوں گا۔ مَیں یہ سب نہیں کروں گا ۔ ۔ ۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔

تلک پانڈے کے دماغ میں جیسے ایک ساتھ ہزاروں میزائلیں چھوٹ گئیں ۔ ۔ ۔ وہ اُٹھے، آگے بڑھے اور سالگ رام کے بدن پر تڑا تڑ طمانچوں کی بارش کر دی ۔ ۔ ۔

سالگ رام اب بھی روتے ہوئے چلا رہا تھا ۔ ۔ ۔ "مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ میں یہ سب نہیں کروں گا۔ نہیں کروں گا ۔ ۔ ۔ مجھے یہ چٹلی بھی اچھی نہیں لگتی۔ مَیں بال بڑھاؤں گا ۔ ۔ ۔"

پھر ایک لمبا عرصہ گذر گیا۔ تلک پانڈے نے جیسے ہار مان لی۔ بوڑھے ہو گئے تھے۔ انقلاب کے اس نئے تیور کے آگے جھک گئے۔ بڑی مشکل سے سالگ رام بی اے کر سکا۔ اس بیچ وہ دھیرے دھیرے دَھرم، عقیدے جیسی چیزوں سے کٹتا رہا تھا۔ اِدھر تلک پانڈے نے دُنیا کو خیرباد کیا۔ اِدھر سالگ رام زمانے کی ضرورتوں کو پُورا کرنے کے لئے لگ گیا۔ وقت بدلا تھا۔ زمین، پانی، مٹی، ہَوا، سب میں نفرت کے جراثیم گھُل مِل گئے تھے۔ اس نے بدلے بدلے بھارت کا کچھ 'انش' تو بابوجی میں تلاش کیا تھا اور کچھ

وقت کے تھپیڑوں میں دیکھا۔ یہاں تو نفرت کے اندھڑ تھے۔ بدبودار لفظ تھے اور مسجد مندر کے ہنگامے تھے۔ چہرے پر فرق کی ریکھائیں تھیں اور بدلی بدلی سی آنکھیں تھیں۔ سالگ رام، اشنان کر لیا۔ مندر ہو آئے... وہ برسوں پیچھے چھوٹی آواز کے زد میں ہوتا... اور سالگ رام یہ بھی دیکھ رہا تھا۔ محبت، میل ملاپ کی کہانیاں تاریخ کے پنّوں میں کھوتی جا رہی ہیں۔

ملک کے حاشیے پر جب سُرخ سُرخ خون پھیل جاتا تو سالگ رام اپنے اندر چھپے اس چٹیلی والے سالگ رام کا جائزہ ضرور لیتا جو نفرت کے اس اندھڑ سے بڑی مشکل سے باہر نکل سکا تھا۔ اب سالگ رام کی پارچون کی ایک چھوٹی سی دکان تھی لیکن شہر کی کلچرل سرگرمیوں میں بھی اس کی دلچسپی تھی۔

اس دن ایک مسلمان لونڈا اس کی دکان پر بیٹھا بتا رہا تھا: "ارے یار! اُسے جانتا ہے نا — نور محمد — سالا اپنے مذہب سے پھر گیا ہے۔ مذہب وذہب کو نہیں مانتا۔ عید بقر عید کی نماز بھی نہیں پڑھتا ہے"۔

"ایسا —!"

سالگ رام کو تعجب ہوا۔

مسلمان لونڈے نے دھیمی سرگوشیوں میں بتایا: "کسی سے کہنا مت — سالا، کمیونسٹ ہو گیا ہے۔ پکا کمیونسٹ۔

کمیونسٹ —!

ایک پل کے لئے سالگ رام کو لگا، جیسے اس نے کسی بھیانک حادثے کی کوئی خبر سُن لی ہو۔ مُسلمان ہے لیکن نماز نہیں پڑھتا۔ مسجد نہیں جاتا۔ کمیونسٹ ہو گیا ہے۔ بچپن کی ایک آدھ میلی سی تصویر آنکھوں میں مچل اٹھی۔ تیرے سر پر پونچھ — اور اس چٹیلی والے سالگ رام نے غصّے میں چڑھایا تھا... ملیچھ کہیں کا — مسلمان لونڈے کے چلے جانے کے بعد سالگ رام کو اچانک جانے کیوں نور محمد سے ملنے کی خواہش ہوئی۔ نور محمد کا نام کسی نہ کسی بہانے وہ برابر سُنتا رہا تھا مگر اس سے ملنے

مدّت ہوگئی تھی۔

اس دن وہ اپنے ایک دوست کے ہمراہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر گیا تھا۔ دفتر میں تھوڑی سی بھیڑ بھاڑ تھی اور اس بھیڑ میں رواں دواں بولتا ہوا اسے ایک شخص نظر آیا جس کے ہاتھ پر بینڈیج بندھا تھا اور جو ایک چھوٹی سی بچّی کا ہاتھ تھامے تھا۔ بچّی کسی انجانے خوف سے سہمی ہوئی تھی۔

سالگ رام نے بینڈیج والے نوجوان کو غور سے دیکھا اور وہ آدھی میلی سی تصویر اس کی نگاہوں میں ناچ اٹھی ۔۔۔ نور محمّد ــــ!

ہیلو کامریڈ ــــ ایک نوجوان نے نور محمّد سے ہاتھ ملایا۔ نُور محمّد نے بھی اپنا بینڈیج والا ہاتھ آگے کر دیا۔

یہ سب کیسے ہوا؟

نور محمّد کھلکھلا کر ہنس دیا۔ بہت ہی سادی ہنسی تھی اس کی۔

اس کے دوست نے بتایا ــ اپنا کامریڈ بھی عجیب انسان ہے۔ دُنیا میں جو بھی مرتا ہو، کسی کا بھی گھر جلتا ہو، کامریڈ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لو۔ آج تحریک سے وابستگی تو ایک بے معنی سی شے ہوگئی ہے دوست۔ نعرے بازی کی فضا میں سانس لینے والے بھلا زندگی کی گہرائی میں کیا اتر سکیں گے۔ کمٹ منٹ کیا ہوتا ہے، دیکھنا ہے تو نُور محمّد کو دیکھو۔ اپنے کامریڈ کو۔

سالگ رام نے ایک بار پھر عجیب نظروں سے نور محمّد کے ہنستے ہوئے چہرے کا جائزہ لیا اور ایکدم سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

سلام کامریڈ ــ دعا کرتا ہوں تمھاری صحت کے لئے۔

نور محمّد کھلکھلایا ــ کیوں؟ میری صحت کو کیا ہوا؟ اچھا بھلا ہوں۔

سالگ رام کو کمیونسٹ پارٹی سے کوئی لگاؤ تو نہ تھا مگر نُور محمّد کی وجہ سے پارٹی دفتر کے چکّر شروع ہوگئے تھے۔ اسے یہ آدمی اچھا لگا تھا۔ مکر و فریب اور بناوٹ کی دُنیا سے دُور ــ پھر نور محمّد کی زندگی کی کتنی ہی حقیقتیں اس کے سامنے روشن ہوتی چلی

گئیں۔ نور محمد کا بڑا بھائی ڈاکٹر تھا۔ ایک بہن پروفیسر ہے۔ باپ ایجوکیشن کے محکمہ میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھے۔ مگر خود نور محمد نے کسی کی بھی نوکری قبول نہیں کی۔ وہ چاہتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا۔ مگر اس نے پورے طور پر خود کو پارٹی کے نام پر وقف کر دیا۔ اب وہ ہے اور اس کی پارٹی ہے۔ سورس آف انکم بالکل ہی نہیں۔ اور وہ بچی۔ وہ چھوٹی سی بچی فساد کی دین ہے۔ شہر سے پچیس کلومیٹر دور گاؤں میں فرقہ وارانہ دنگے میں لڑکی کے گھر والے شہید ہو گئے۔ ریلیف کے کام کے لئے نور محمد بھی وہاں کا دورہ کرنے گیا تھا اور واپسی میں وہ اس لڑکی کا سرپرست بن کر لوٹا تھا۔ لڑکی ہندو تھی۔ جب کوئی اسے رکھنے کو تیار نہیں ہوا تو اُسے نور محمد نے اپنے پاس رکھ لیا۔ نور محمد نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ صرف اتنی تھی۔ کہ شادی کے بعد وہ پارٹی کو اپنا وقت دینے کے قابل نہیں رہے گا۔

پارٹی دفتر کے اسٹور روم کو اس نے ایک چھوٹے سے صاف ستھرے کمرے کی شکل دے دی تھی۔ سالگ رام اس دن اچانک وہاں پہنچ گیا تو کیا دیکھتا ہے --- دروازہ کھلا ہے۔ نور محمد لڑکی کو پڑھا رہا ہے۔

"پڑھو ـــ مسجد مندر دنگے کرواتے ہیں۔ خدا ایک ان دیکھی طاقت کا نام ہے اور جو چیز دیکھی نہیں گئی اس کا کیا جاننا"

پتہ نہیں وہ کتنی دیر سے اور کیا کیا تعلیم دے رہا تھا۔ سالگ رام اتنا ہی سُن سکا۔ وہ سَن سے تھا۔ چپل کی آواز سُن کر کامریڈ نور محمد چونکا۔ چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"ارے سالگ رام ـــ آجاؤ"

یکتا نے نمستے کی۔

سالگ رام نے شک کی نگاہوں سے نور محمد کو دیکھا۔

"یہ کیا پڑھا رہے تھے" اس کے لہجے میں ناراضگی تھی "کیا میں یہ سمجھوں کہ تم اس بچّی کے ذہن میں ایک نامعلوم سا زہر بھر رہے ہو۔

نور محمد نے ٹھنڈی سانس لی۔ نہیں۔ زہر باہر نکال رہا ہوں۔

سالگ رام نے دیکھا۔ نور محمد کا چہرہ اچانک بدلا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلیں۔

اسے سچ بتا رہا ہوں ۔ سچ سالگ رام ۔ اس لئے نہیں جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو ۔ ایک لاوارث بچی مجھے مل گئی ہے اور میں جس شیپ میں چھپا ہوں اُسے بدل سکتا ہوں ۔ دنگوں نے اس کے ماں باپ چھین لئے ۔ صرف یکتا ہی اس کی مثال نہیں ہے ۔ یہ مہمل سا سوال ہے کہ یکتا کا قصور کیا تھا، یا اس کے ماں باپ نے کیا گناہ کئے تھے ۔ موقع پرستوں نے موقع پایا گھر لوٹا ۔ گھر جلایا اور ایک بچی کو لاوارث بنا دیا ۔ یہ سب تمہارا مذہب کرا رہا ہے سالگ رام ۔ تمہارا مذہب ۔۔ تم جس کے ڈھول پیٹتے رہتے ہو ۔ مسجدوں کو آباد کرتے ہو ۔ مندروں میں شنکھ بجواتے ہو ۔ وہی تمہارا مذہب، جسے ان سیاسی بھیڑیوں نے مہرہ بنا رکھا ہے ۔

نور محمد کے چہرے پر آکروش تھا ۔۔ برسوں کی تہذیب، تمدن، سب کو تمہارے ان مذہبی جھگڑوں نے ختم کر دیا ۔ مثالی ملاپ و محبت، اب تو بس ایک کھوکھلا ڈھانچہ بچ گیا ہے سالگ رام ۔ جس میں مندر اور مسجد قید ہے ۔ ہم تم کہاں باقی ہیں ۔ یہ بچی، بچی ہے ۔ اس سے پوچھو تو مذہب کے نام پر اس کا چہرہ بدل جاتا ہے ۔ کل کو یہی حال رہا نا، تو نئی تہذیب کے بچے تمہارے مذہب سے نفرت کریں گے سالگ رام ۔ اور تم بس ترشول بھالے بجتے رہنا اور مسجدوں میں سر دیتے رہنا ۔

ہنس مکھ چہرے والے نور محمد کا پہلی بار اتنا خوفناک چہرہ دیکھا تھا سالگ رام نے ۔ اس بیچ صرف اتنا ہوا کہ یکتا اُٹھی ۔ ۔ ۔ ۔ پاس والے اسٹول پر رکھے گھڑے سے گلاس میں پانی ڈھالا ۔ پانی لا کر اس کے سامنے پیش کیا اور ایک طرف سمٹ کر چپ چاپ بیٹھ گئی ۔

سالگ رام نے سر اُٹھایا ۔ دھیرے سے کہنا چاہا ۔ "کامریڈ نور محمد ۔۔ سڑکوں پر اگر خون بہتا ہے تو اس میں مذہب کا کیا قصور ۔ سیاسی بھیڑیے اگر مذہب کو اپنا مہرہ بناتے ہیں تو دھرم کا کیا دوش ۔ تم اس بچی کے اندر زہر بھر رہے ہو ۔"

نہیں ۔۔ اس عمر کے تمام بچے بچیاں کل اسی نتیجے پر پہنچیں گے ۔ میں صرف اس سوچ کو کریدر رہا ہوں ۔

پارٹی دفتر میں لوگوں کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ اس لئے سالگ رام وہاں زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ لیکن نور محمد کی آواز بار بار اس کے ذہن پر شب خوں مار رہی تھی۔ کل اس عمر کے تمام بچے بچیاں ......

سالگ رام کی کنپٹی گرم ہو گئی۔

سالگ رام اس دن اپنی دکان میں گاہکوں کو سودا دے رہا تھا کہ وہی مسلمان لونڈا اشرفوا آدھمکا۔

نئی خبر سُنتے ہو۔

ترازو پکڑ کر غور سے دیکھتے ہوئے سالگ رام نے تھوڑی سی مُنڈی اُٹھائی۔ کوئی نئی خبر ہے کیا۔

بالکل تازی ۔۔ اشرفوا نے دھماکہ کیا۔ جانتے ہو نور محمد نے جس بچّی کو اپنے یہاں رکھا ہے، اُسے لینے اس کا چچا آیا تھا۔

پھر؟

بچّی نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ بات کافی بڑھ گئی۔ ہنگامے بھی ہوئے۔ پارٹی دفتر کا معاملہ تھا۔ سارے لوگ نور محمد کے ہی ساتھ تھے۔ چچا بکتا جھکتا لوٹ گیا۔ لیکن دھمکیاں دیتا ہوا گیا ہے۔ کہہ رہا تھا وہ سب کو دیکھ لے گا۔ سالے اُدھرمی ... ناستک ... کمیونسٹ بنتے ہیں سالے ... اپنا دھرم تو بھرشٹ ہے ہی ... بچّی کا دھرم بھی بھرشٹ کراتے ہیں۔

اشرف زور زور سے ہنس رہا تھا۔ تم دیکھ لینا۔ یہ سالا نور محمد اپنی کرنی سے مارا جائے گا۔ سالا مسلمان کے گھر پیدا ہو کر کیمونسٹ بنتا ہے۔ اماں کہتی ہیں کیمونسٹ کی قبر میں کیڑے پڑتے ہیں۔ مرتے وقت مٹّی بھی نصیب نہیں ہوتی۔

سالگ رام کسی اور ہی سوچ میں ڈوبا تھا۔ دکان پر چھوٹے سے ایک بچّے کو بٹھا کر وہ پارٹی دفتر نکل گیا۔ دفتر میں آج یکتا والا مدّا ہی زیرِ بحث تھا۔ نور محمّد نے یکتا کو پاس ہی بٹھا رکھا تھا۔

ایک بزرگ نے سمجھایا۔ بات بڑھانے سے فائدہ ہی کیا ہے نور محمّد۔ یکتا کو چچا

کے حوالے کردو۔

"میں چاچا کے پاس نہیں جاؤں گی" یکتا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

بزرگ نے بچی کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "بچی کی پرورش ایک مشکل کام ہے کامریڈ اور تمھیں کوئی تجربہ بھی نہیں۔ کئی دوسری دشواریاں بھی آسکتی ہیں"

"میں نہیں جاؤں گی" یکتا نے پھر چیخ کر کہا۔

نور محمد ایک جھٹکے سے اُٹھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی شکن تھی "بچی کی پرورش پارٹی کی دیکھ ریکھ سے زیادہ مشکل کام تو نہیں۔ یہ تجربہ ہی سہی۔ جب یکتا کہتی ہے کہ وہ نہیں جائے گی تو وہ میرے ساتھ ہی رہے گی۔

سالگ رام نے دیکھا نور محمد کی اس بات پر وہاں کھڑے کئی کامریڈوں کے چہرے بن گئے تھے۔ اس نے دھیرے سے سوچا۔ کیا اس لئے کہ وہ لڑکی ہندو ہے اور اسے چاچا کے پاس بھیجنے کا مشورہ دینے والے بھی۔ اس نے صرف دیکھا۔ اور دیکھتا رہا۔ کہا کچھ بھی نہیں۔ یکتا چاچا کے ساتھ کیوں نہیں گئی۔ کچھ ہی دیر بعد اس کا جواب نور محمد کی وہی پُرانی مسکراہٹ دے رہی تھی۔

سیدھی سی بات ہے سالگ رام۔ دنگے مسجد مندر کرواتے ہیں۔ لڑکی کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے۔ وہ میرے پاس خود کو زیادہ محفوظ سمجھتی ہے۔

لیکن دراصل معاملہ تو اب اُٹھ رہا تھا۔ جیسے دھیرے دھیرے یہ بات پارٹی دفتر سے نکل کر چہ میگوئیوں کا لباس پہننے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ بات پھیلنے لگی کہ ایک مسلمان شخص فساد میں مارے گئے ایک ہندو خاندان کی لاوارث بچی کی پرورش کر رہا ہے۔ بات آگے بڑھی تو پارٹی دفتر میں دھمکیاں پہنچنے لگیں۔ نور محمد اپنی بات پر اڑا رہا تھا۔ یکتا اپنی مرضی سے جانا چاہے تو اسے کوئی انکار نہیں۔

اور یکتا کا جواب تھا۔ اس کا چاچا ہندو تھا۔ مندر مسجد دنگے کرواتے ہیں۔ وہ نہیں نور محمد کے پاس رہے گی۔

لیکن نور محمد تو مسلمان ہے۔

نہیں۔ یکتا بس اتنا ہی جواب دیتی اور وہی پُراسرار قسم کی چپّی اوڑھ لیتی۔ نہ منہ پر ہنسی نہ چہرے پر ذرا بھی مسکراہٹ۔

پارٹی دفتر میں اس دھمکی کا اثر پڑا تھا۔

اگر دفتر غصّے میں آکر جلا دیا گیا تو پارٹی کا بہت نقصان ہو جائے گا۔ قیمتی کاغذات تک برباد ہو جائیں گے۔

کسی نے سمجھایا۔ نور محمد تمہارا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اگر بچّی کو اپنے پاس رکھنے کی ضد ہے تو پھر یہ جگہ خالی کر دو۔

نور محمد اچانک چونک اُٹھا۔ غور سے اس بوڑھے پارٹی ورکر کا چہرہ دیکھا۔ اتنے غور سے کہ بوڑھا کامریڈ ایکدم سے گھبرا گیا۔

نور محمد کے اندر جیسے کسی نے زبردست سنّاٹا بو دیا تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی پارٹی کے نام وقف کر دی تھی۔ اسی لیے اس نے کہیں سروس نہیں کی۔ شادی نہیں کی۔ ڈاکٹر بھائی اور ایڈوکیٹ بہن اس کا خرچ پُورا کرتے ہیں۔ یہ محتاجی تو اس نے صرف اور صرف پارٹی کے لئے ہی قبول کی تھی۔ لیکن وہ یہ کیا سن رہا ہے۔

ٹن..... ٹن.....

ذہن پر جیسے کوئی لگاتار ہتھوڑا مار رہا تھا۔ تم یہ جگہ خالی کر دو نور محمد۔ تم یہ جگہ چھوڑ دو... آؤ یکتا۔

نور محمد نے یکتا کا ہاتھ تھام لیا۔ بوڑھے پارٹی ورکر نے چونک کر نور محمد کی طرف دیکھا۔

"تم میری بات کا بُرا تو نہیں مان گئے کامریڈ"

"نہیں تو" نور محمد مُسکرایا۔ "بالکل نہیں۔ یوں بھی کرایہ لگا کر اس کمرے کے دو سو روپے آسانی سے مل سکتے ہیں۔ کیوں کامریڈ؟

پھر وہ رُکا نہیں۔ یکتا کا ہاتھ تھام کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

سالگ رام ایک بار پھر سَن سے تھا۔ دکانداری میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ کان بج رہے تھے۔ ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ نور محمد بھی تو مسلمان تھا ۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔ اگر انسان کہوں تو ۔۔۔۔ جسے آج کے دَور میں ایک سطحی، بے حقیقت سا لفظ بنا دیا گیا ہے ۔۔۔۔ انسان کیسے ہوتے ہیں؟ جیسے ہزاروں گھوڑے اس کی فکر کے میدان کو روندتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ ۔۔۔ ٹاپ ۔۔۔ ٹاپ۔

اس نے دیکھا۔ ایک کمرے کا ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ دو بچے بیٹھے ہوئے ہیں اور نور محمد ٹیوشن پڑھا رہا ہے۔ ٹیوشن پڑھاتے پڑھاتے اچانک اس نے نظر اٹھائی ہے۔ چونک گیا ہے۔

سالگ رام۔ کب آئے۔ بیٹھو۔ جاؤ لڑکو۔ بعد میں آجانا۔

لڑکوں کے جانے کے بعد نور محمد نے مسکراتے ہوئے یکتا کی طرف دیکھا۔ پھر وہی پرانی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولا۔

"پارٹی کے علاوہ بھی میری ایک ذمہ داری بڑھ گئی ہے یہ" اس نے یکتا کی طرف اشارہ کیا "ٹیوشن پڑھا رہا ہوں آجکل۔ کچھ آمدنی ہو جاتی ہے"

لفظوں میں درد سمٹ آیا تھا۔ لیکن اس درد کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم نام نے کر رشتوں کو بانٹ دیتے ہیں سالگ رام ۔۔۔ آخر میں یکتا کی پرورش کیوں نہیں کر سکتا۔ کیا صرف اس لئے کہ میرا نام مسلمان کا ہے ۔۔۔ زندگی کے مفہوم کو ہم اب بھی غلط راستوں میں تلاش کر رہے ہیں ۔۔۔ سالگ رام، ہماری غلطی یہی ہے کہ ہم ناموں میں جوہر تلاش کرتے ہیں اور پہچان ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

اس کے چہرے پر کرب ہی کرب تھا۔ یکتا کا معاملہ اب قانونی رنگ اختیار کر گیا ہے۔

پھر کیا ہوگا؟

نور محمد نے ایک بوجھل سانس لیا۔ مندر مسجد معاملے کی طرح اس میں بھی مذہب کا رنگ ہے ۔۔۔ ظاہر ہے تمہارا مذہب جیت جائے گا۔ میں ہار جاؤں گا۔

اس کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ طلوع ہوئی تھی۔ "تم رتھ یاترائیں نکالتے ہو... پد یاترائیں کرتے ہو۔ اور تمھارے رہنما نفرت کی روٹیاں تقسیم کرتے کرتے دلوں کی تقسیم کرتے جاتے ہیں۔ مجھے آنے والے وقت اور کل کے ہندوستان سے ڈر لگتا ہے۔ خیر چھوڑو۔ چائے پیو گے۔ پاس ہی ہوٹل ہے... میں چائے کا آرڈر دے کر آتا ہوں۔"

نور محمد نے چپل پہنی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ سالگ رام کے پاس اتنا موقع کافی تھا کہ تجسس کے پرندے کو آزاد کر کے وہ یکتا سے تھوڑی سی بات چیت کر سکے۔

یکتا۔ اُسے اپنی آواز بہت کمزور سی لگی۔

یکتا نے نظر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"یکتا! تم سچ مچ چاچا کے پاس نہیں جانا چاہتی؟"

"نہیں۔ وہاں سب دھرم کو ماننے والے لوگ ہیں۔" وہ کسی بزرگ کی طرح گویا تھی۔ "اور دھرم انیم ہے۔ دھرم دنگے کرواتا ہے۔ خدا ایک اَن دیکھی سچائی ہے۔ اور جو چیز دیکھی بھی نہیں گئی، اس کا کیا ماننا۔ ملک میں آج جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب دھرم کی دین ہے۔"

سالگ رام کو اس کی آنکھوں میں بڑھاپا اُترا ہوا لگا۔ اُسے لگا، جیسے یکتا نے اپنا سبق کچھ اس طرح یاد کر لیا ہو کہ اب کبھی نہیں بھولے گی... سالگ رام کے دل میں اتھل پتھل سی مچ گئی۔ اس کے لفظ گونگے تھے۔ وہ غور سے اس چھوٹی سی بچی کا چہرہ پڑھ رہا تھا جو اس لہولہان بھارت میں — وقت کے تھپیڑوں میں کھو کر — کہیں بہت زیادہ جوان اور تجربہ کار ہو گئی تھی۔

تبھی نور محمد دو چائے کا گلاس لے کر آ گیا۔ اس کا لہجہ خوفزدہ تھا۔ "چائے پی کر یہاں سے سیدھے گھر چلے جاؤ سالگ رام۔ بازار میں ٹینشن ہے۔"

یکتا نے خوفزدہ نگاہوں سے نور محمد کی طرف دیکھا اور نور محمد چائے کا گلاس کانپتے ہاتھوں میں اٹھا کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

(۳)

یہ کیسا ملک ہے ۔۔۔ یہ اس ملک میں کیا ہو رہا ہے ۔ کامریڈ نور محمد نہیں رہا ۔ وہ سرپٹ بھاگ رہا ہے ۔۔۔ پاگلوں کی طرح ۔۔۔ وہ جیسے اس موضوع پر کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا ۔ ذہن کی نسیں جیسے اچانک ہی کس جائیں گی ۔ پھر چٹخ جائیں گی ۔ لیکن کامریڈ نور محمد کا وہ زرد زرد سا چہرہ سالگ رام کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا ۔ ۔۔۔ ہر بار جیسے مسکراتا ہوا وہ شخص سانپ کی طرح کنڈلی مار کر سامنے ہی بیٹھ جاتا ہے ۔۔۔ مجھے دلوں کی تقسیم سے ڈر لگتا ہے سالگ رام ۔۔۔ آنے والے وقت اور کل کے ہندوستان کے تصور سے ۔۔۔

دُور تک خون کے چھینٹے ہی چھینٹے ہیں اور ان میں ایک لہولہان تصویر رنگی ہے کامریڈ نور محمد کی ۔۔۔

سالگ رام ۔۔۔ ذہن کے دروازے کو سرکش گھوڑے اب تک روندرہے ہیں ۔۔۔ سالگ رام ۔۔۔ تم ایک بے مروت ملک کی پیداوار ہو سالگ رام ۔

اور سالگ رام کو لگتا ہے ۔۔۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس ملک سے نفرت کرتا ۔۔۔ ہاں اس ملک سے ۔۔۔ زوردار نفرت ۔۔۔ ہاں اس ملک سے جہاں وہ جنما ہے ۔ ایک چھوٹا سا بچّہ جب کسی بات پر ناراض ہوتا ہے تو وہ اپنا سارا غصّہ اپنی ماں پر نکالتا ہے ۔ اسے بھی ملک پر غصّہ کرنے کا حق ہے ۔

اس کے وجود پر جیسے برف کی موٹی موٹی ڈسل رکھ دی گئی تھی ۔ شہر جب لہو کی سرخیاں لکھ رہا تھا ۔ یہی نور محمد تھا جو اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے لوگوں کو بچانے میں مصروف تھا ۔ قدم تھے کہ تھکتے نہیں تھے ۔ کس کی جان نہیں بچائی اس شخص نے ۔ مگر اسے کیا ملا ۔ سوائے ایک مسلمان سمجھے جانے کا ۔ اور کیا ملا اسے ۔ اور ریکھا ۔ ریکھا کو تو وہ اسی روز پارٹی دفتر چھوڑ آیا تھا ۔ شاید اس نے کسی انجانے

خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔

سالگ رام ---- سالگ رام ایک بار پھر بھیانک سنّاٹے میں ہے۔ اس کے گلے سے گھڑگھڑانے جیسی آواز نکلتی ہے۔ ٹھیک ویسی ہی جیسے کُتّے پتھر مارنے پر نکالتے ہیں۔

سالگ رام سرپٹ بھاگ رہا تھا اور بھاگتے ہوئے صرف ایک ہی سوال کی زد میں تھا۔

آخر دنگائیوں نے نور محمد کو کیا سمجھ کر مارا ہے؟ نور محمد مسلمان تو نہیں تھا۔ نور محمد کمیونسٹ تھا۔ پھر اسے مارنے والوں نے۔

وہ سرپٹ بھاگ رہا ہے۔

اور اب وہ پارٹی دفتر میں تھا۔ پارٹی دفتر میں ایک گہرا سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ بیچ میں دھیرے دھیرے سسکیاں بھرتی یکتا کھڑی تھی۔ قانونی پیچیدگیوں میں اُلجھی یکتا ۔ بہت ساری آنکھیں سوالیہ نگاہوں سے یکتا کو گھور رہی تھیں۔

اس کا کیا ہو گا ــــ؟ کہاں جائے گی یہ ــــ؟ کیا چاچا کے پاس؟

اچانک سالگ رام کے بدن میں حرکت ہوئی۔ اس نے غور سے یکتا کو دیکھا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

یکتا۔ تم میرے ساتھ چلو گی!

یکتا کی سسکیاں اچانک رُک گئیں۔ اس نے سالگ رام کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔

سالگ رام۔ مَیں تمھارے ساتھ چل سکتی ہوں ... اگر تم ... دھرم کو نہیں مانتے ہو۔

اور بہت سارے لوگوں کی طرح سالگ رام نے بھی دیکھا۔ یکتا کسی ٹیپ کی طرح شروع ہو چکی تھی۔

" دھرم افیم ہے۔ دھرم دنگے کرواتا ہے۔ خدا ایک ان دیکھی سچائی ہے ... اور جو چیز دیکھی نہیں گئی، اس کا کیا ماننا ... ملک میں آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے ... وہ ... "

سہیل، عصری آگہی ۱۹۹۱ء
ساپتاہک ہندوستان (ہندی) ◆◆

ہم خوشبو خریدیں گے

اسکول مہینوں بند رہا۔ شہر میں ہنگامے چلتے رہے۔ توڑ پھوڑ کی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ مستقل کرفیو لگا رہا۔ بچے اپنے گھروں میں بند رہے۔ کون باہر نکلتا؟ تھوڑی دیر کے لئے کرفیو ہٹتا تو لوگ راشن کی دکانوں پر جوق در جوق ٹوٹ پڑتے۔ اس درمیان شہر کے کئی علاقوں سے دنگوں کی خبریں آجاتیں۔ لوگ جلدی جلدی سامان لے کر گھر کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے۔ کرفیو کی مدت ایک بار پھر بڑھ جاتی۔

عرفی نے سوچا: "اب پڑھائی کا تو ستیاناس ہو ہی گیا۔ کتنے دن ہو گئے اسکول بند ہوئے۔ اب اسکول شاید کبھی نہیں کھلے گا۔"

مونا بھی یہی سوچتی تھی: "پہلے ممی ڈیڈی نہ پڑھنے پر کتنا بگڑتے تھے۔ شام ہوئی نہیں کہ بس پڑھنے بیٹھ جاؤ۔ اب کتنے دن ہو گئے کوئی پڑھنے کے لئے نہیں کہتا۔ ممی ڈیڈی کتنے گھبرائے گھبرائے رہتے ہیں۔ ہر وقت دروازہ بند۔ تھوڑی دیر کے لئے کرفیو ہٹتا ہے تو ڈیڈی دوڑ دوڑے سامان لانے جاتے ہیں۔ اس درمیان ممی کتنی پریشان رہتی ہیں۔"

"یہ کرفیو بہت بدمعاش آدمی ہے۔" مونا نے سوچا۔

دو چار روز سے کرفیو میں کچھ فرق آگیا تھا۔ اب صرف رات کو کرفیو لگتا تھا۔ مگر اسکول ابھی تک بند تھے۔ ڈیڈی کہتے تھے: "اسکول اب کھل جائے گا۔ تم لوگ کتابیں نکال لو۔ پرانے سبق

یاد کرلو۔"

"پرانے سبق؟" عرفی نے سوچا: مگر حشمت کیسے یاد کرے گا؟ اسے کون کہے گا یاد کرنے کے لئے۔ ڈیڈی بتا رہے تھے کہ حشمت کے پاپا مار دیئے گئے ہیں۔"

"ماسک تو بہت بنانے ہیں، مونا سوچ رہی تھی۔ مگر ڈیڈی بتا رہے تھے کہ نکہت کا گھر جلا دیا گیا۔ دکان بھی پھونک دی گئی۔ اب وہ لوگ کھائیں گے کیا؟ وہ تو پڑوسیوں نے پورے گھر کو بچا لیا، ورنہ سب مار دیئے گئے ہوتے۔"

پھر عرفی نے کتابیں کھول لیں۔ مگر پڑھنے میں اس کا دل نہیں لگا۔ گھبرائے گھبرائے ہوئے ڈیڈی کا خوف زرد چہرہ اس کی نگاہوں میں بس گیا تھا۔ "وہ تو کہو خدا نے ہماری مدد کی۔ پچھلے وقت کی کوئی نیکی کام کر گئی، ورنہ ہم کبھی محفوظ نہیں رہتے۔"

ایسا کیوں ہوا؟ گولیوں کے چلنے کی آوازیں دونوں بچوں کے ذہن میں ابھی تک بسی ہوئی تھیں۔ پھر کھڑکی سے ان دونوں نے آسمان میں دور تک پھیلے ہوئے دھوئیں کی لکیریں بھی کتنی ہی بار روتی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ ممی تو زار و قطار رو رہی تھیں۔ دیوالی بھی نہیں تھی، شبِ برات کے پٹاخے بھی نہیں تھے، مگر رہ رہ کر دھماکوں کی آواز دل کو دہلائے دے رہی تھی۔ دونوں نے سوچا: 'پاپا ٹھیک کہتے ہیں۔ پٹاخے بُری چیز ہیں۔ پٹاخوں سے آگ لگ جاتی ہے۔ اب ہم پٹاخے خریدنے کے لئے کبھی ضد نہیں کریں گے، مونا نے معصومیت سے، ممی سے کہا:

"ممی ہم، کان پکڑتے ہیں۔ پٹاخہ سچ مچ بُری چیز ہے۔ اب ہم کبھی نہیں چھوڑیں گے۔" ممی رو رہی تھیں۔ پاپا انھیں سمجھا رہے تھے: "یہ کیا نادانی ہے! پاگل ہو گئی ہو! ایسے موقع پر اللہ کا نام لیتے ہیں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ کے فضل سے کچھ نہیں ہوگا۔"

عرفی کو یاد ہے، گولیاں مستقل چھوٹتی رہی تھیں۔ کافی دیر تک۔

"چھی!" مونا نے کہا "اسی لئے ہم فلمیں نہیں دیکھتے گندے لوگ! گھر جلاتے ہیں آدمیوں کو مار دیتے ہیں راکشش ہو گئے ہیں۔"

"اور کیا، راکشش ہی تو ہیں۔ پاپا کہتے ہیں، یہ لوگ انسان نہیں۔ صرف شکلیں انسان جیسی ہوتی ہیں۔ یہ لوگ پورے راکشش ہوتے ہیں۔"

"پتہ نہیں گھر جلانے میں انھیں کیا ملتا ہے۔"

"یہ دنگے ہوتے کیوں ہیں؟"

معصوم ذہن پیچیدہ سوالوں میں اُلجھ جاتے۔ جواب کی تلاش میں دُور دُور تک کا سفر طے کرتے۔ پھر تھک کر لوٹ آتے۔ پتہ نہیں کیوں۔ پاپا کہتے ہیں، خوشبو کی ضرورت ہے ان تک پھیلانے کے لئے، ان کے اندر کا غبار نکالنے کے لئے۔

عرفی کو فخر ہوا کہ اُس کے پاپا شاعر ہیں۔ کتنی اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔

رات کو پڑوس کے ہاشم انکل آئے، صرف یہ خبر سُنانے کے لئے کہ کل سے اسکول کھُل جائے گا۔"

"کیا آپ اپنے بچّوں کو بھیجیں گے؟" انھوں نے پوچھا۔

عرفی نے پاپا کی طرف دیکھا۔ پاپا سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحوں کے بعد بولے۔ "اب فضا کیسی ہے؟"

"اچھی ہے بھائی! اسی لئے تو اسکول کھُل رہا ہے۔ آپ بھیجیں گے۔"

"عرفی تم جاؤ گے؟" پاپا نے اطمینان سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔"

مونا بھی آگئی تھی "ہاں پاپا۔ کتنے دن ہوگئے اسکول گئے ہوئے۔ دوستوں سے ملنے کی بڑی خواہش ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ہاشم انکل بولے "میں انشا کے لئے ڈر رہا تھا۔ عرفی اور مونا جائیں گے تو انشا کو بھی ساتھ بھیج دیں گے۔"

دوسرے دن انشا وقت پر تیار ہوکر آگئی۔ عرفی نے آہستہ سے مونا کے کان میں کچھ کہا۔ مونا نے انشا سے کچھ کہا۔ پھر تینوں چُپ ہوگئے۔

عرفی بولا "مونا، آخر تم تھرڈ کلاس میں آگئی ہو۔ جو کام ہم کرسکتے ہیں وہ تو ہمیں کرنا ہی چاہیئے۔"

انشا کلاس ٹو میں تھی، بولی "ہم سب لڑکیوں کو ملالیں گے۔"

مونا نے کافی دیر تک سوچنے کے بعد کہا "تم ٹھیک کہتے ہو۔ پیس مارچ سے سچ مچ فائدہ ہوگا۔ ابھی سینل وت بھی تو پدیا ترا پر نکلے تھے۔"

انشا جلدی سے بولی "ان کی لڑکی پریا بھی تو ساتھ تھی۔ سچ بڑا مزہ آئے گا۔"

اسکول کافی دن کے بعد کھلا تھا۔ کافی بچے آئے تھے۔ مگر عرفی نے محسوس کیا کہ بچوں کے چہرے پر ڈر کے آثار ہیں جو ٹیچر آئے تھے وہ بھی کچھ غم زدہ لگ رہے تھے۔

"سنجو سر مار دیئے گئے۔" ایک لڑکے نے بتایا "انھیں مسلمانوں نے مار دیا۔"

"حشمت کے والد کو۔۔۔" ایک لڑکا کہتے کہتے رُک گیا۔ پھر بولا "بے چارہ حشمت اب کبھی اسکول نہیں آئے گا۔"

"یہ راشدہ بی موٹی کہاں ہے؟" عرفی نے یاد کیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اسے معلوم ہوا کہ وہ جس محلے میں تھی، اُس محلّے میں کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ بی موٹی کا پورا گھر جلا دیا گیا اور پورے گھر والوں کو۔۔۔"

بچے دائرہ بنائے بیٹھ گئے تھے۔ ٹیچر بھی کہتے تھے کہ آج کلاس نہیں ہوگا۔ صرف حاضری لی جائے گی۔

بچوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اپنے پُرانے دوستوں کو یاد کر رہے تھے۔

"سنجو سر کی یاد میں شوک سبھا ہوگی۔ پھر اسکول بند کر دیا جائے گا۔" کچھ دیر بعد ورما سر نے مغموم آواز میں خبر دی۔

بچوں کے چہروں پر اُداس خاموشی سلگ رہی تھی۔ عرفی نے آہستہ سے پروگرام کے مطابق ایک بچے سے سرگوشی کی۔ بچے اب ایک دوسرے سے دھیمی آواز میں کچھ باتیں کر رہے تھے۔

"پیس مارچ۔۔۔"

"یعنی پدیاترا۔۔۔"

"شانتی کے لئے پدیاترا۔۔۔"

"سب کے ہاتھوں میں ایک ایک بورڈ ہوگا۔" عرفی کہہ رہا تھا "ہم ورما سر سے بات کریں گے۔ پھر خوشبو کا پیغام دیں گے۔" عرفی کو کچھ یاد آگیا "یہ چار لائنیں ہیں تے کل پاپا کی

ڈائری سے اتاری ہیں سنو بچو، سنو!"
اس نے گلا صاف کیا اور ہاتھوں کو لہرا کر پڑھنا شروع کیا؛
کاش کہ بہت سارے پھول ہوتے
اتنے
کہ ان کی خوشبو میں پوری دنیا میں پھیلا دیتا
مگر فضا میں تو راکٹ لانچر اور توپوں گولوں کی بُو بسی ہے
کاش کہ بہت سارے پھول ہوتے
جو ان توپوں اور ٹینکوں سے گزر کر
دہشت اور وحشت کی سرزمین کو خوشبو سے شرابور کر دیتے
"واہ وا!" نہاں نے تالی بجائی "کتنی اچھی بات ہے!"
"چاروں طرف جنگ کی باتیں ہیں۔ توپوں کی باتیں ہیں۔ مگر یہ راکٹ لانچر"
"یہ بھی ہتھیار ہے" ایک لڑکا اپنی جنرل نالج پر مسکرایا "پاپا اُس دن بوفورس کے بارے میں..."
"شی!" عرفی نے ہونٹ پر انگلی رکھی "ان باتوں کو سرِعام نہیں کہنا چاہیئے۔ پاپا کہتے ہیں، ایسی باتیں کہنے پر پولیس جیل میں بند کر دیتی ہے"
"مگر ہم کریں گے کیا؟" ایک بچے کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔
"ہم پھول توڑیں گے" عرفی نے سنجیدگی سے بتایا "اس کی اجازت ہم پرنسپل صاحب سے لیں گے اور اس کے لئے ورما سر سے بات کریں گے"
"پھر جب بہت سے پھول ہو جائیں گے تو..."
مونا کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔
ورما سر نے پیارے پیارے بچوں کی باتیں سنیں اور مسکرا دیئے "ٹھیک ہے بچو! خوشبو اچھی چیز ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج کے دور میں جہاں چاروں طرف دہشت گردی کا دور دورہ ہے، تم بچے خوشبو پھیلانے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔ ہم تمہیں پرمیشن

دلا دیں گے، مگر وعدہ کرو واپسی میں ہمیں رپورٹ دو گے"

ورما سر کچھ سوچنے لگے۔ اس وقت وہ کافی سنجیدہ لگ رہے تھے۔ بہت دیر تک وہ کسی خیال میں کھوئے رہے پھر پرنسپل صاحب کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

بچے باہر انتظار کر رہے تھے۔ اندر ورما سر کی پرنسپل صاحب سے بات چیت چل رہی تھی۔ بچوں نے جھانک کر دیکھا، پرنسپل صاحب بار بار 'نہیں' میں گردن ہلا رہے تھے۔ پھر بڑی مشکل سے انھوں نے 'ہاں' کر دی۔ ورما سر مسکرا رہے تھے۔ پرنسپل صاحب بھی مسکرائے۔ پھر دونوں کھڑے ہو گئے۔ بچے ایک قطار میں کھڑے تھے۔

ورما سر خوش تھے۔ وہ پرنسپل صاحب کو سمجھانے میں کامیاب رہے۔ پرنسپل صاحب شروع میں تو ان کی بات سنتے ہی بھڑک گئے تھے۔ مگر ورما سر نے انھیں سمجھاتے ہوئے بتایا تھا کہ پوری دنیا میں بچے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اب وہ اخبار نکالنے لگے ہیں۔ رسائل کے مدیر بھی بننے لگے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں انھیں دودھ پیتا بچہ سمجھ کر انھیں کچھ کرنے کی آزادی نہیں دی جاتی۔ یہی غلط ہے۔ آج پریکٹیکل ہونے کا زمانہ ہے۔ بچے اپنے طور پر سوچ رہے ہیں تو انھیں جانے دیجئے۔ ان کی معصوم مہم بہتوں کی آنکھیں کھول سکیں گی۔

"مگر زمانہ ۔۔" پرنسپل صاحب نے ہچکچاتے ہوئے کہا تھا۔

"زمانے کا کیا ہے۔ یہ رسک میں لیتا ہوں"

پرنسپل صاحب نے پھر پوچھا تھا "مگر اتنے سارے پھول ۔۔۔"

"ان کی جھالریں بنا دی جائیں گی۔ بچوں پر شہر میں ہونے والے ہنگاموں کا بہت اثر ہے۔ شاید ان کی کامیابی انھیں ان حادثوں سے دور لے جا سکیں"

"ٹھیک ہے" اب پرنسپل صاحب راضی ہو گئے تھے۔ پھر وہ باہر نکل کر بچوں سے کہنے لگے، "ہوشیار رہنا بچو ——— کنارے کنارے رہنا۔ تم پھول توڑ دو گے، لیکن کسی نے منع کیا تو ۔۔۔"

عرفی آگے بڑھ کر بولا "ہم انھیں بتائیں گے کہ پھولوں کی آپ سے زیادہ ملک ——— کو ضرورت ہے۔ ہم پوری دنیا میں خوشبو پھیلانا چاہتے ہیں"

"شاباش لڑکے!" پرنسپل صاحب کی آنکھیں نم تھیں "سنجو سر کو تم لوگوں کی یہ شردھانجلی کافی ہے۔ بس آج کے لئے یہ اسکول بند ہو رہا ہے۔ کل سے ۔۔۔"

بچے سنجو سر کی یاد میں دو منٹ کے لئے چپ کھڑے رہے۔ پھر اسکول بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی سب بچے پیس مارچ کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ کوئی کاپی پھاڑ رہا تھا۔ کوئی لکڑی چھیل رہا تھا۔ گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹے بعد بورڈ تیار تھے اور پوری تیاری مکمل تھی۔

"ہمارا پہلا پڑاؤ کہاں ہوگا؟" نہال نے جوش سے پوچھا۔

اسکول کے پاس ہی ڈاکٹر ہریش مہتہ کا گھر تھا۔ بچوں نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہیں چلا جائے۔ اُن کے گھر میں پھول کے بہت سے پودے تھے۔ بچے اکثر چھٹی کے اوقات میں وہاں پھول توڑنے جاتے، مگر بڑی بے رحمی سے بھگا دیئے جاتے۔ بچوں نے سوچا "یہ پیس کا معاملہ ہے۔ مہتہ انکل آج منع نہیں کریں گے۔"

بچوں کے ہاتھوں میں بورڈ چمک رہے تھے "ہمیں امن چاہیئے! شانتی چاہیئے!" نعرے لگاتے ہوئے یہ قافلہ ڈاکٹر انکل کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ڈاکٹر انکل کا گھر آ گیا۔ مگر دروازہ بند تھا۔ آنگن میں کتنے ہی پھول کھلکھلا رہے تھے۔

"ڈاکٹر انکل!"

پہلے ایک آواز گونجی۔ پھر ایک ساتھ کتنی ہی آوازیں فضا میں تیر گئیں۔ کچھ دیر بعد کھڑکی کھلی۔ اس میں سے ایک چہرہ نظر آیا۔ اس چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ ڈاکٹر انکل سیڑھیاں طے کرتے ہوئے بچوں کے سامنے تھے اور حیرت سے امن اور شانتی کے بورڈ پڑھ رہے تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ حیران ہو کر بولے۔

"چاروں طرف جنگ ہو رہی ہے نا انکل۔ ہم امن کے لئے نکلے ہیں۔ ہمیں پھول چاہئیں۔ بہت سے ہوں۔ اِن پھولوں سے ہم پوری دُنیا میں خوشبو پھیلائیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے" ڈاکٹر انکل مسکرائے۔ "لیکن بچو! پھول تو شاخوں پر اچھے لگتے ہیں۔ انھیں توڑنا بُری بات ہے۔ پھول توڑنے کا ارادہ چھوڑ دو۔ باقی سب ٹھیک ہے۔

ہیں مارچ کے نام پر اگر کچھ فنڈ کی ضرورت ہو تو ۔۔۔"

"نہیں ــــــ" عرفی تیز آواز میں بولا۔ "چلو، یہ ہمیں پھول نہیں دیں گے۔"

"ہاں چلو چلو" سارے بچے ایک ساتھ بولے۔

پھر وہ ورما سر کا مکان چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

تین گھنٹے گذر گئے تھے۔ ورما سر بچوں کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ پرنسپل صاحب بھی پریشان تھے۔ بچوں کو اب تک آجانا چاہیئے تھا۔ بچے کیوں نہیں آئے؟ بار بار چپراسی کو باہر بھیج کر وہ دیکھنے کے لئے کہہ رہے تھے اور چپراسی ہر بار یہی جواب دیتا کہ بچے کہیں نہیں دکھائی دے رہے ہیں۔

"بچے آرہے ہیں!" اس نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

ورما سر اور پرنسپل صاحب دونوں خوشی سے باہر نکلے۔ بچے گیٹ میں داخل ہو چکے تھے، مگر سب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے کسی کے ہاتھ میں کوئی پھول نہیں تھا۔

"پھول کہاں ہیں؟" ورما سر نے جوش اور تجسس سے دریافت کیا۔

"پھول؟" عرفی کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔

"پھول نہیں ملے" دوسرے لڑکے نے اس طرح کہا جیسے اب رو دے گا۔"

"پھول کوئی نہیں دیتا" ایک لڑکا سچ مچ رونے لگا۔

"اب جنگ ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا" ایک لڑکی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

اور پھر ــــــ ورما سر چونک گئے۔ مونا نے ایک کاغذ ان کی طرف بڑھایا تھا۔ سب بچے گردن جھکائے شکست کے انداز میں کھڑے تھے اور ورما سر حیرت سے اس چھوٹی بچی کی تحریر پڑھ رہے تھے: "ہم پھول نہیں توڑ سکے، ہم خوشبو نہیں لا سکے۔ اس کا حق بس ان کو ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کی مہک دور دور تک پھیلے"

ورما سر کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ انھوں نے سر جھکا لیا۔ امن کے پیغامبران بچوں سے کچھ کہنے کے لئے اب ان کے پاس بچا ہی کیا تھا؟

شمع۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء ◆◆

فنی لینڈ

(۱)

کوئی اَن دیکھا شہر کیسا ہوتا ہے، جس کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا ہو، بہت کچھ پڑھ رکھا ہو، پھر قسمت جب اسی شہر میں لے آتی ہے تو نئے سرے سے خود کو اس شہر میں جوڑتے ہوئے ایک دَم عجیب سا لگتا ہے۔ مجھے دلّی آئے ہوئے پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے۔ سُنی سنائی باتوں کا طلسم اب تک سینکڑوں بس کے اڈّوں تک گھومنے کے دوران ٹوٹ چکا تھا۔ معروفیت کی جو نازک سی ڈال میرے حصّے میں آئی تھی وہ فی الحال کے گزارے کے لئے تو کافی تھی لیکن اتنی کافی بھی نہیں کہ اپنی زندگی بھر کی ساتھی کے نام پر ایک کمرے والے کرائے کے فلیٹ میں ایک اور مصیبت لے آتا۔ جہاں صرف اُوپر والی چھت تھی اور کمرے میں بمشکل دو فولڈنگ بیڈ کا گزارا ہو پاتا ہو۔ جہاں آفس سے واپسی کے بعد مکان مالک کی شعلہ بار آنکھیں بڑی توجّہ سے میری جانب دیکھ رہی ہوتیں کہ آیا میں اکیلا ہُوں یا میرے ساتھ میرا کوئی دوست تو نہیں۔ دوست یار کی محفل کے لئے بھی یہ کمرہ موزوں نہیں تھا۔ مگر نیا نیا دلّی میں اپنے لئے آسائش کا اچھا بندوبست کیسے کرتا۔ ہاں اس قدر اطمینان مجھے ضرور تھا کہ یہ وہی دلّی ہے جو اپنے شہر میں ہر دَم جس کا نام میرے ہونٹوں پہ رہتا تھا۔ تب عمر کی نازک دہلیز ہوا کرتی تھی اور پرچوں میں چھپنے چھپانے کا ارمان موٹی موٹی کہانیوں سے بھرے لفافوں کے ہمراہ دلّی تک کا سفر طے کیا کرتا۔ دلّی تو مرکز تھا۔ تمام اچھے رسائل دلّی سے ہی تو نکلتے تھے۔ اکثر

دوستوں کے درمیان باتیں ہوا کرتی ہیں۔ یہاں کیا رکھا ہے ... کچھ بھی تو نہیں، اپنے آپ کو استھاپت کرنے کے لئے۔ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں سسٹم کے بارے میں اور پورے ڈھانچے کو لے کر اپنی جو فلاسفی ہے اس کے لئے دلی جانا ہی ہو گا۔ اس لئے کہ محض لکھنے اور چھپنے چھپانے والا زمانہ اب نہیں رہا۔ اب کچھ کرنے کا وقت ہے۔ کچھ کنکریٹ ورک ہونا چاہیئے۔

کبھی کبھی کوئی تخلیق واپس آجاتی تو سلیل قہقہہ مار کر ہنس پڑتا "یار بھاسکر مجھے کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ یونو (You Know) مجھے دکھ کیوں نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ میں تو دلی نہیں گیا مگر میری تخلیق دلی تک کا سفر طے کر کے واپس آرہی ہے۔"

پتہ نہیں اس کے پاگل قہقہوں میں کیا ہوتا۔ میں پھر سے بے مطلب گمبھیر بن جاتا۔ "کبھی کبھی لگتا ہے لکھنا ایک قرض بنتا جا رہا ہے۔ ایک بہت بڑی ذمہ داری۔ کبھی کبھی محض کاغذ سیاہ کرتے ہوئے دل پر چوٹ پہنچتی ہے کہ یہ وہ نہیں ہے جس کی آج پورے ملک کو ضرورت ہے۔ انتظامیہ کے سڑے گلے ڈھانچے کو، قائد کی تلاش میں بے سمت کسی بھی اونچی آواز کے آگے دوڑے جانے والی عوام کو .... پتہ نہیں کیوں لگتا ہے آج کا ادب ان سے کٹ کر چائے خانوں اور ہماری اپنی بے معنی گفتگو میں ہی پناہ لینے لگا ہے سدھاکر، بعض دفعہ میں قلم توڑ دیتا ہوں، اس لئے کہ جو چاہتا ہوں، وہ نہیں لکھ پاتا۔"

سلیل ایک ٹھنڈی سانس بھرتا۔ "ادب میں سائنسی نقطۂ نظر کی کمی محسوس کرتے ہو تم۔ وقت کے ساتھ یہ نظریہ تو آنا ہی چاہیئے کہ ہم عوام اور ملکی مسائل سے اتنے قریب ہو جائیں کہ قلم کی ضرورت کو حکومت بھی تسلیم کر لے۔"

"تمہاری نظر میں اتنا سمٹا ہوا ہے ادب کہ ادب کو چھوڑ کر سارے پتر کار بنتا اور صحافت کے میدان میں اتر آئیں۔ یا پھر سیاست کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں تھام لیں۔"

"ایسا میں نے نہیں کہا ... مگر بہت دور ... ایک خاص سطح پر میں کسی بھی پیشہ میں کوئی فاصلہ کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔"

"میں جانتا ہوں تم کہنا کیا چاہتے ہو ... کہتے ہیں تیسری جنگِ عظیم سب کو برابر کر دے گی ... شاید آئین اسٹائن نے کہا تھا، میں یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ تیسری جنگِ عظیم ایسے

ایسے نایاب اسلحوں سے لڑی جائے گی، ابھی جن کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے مگر یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ چوتھی جنگ کے لئے پھر تیر اور بھالے کا استعمال شروع ہو جائے گا ... تم سمجھ سکتے ہو سیلیل ... ترقّی کے نام پر ہم کہاں جارہے ہیں ... ایک بار پھر پاشان یُگ کی طرف "

"لٹریچر کو سچ مچ تبدیلی کی ضرورت ہے - ایک اہم تبدیلی کی —"

سیلیل گمبھیر ہو جاتا ... میری لگتا ہیں. بھی نئے نئے ڈائمنشن اور نئے نئے زاویے کی تلاش میں ٹیبل پر رکھے چائے کے گلاس پر اس طرح کوز ہو جاتیں جیسے آرہ کے چھوٹے سے چائے خانے میں بیٹھ کر میں ملک کا کوئی بہت پیچیدہ مسئلہ سلجھانے والا ہوں ... تبھی تو ہم سو کالڈ انٹلکچول لوگوں میں. بھی اسی طرح کی باتیں ہوا کرتیں ...

"مجھے حیرت ہوتی ہے سیلیل - ادب میں جن لوگوں نے اپنی خاص پہچان بنالی ہے وہ کیوں ادب کے کھلواڑ کرنے پر تلے ہیں - خود کو، تخلیق کو زمین سے جوڑنے کی کوشش کیوں نہیں ہوتی - مسائل سے آنکھیں چراتے ہوئے گل و بلبل کی باتیں کرنے سے پہلے سوچنا تو چاہیئے کہ ہم اسپیس ایج اور کمپیوٹر ایج کی پیداوار پولیوشن کو بھی اپنی سانس سانس میں اتار رہے ہیں - ایک جنگ ہے ہمارے چاروں طرف ... اصولوں میں، زندگی میں نبھائے جانے والے قاعدوں میں ... بیوروکریٹ اب تک جاگیردارانہ نظام کا چشمہ لگائے حقارت اور نفرت کا زہر اُگل رہے ہیں - اور سیلیل اس سے بھی بڑی ایک جنگ ہے ... تم جانتے ہو نا، بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگلتی رہتی ہیں ... ایک بڑے جنگ، بہت بڑی جنگ ہے جو ان چھوٹی جنگوں پر حاوی ہے ... ملکوں کے تناؤ کی، تیسری جنگ عظیم کے خطرناک مقصد کی طرف بڑھتی ہوئی ... ایک توازن سمجھتا ہوں میں انھیں ... پوری دُنیا کے مسائل کے جُوں کے توں پڑے رہنے کے لئے، سیاسی بازی گروں کو اپنی کرسی سلامت رکھنے کے لئے ... اور ہوتا کیا ہے سیلیل بس اتنا کہ چھوٹے جنگ کی بات بھول کر ہم اپنی ساری توجّہ بڑی بڑی جنگوں کی طرف مرکوز کر لیتے ہیں"

سیلیل کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میرے لمبے لمبے فلسفے پر سکڑ جاتیں ... پھر جیسے کنویں

کی گہرائی سے آتی ہوئی اس کی آواز میرے حصے میں آتی ۔ بھا سکر، تم صحیح ہو، تم ٹھیک سوچ رہے ہو ... ادب کو ہتھیار کے طور پر استعمال ہونا ہی چاہیئے ... جیسے پہلے بھی ادب عظیم عظیم انقلابات کی بنیاد ڈالی ہیں ... ویسے اب بھی ان تمام چھوٹی بڑی پہیلیوں کے حوالے سے ایک انقلاب کی ضرورت ہے ... تم نے مجھے بھی ایک نیا زاویہ دیا ہے ... میں اس سطح پر سوچوں گا ۔ ہوسکا تو مضمون بھی قلم بند کروں گا ۔۔"

چائے کے ساتھ ہی ہماری میٹنگ بھی ختم ہو جائے گی ۔

کیسی ہوتی تھیں وہ گفتگوئیں ... ہوٹل میں چلنے والی ہماری باتیں ۔ دراصل سب کی سب ہمارے بیکار ہونے کے نتیجے تھے ... اس سے زیادہ نہیں ... دہلی شہر میں پانچ مہینے سے زیادہ جھک مارتے ہوئے لگا تھا، ہم اس صدی میں آگئے ہیں جہاں بڑی بڑی باتیں ہوٹل اور چائے خانوں سے آگے نہیں بڑھتیں جہاں اصول اور مقصد کی باتیں بھی صرف لفظوں تک ہیں ... لفظوں تک ہم تمام جنگیں لڑ لیتے ہیں ۔ جیت بھی جاتے ہیں اور لفظوں سے الگ ...

نوٹ : یہ فنی لینڈ تھا جس نے مجھے یہ احساس کرایا تھا ... ایلس کو ونڈر لینڈ دیکھنے میں جو حیرت ہوئی ہوگی وہی حیرت مجھے اس جیتے جاگتے فنی لینڈ کو دیکھ کر ہوئی تھی ۔ یہ تمام معلومات محض اس لئے ہیں کہ فنی لینڈ میں آپ کو کچھ بھی عجوبہ نہیں لگے ۔ بلکہ سب کچھ پہلے سے دیکھا بھالا ... اس لئے کہ یہ فنی لینڈ ان محسوسات سے تعمیر ہوا ہے، ایک نوخیز عمر میں ہم آپ اپنی گفتگو سے جسے صدہا ہزار بار تعمیر کر چکے ہوتے ہیں ۔

(۲)

پھر ایسا ہوتا ہے جب انہی چھوٹے چھوٹے فلسفوں کو بہت بڑے کینوس پر دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے تو ان فلسفوں کے پر نکل آتے ہیں ۔ پھر اپنے شہر کی تمام اچھائیاں سوجاتی ہیں اور جیسے ایک سکنڈ میں اونچی پرواز کا پرندہ انتظامیہ اور پورے سسٹم کی

تبدیلی کی بات سوچتا ہوا مہانگری کی طرف اُڑ جاتا ہے ... دفتروں کے چکّر کاٹتے ہوئے یہ پرندہ میرے اندر کہیں سو گیا تھا اور فرسٹریشن کا کیڑا میرے جسم کی روحانی پرتوں کو کھرچ رہا تھا۔ شاید چھوٹے شہر میں خالی پن کے اوقات میں کسی تبدیلی کی بات ممکن ہے۔ یہاں کا مشینی آدمی تھکنے اور دوڑنے کے سوا کوئی فلسفہ نہیں پال سکتا۔ کوئی خیالی گھوڑے نہیں دوڑا سکتا۔ ایک چھوٹی سی نیوز میگزین کے دفتر کے ایک کمرے میں کرسی پر بیٹھا ہوا شاید تصورات کے کھنڈرات سے ماضی کی انہی سرگوشیوں کو چرا رہا تھا...

بھاسکر، یہ تخلیق کار سو تا جا رہا ہے...

بھاسکر، یہ تخلیق کار مر رہا ہے... یہ کسی میگزم اوپس کی تخلیق نہیں کر سکتا...

یہ مُردہ ہو رہا ہے بھاسکر... مشینی اور ٹھنڈا... اور تھکا ہوا... اور بوجھل... اور ناکارہ...

مگر نہیں... انت کا بھی کوئی انت نہیں ہے... اور انسان تو سچ پوچھئے انت کی منزلوں کا مسافر ہے۔ اِدھر بھٹکا اُدھر بھٹکا... اِدھر چلا اُدھر چلا... جسے منزل سمجھا وہ کچھ دُور مزید لے گئی... جہاں ٹھہرا وہاں سائبان نہ تھا۔ جہاں سائبان تھا وہاں ٹھہرا نہیں... تو انت کے اس مسافر کو بھی ان زندہ دل قہقہوں کو سُن کر چونک جانا پڑا جو ایڈیٹر کے بند کیبن سے جھٹک کر باہر آ رہی تھیں...

مَیں نے اپنے ساتھی سب ایڈیٹر سے دریافت کیا "یار، یہ ایڈیٹر کے کمرے میں اس قدر زور سے کون ہنس رہا ہے...؟

"تم نہیں جانتے۔ رام سروپ بھٹناگر صاحب ہیں"

دوست نے میری طرف دیکھا۔ پھر کمپوزنگ سے آئی ہوئی گیلیوں پر ریڈنگ کے لئے آنکھیں دوڑنے لگیں... رام سروپ... شاید ذہن پر بہت زور دینے کی ضرورت نہیں پڑی... صحافت کی دُنیا کا کوئی آدمی اگر انھیں نہ جانتا ہو تو شاید یہ اس کے پیشے کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ کچھ اور سوچتا وہ زندہ قہقہوں کا آدمی میرے سامنے تھا۔ اور اُن کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ بے فکری، آزاد، بڑے بڑے بال کندھوں تک پھیلے ہوئے

رنگ اُڑی ہوئی نیلی جینس اور کھادی کا کُرتا پہنے ... آنکھیں کچھ سوچتی ہوئی۔ میرے سامنے آکر بھی لگتا تھا جیسے اپنے اندر ہی اُتری ہوئی ہوں ...

"ہلو ..." رام سوروپ نے میری طرف ہاتھ بڑھایا ...

"بھاسکر ۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

رام سوروپ جی نے اپنا نام بتانا چاہا۔ میں نے روک دیا" نا ... نا ... میں جانتا ہوں آپ کو اور آپ کو کون ..."

ایک قہقہہ لگا تھا۔

انھوں نے میرے دوست پیوش کو دیکھا" کیوں پیوش۔ اسے منڈی ہاؤس لاؤ کبھی۔"
وہ اب بھی میری آنکھوں میں جھانک رہے تھے ... وہی قہقہوں والے انداز میں "کبھی منڈی ہاؤس گئے ہو۔ تروینی، شری رام آرٹ سینٹر، ہماچل پردیش بھون، فکّی آڈیٹوریم، ۳۵۔ فیروز شاہ ... وہاں کے لوگوں سے ملے ہو"

"نہیں ۔"

"نہیں؟" رام سوروپ جی ٹھٹھا کر ہنسے ..." پور فیلو۔ تب تم نے دلّی گھومی کہاں ... دلّی کی تمام مغلیہ اور حسین عمارتوں سے کہیں زیادہ عجوبہ شے ہے منڈی ہاؤس ... یہاں تم انوکھا کلچر دیکھوگے ... کبھی شام میں آنا ... میں وہیں مل جاؤں گا ... یوں بھی دہلی کے تقریباً تمام انٹلکچول" وہ تھوڑا ہنسے تھے ..." تمہیں وہاں مل جائیں گے ... آنا ..."

سوروپ جی نے پھر قہقہہ لگایا ..." بائی دوے ان سے ملو ... شیا ملا ... فری لانسنگ کرتی ہیں ... منڈی ہاؤس میں آجکل کافی مقبول ہو رہی ہیں ... کئی ٹی۔ وی سیریل بھی کرنے والی ہیں ... کتنے ہی پلے کر چکی ہیں۔ ابھی دو دن بعد ہی منظر تھیئٹر میں ان کا ایک پلے ... ... کیا ہے شیا ملا ..."

شیا ملا نے جیسے ذہن پر تھوڑا سا زور ڈالا ..." وہ شیکسپئر پر ہم لوگ سیریز کرنے جا رہے ہیں "

شیا ملا نے بے دلی سے میری طرف ہاتھ بڑھایا ..." نام تو جان ہی گئے ہو گے ... پھر بھی۔

... شیا ملا ..."
"ویہا سکر ..." میں بھی کچھ ٹھنڈا سا تھا اور بیزار ...
" ہیو اے وزٹ ٹو سی مائی پیلے ...؟ "
" آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ ..." میں مُسکرایا ...
سوروپ صاحب کے جانے کے بعد پیوش ٹھٹھا کر ہنسا ..". تو جناب منڈی ہاؤس کے چکّر اب آپ بھی شروع کرتے جا رہے ہیں ..."

"کیوں ؟ "
پیوش پُرانے زمانے کا آدمی تھا، دھیرے سے بولا ..". پتہ نہیں کیوں مجھے وہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا جیسے سب ایک بھتو پی ہوئی اور پچپار کتا نجھار ہے ہوں ... وہاں سب کچھ زندگی سے اتنا کٹا لگتا ہے کہ ..." اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ..". تم چھوٹے شہر سے آئے ہو ... میری طرح ... مجھے دس سال ہو گئے ... تمھیں پہلے دن ہی یہ تجربہ ہو گا۔ گمبھیر سے گمبھیر مسائل کس طرح چائے کی چسکیوں میں اُڑا دیئے جاتے ہیں ..."
"تمھیں کوئی خراب تجربہ لگتا ہے ..."
یہ بات میں نے بولا نہیں ۔ مگر حقیقی طور پر اس پُورے کمپلکس کو لے کر میں ایک سرور جیسے نشہ میں ضرور ڈوب گیا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ دُوردرشن کا مرکز خاص ہونے کی حیثیت سے بمبئی والوں کو اور فلم انڈسٹری کے زیادہ تر لوگوں کو اس چھوٹے پردے کے گلیمر کے خیال سے یہاں بھی دوڑنا پڑتا ہے ... اور یہی گلیمر اور اس سے جڑے لوگوں کو جاننے کا خیال مجھے اُس فنی لینڈ میں کھینچ کر لے گیا تھا۔

(۴)

پہلے دن شاید کسی کو وہاں کوئی عجوبہ نہیں لگے ... وہی دلّی شہر کی عام رفتار کی زندگی۔ مگر پہلے ہی دن آس پاس گھوم رہے فنکاروں کو نزدیک سے دیکھنے پر منڈی ہاؤس کلچر کے نئے پنا کا احساس بخوبی ہو جائے گا۔ شری رام آرٹ سنٹر کے دروازے پر اچانک مجھے ٹھٹھک جانا پڑا۔ ایک نوجوان لڑکی بے فکری سے اپنے بوائے فرینڈ سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس بات کو اگر میں بہت

زیادہ اہمیت دُوں تو ہو سکتا ہے، آپ مجھ پر الزام لگائیں کہ مَیں چھوٹے شہر سے کبھی باہر نکلا ہی نہیں ... مگر ایسا نہیں ہے ... مَیں لڑکی کے ہونٹوں سے قصداً صرف ایک لفظ سُن کر چونکا تھا ... فری سیکس ...

دونوں اب بھی زمانے سے بے نیاز تھے۔ کتنی ہی آنکھیں گھور رہی تھیں۔ مگر زیادہ تر لوگ جو اِدھر اُدھر بیٹھے تھے یا گروپ کے ساتھ کھڑے تھے، وہ خود میں مست تھے۔ وہ لڑکی ... اُس میں جو خاص بات مجھے نظر آئی ... وہ تھی ... شاید اب آپ مجھے گندی ذہنیت والا آدمی قرار دیں۔ مگر معاف کیجئے گا، ایسا سوچ کر آپ میری فطرت پر ظلم کر رہے ہیں ... تو اُس لڑکی نے اندر شاید بُرا بھی نہیں پہن رکھا تھا ... اور اس کے بال بھی شانوں پر آوارہ چھترائے ہوئے تھے۔ پیر میں ہوائی چپّل تھی۔ دونوں گیٹ کے دائیں طرف چھتنار درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر ان کو دیکھا کرتا ہوا میں وہیں کھڑا رہا۔ ایسا کرتے ہوئے مَیں پُورا پُورا اپنی آنکھوں میں اُس لڑکی کو بسا لینا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کن جذبوں کے تحت ...

شری رام آرٹ سینٹر کے اندر کتاب کی دُکان کے پاس کھڑے تھے رام سوروپ بھٹناگر کچھ موٹی موٹی کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیکھے جا رہی تھیں۔

اچانک آنکھیں ٹکرائیں اور پھر وہی قہقہہ ... "آ گئے ..."

ایک ہاتھ میں کتاب ... دوسرا ہاتھ بڑھا بھٹناگر صاحب کا ... پھر دائیں آنکھ دبی ... "کچھ ہی دیر میں یہاں کا اندازہ تو ہو گیا ہو گا ... کہتے ہیں ایک بار یہاں کا چکر شروع ہو جائے تو ... پھر زندگی بھر چلتا رہتا ہے۔

"وہ لڑکی کہاں ہے ..." مَیں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کون شیاملا ..." سوروپ صاحب ہنسے۔ "بھائی دُنیا میں ایک مرد مَیں ہی تو نہیں ... کل میرے ساتھ تھی۔ آج کسی اور کے ساتھ ہو گی ... ارے یہ رنگ کرمی لوگ ہیں۔ تعلقات بڑھیں گے نہیں تو چانس کیسے ملے گا۔ انہی میں سے تو کوئی آلوک ناتھ، نصیر الدین شاہ، انیتا کنور اور راج ببّر بن کے نکلتے ہیں ..."

"ایک منٹ ذرا ٹھہرو ..." سوروپ صاحب نے جاتے ہوئے ایک نوجوان کو آواز

لگا ئی..." ارے امرت..."

نوجوان نے دائیں طرف والے ڈرامے کے کارڈ سے نگاہ ہٹا کر آواز کی جانب دیکھا۔ وہ اپنی کچھ ہم عمر لڑکیوں میں گھرا تھا۔ سوروپ صاحب نے میرا ہاتھ دبایا "۔ ابھی ایک تماشہ دیکھنا..."

"کوئی پلے ہے کیا؟" سوروپ صاحب نے پوچھا۔

"ہاں۔ بس ساڑھے سات میں شروع ہو جائے گا... کچھ کارڈ فاضل ہیں میرے پاس۔ آپ دیکھیں گے!"

"تم دیکھو گے بھاسکر؟"

"جی..."

"دیکھنا ہو تو..."

"نہیں آج نہیں۔ آج..."

"کوئی بات نہیں..." سوروپ جی نے پھر نوجوان کو دیکھا "۔ کون سا پلے ہے..."

"بینچ..." نوجوان نے آواز کو بھاری بناتے ہوئے کہا "۔ بہت شاندار پلے ہے۔ ایک افریقن ایک بینچ پر سویا ہوا ہے...... ایک سفید پولیس اُسے وہاں سے ہٹانا چاہتی ہے... اس لئے کہ پارک میں بینچوں پر اس طرح کے سیاہ فام نہیں سو سکتے۔ اپارتھیڈ ڈسمنٹلنگ کا مسئلہ ہے... آرٹسٹ بھی اچھے ہیں..."

جیسے امرت کو اچانک کچھ یاد آگیا ہو "۔ ارے میں تو آپ کو ملانا ہی بھول گیا یہ سب میری دوست ہیں۔ ارچنا پورن۔ کلپنا پوددار... ریتا... شنا..."

الگ الگ پریچے کرانے کے بعد۔ بڑے عجیب انداز سے امرت نے گھڑی دیکھی...

"تب کہو... کہیں کچھ کام تھا" سوروپ جی مسکراتے ہوئے بولے۔

"ارے میں تو آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔ ایک فرانس کی پارٹی پھنسی ہے... میرا پرانا یار تھا۔ کل اتفاق سے ملاقات ہوئی تو بولا وہ ایک اچھی سی فلم بنانے میں انٹرسٹیڈ ہے۔ کہنے لگا، ڈائرکشن تمھارے ذمّے ہیرو بھی تم... دوسری کاسٹ بھی تمھیں ہی سائن

کمائی ہوگی۔ پروجیکٹ بڑا ہے۔۔ جگہ بیرونی کا ہے۔۔۔" امرت مسکرایا۔

"ان میں سے ہی کسی کو لے لو نا۔"

"نائس آئیڈیا" شاید ارچنا پوددن تھی۔۔ بابب ہیئر کو پیشانی کے دوسری طرف ڈالتی ہوئی بولی۔۔" میں تو خود ہی کہہ رہی ہوں امرت سے۔"

"ان کا ایکسپیرینس۔۔۔"

"ایکسپیرینس مائی فٹ۔۔" ریتا پوددار نے اپنی سینڈل ہلکی ناراضگی کے ساتھ زمین پر پٹخی۔

"او۔کے۔۔۔ او۔کے سر۔۔۔ چلتا ہوں۔۔۔ پھر کبھی۔۔۔ وقت ہو چلا ہے۔۔۔ نہیں تو آئیے۔۔۔"

"نہیں تم دیکھو۔ پھر سہی۔"

امرت لڑکیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا تو دھیمی ہنسی سوروپ جی کے ہونٹوں سے نکلی۔"اب انگلش بولنے لگا ہے سالا۔ کل تک جب بنارس سے آیا تھا تو انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے انہی گلیاروں میں جھینپا جھینپا کھڑا رہتا تھا۔"

"یہ فلم بنا رہا ہے۔"

"فلم" سوروپ جی اس طرح ہنسے جیسے میں نے کوئی لطیفہ جڑ دیا ہو۔" دھت تیری کی۔ امرت اور فلم۔۔۔ اور وہ فرانس کی پارٹی۔۔۔ یہی چیزیں یہاں غور کرنے والی ہیں بھاسکر۔ کل تک یہ لونڈا ہر جان پہچان والے سے پیسہ مانگتا چل رہا تھا۔ پہلے یہ بھی تمہاری طرح ایک میگزین میں تھا۔ ان رنگ کریموں اور یہاں کے گلیمر نے اسے وہاں سے استعفیٰ دلوا دیا۔ سوچا تھا کہ ایک ہی چھلانگ میں بمبئی پہنچ جائے گا۔ اب بے کار ہے تو لڑکیوں کو لے کر گھوم رہا ہے۔"

"تو خرچ۔۔۔"

"ایکدم نادان ہو تم بھی یار۔ فلم بنا رہا ہے نا۔ خرچ تو لڑکیاں کریں گی۔" رام سوروپ نے کتابیں جمع کر کے رکھ دیں۔ "آؤ کینٹین میں بیٹھتے ہیں۔ چائے کافی پیتے ہیں۔ تم بور تو نہیں ہو گئے۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ دراصل یہاں میں صرف آپ کی دعوت پر نہیں آیا بلکہ نئی چیزیں اور نئی باتیں ہمیشہ مجھے اپنی طرف کھینچتی رہی ہیں۔ اب اسے کیا کہئے گا کہ دلّی میں لال قلعہ سے اچھا مجھے پرانا قلعہ لگتا ہے"۔ "ویری گڈ۔ سوروپ جی دل کھول کر ہنسے۔" "تم تو پہلے سے ہی اس کلچر میں رنگے ہوئے ہو۔"

باتوں باتوں میں آخر انھوں نے میری بھی کھنچائی کر دی تھی۔

کینٹن کا ماحول بھی وہی تھا۔ اِرد گرد بیٹھے ہوئے لوگ فلسفیانہ گفتگو کا جھاگ چھوڑ رہے تھے۔ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں سگریٹ کے مرغولے اُڑا رہے تھے۔ پیشانی پر اَن گنت لکیریں پڑی ہوئیں۔ لباس سے، باتوں کے انداز سے کسی کو بھی سمجھ پانا مشکل تھا۔

"کہاں دیکھنے لگے۔ بیٹھو۔" سوروپ جی محبت سے بولے۔

خالی ٹیبل کے آمنے سامنے ہم بیٹھ گئے۔ سوروپ جی نے دو کافی کا آرڈر دے دیا۔ اس کے بعد شاید وہ شناسا نظروں کو دیکھ رہے تھے۔ پاس کے ٹیبل سے کوئی بلند آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ ملی جلی آوازوں میں نقرئی گھنٹیاں بھی شامل تھیں۔ مَیں نے نظر گھمائی۔ بیگی اور چوڑے آستین والی ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہنے، دھوپ کا چشمہ لگائے نوجوان نے مازا کی پوری بوتل ایک سانس میں گلے سے نیچے اُتار لی تھی۔ اُس کے بغل میں ایک افریقی تھا۔ افریقی کے دائیں بائیں دو دہلی کی لڑکیاں... سگریٹ کا دھواں چھوڑتی ہوئی... ٹھہر کر ایک آواز اُبھری... منوج... وہ تمھیں منوہر شیام جوشی نے بلایا تھا، اس کا کیا ہُوا۔

"یار وہ 'بنیاد' کے بعد ایک نیا سیریل کر رہے ہیں۔ ان کی خواہش تھی کوئی اسپیشل کیریکٹر مَیں بھی کرتا۔۔"

"تو کر لیتے۔۔" لڑکی سنجیدہ تھی...

منوہر شیام جوشی اور 'بنیاد' کی بات پر مَیں بھی چونک گیا تھا۔ اب مَیں غور سے اُس لڑکے کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جو پیشانی پر آوارہ چھترائے بالوں کو ہٹاتا ہوا کہہ رہا تھا...

"نہیں یار تم سمجھتی نہیں ہو... مَیں تھیٹر کا آدمی ہوں... فلم لائن میں تھوڑا سا انٹرسٹیڈ ہوں۔ وہ ابھی جو انٹرنیشنل فلم سیمینار ہوا تھا... منی کول... شیام بینگل...

اتپلیندو چکرورتی، سارے کے سارے مجھ سے اپنی فلم میں کام کرنے کو کہہ رہے تھے۔ ایس ایم سنجو، گوتم گھوش نے بھی مجھے آفر دیئے۔ مگر۔۔۔" اب اس نے ہوا میں اپنے ہاتھوں کو ہلا کر کندھے کو جنبش دی تھی ۔۔۔ تھیٹر کے آدمی کو بس تھیٹر ہی پسند ہوتا ہے۔ فلمیں، سیریلیں، انٹرٹینمنٹ کے پوائنٹ آف ویو سے بنتی ہیں، تھیٹر تھاٹ سے میل نہیں کھاتیں۔" نوجوان کے چہرے پر آکروش اُمڈ آیا تھا۔ جذباتی طور پر میرے اندر بھی کہیں ہلچل مچی تھی۔

"رعب میں آگئے" سوروپ جی نے میری کیفیت پر تنقید کی "ایسے بھاشن تمہیں یہاں روز ہی سُننے کو ملیں گے ۔۔۔ یہاں سب کو منوہر شیام جوشی بلاتے ہیں۔ سب ہی بنیادی جیسے سیریل کو ٹھکراتے رہتے ہیں۔ منی کول اور شیام بنیگل سب کے دوست ہیں لیکن مجھے تمہاری کیفیت میں مزہ آرہا ہے۔ یہ جو تم ہر وقت چونکے رہتے ہو ۔۔۔ اس سے میری تفریح ہو رہی ہے ۔۔۔"

وہ بہت آہستہ سے بولے۔ میں نے پھر غور سے دیکھا۔ افریقن شاید کچھ کہہ رہا تھا۔ لڑکی زور سے ہنس رہی تھی۔ اچانک سوروپ جی نے دائیں طرف بیٹھے کسی شناسا چہرے کو دیکھ لیا۔ اُن کی آنکھیں چمکیلی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک تھی ۔۔۔ میں نے نگاہ اُٹھائی۔ ۔۔۔ چمکتی ہوئی شفاف اُجلی دھوتی اور گیروے رنگ کا کرتا پہنے، ہلکی داڑھی بڑھی ہوئی۔ ۳۵ ـ ۳۰ سال کا وہ نوجوان حکومت کی موجودہ پالیسی کا بخیہ ادھیڑ رہا تھا۔

"جلیس" سوروپ جی نے آواز لگائی۔

جلیس ۔۔۔ میں اُس شخص کے پہناوے پر چونک گیا تھا۔

"ہاں۔ ہاں گھبرا کیوں گئے ۔۔۔" وہ مسکرا رہے تھے "اس کے لباس سے یا اُس کے مُکا مار کر بولنے کے انداز سے ۔۔۔ بھئی یہاں سب فنکار ہیں۔ اپنے اپنے فن میں ماہر جلیس نے نگاہیں گھمائیں ۔۔۔ پھر جیسے وہ دونوں ہاتھ ہوا میں اُچھال کر لپک پڑا۔ "اوہ میرے سرکار ۔۔۔ نمستے، سلام، نوازش شکریہ۔ وہ تیزی سے اتنے سارے لفظوں کی جگالی کرتا ہوا قریب سے کرسی کھینچ کر دھنس گیا۔

"یہ نیا حلیہ کسی ڈرامے کے لیے، تو نہیں ...!" سوروپ جی مذاقاً بولے ...
"نہیں نہیں، ہم پتر کاروں کو پلے کرنے کی فرصت کہاں!"
"پھر یہ سب ؟"
"راز کی بات بتاؤں آپ کو ..!" جلیس دائیں آنکھ مارتا ہوا پھسپھسانے کے انداز سے بولا ...
"مذہب سے سیاست کو الگ کر رہا ہوں!"
سوروپ جی نے قہقہہ لگایا۔ یوں کہو۔ مذہب کو سیاست سے جوڑ رہے ہو۔
ہوا میں مُکّا لہراتے ہوئے جلیس کھڑا ہو گیا ..." تو چلتا ہوں صاحب۔ بات تو دونوں ایک ہی ہے۔ اب بھیس بدلنے والی بات پر دیکھئے، یہ مسجد مندر ہنگامے پر کچھ انٹرویو کرنے ہیں مجھے۔ جانتا ہوں۔ انٹرویو کرتے کرتے مر جائیں گے سالے پتر کار لیکن مسئلہ برقرار رہے گا۔ سرکار نے ووٹ کے لئے اس بار ایسا مسئلہ اُٹھایا ہے جو آزاد بھارت کے جب تک ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر لیتا، سُلگتا ہی رہے گا ... کبھی ختم نہیں ہوگا صاحب ... مسجدیں ویران رہتی ہیں۔ مندروں میں کوئی آتا نہیں، مگر ترشول بھانج کر چلے آئیں گے خون کی ندیاں بہانے سوچنے کی بات ہے صاحب۔ کیا اسی آزادی کیلئے دیس واسیوں کا اتنا خون بہا تھا۔ اور سرکار نے اس بار چناؤ کی ...... کے لئے ایسا مسئلہ اٹھایا ہے جو انٹرویو، تقریر، بھاشن کسی سے حل نہیں ہونے والا .. سوچتا ہوں جس سرکاری کارخانے میں نئے نئے مسئلے پیدا کرنے کی غیر ملکی مشینیں فٹ ہوں، اُس کارخانے میں آگ لگا دینی چاہیئے۔"
جلیس کھولتا ہوا دوبارہ اپنی سیٹ پر چلا گیا تھا۔ اُس کی اچانک کی اس گمبھیرتا نے مجھے ایک دم سے گونگا کر دیا ... سوروپ جی کچھ سوچنے لگے تھے۔ جلیس کے قہقہے اگلی میز سے ایک بار پھر بلند ہونے شروع ہو گئے تھے۔
"ملک کہاں جارہا ہے۔ کیا سوچتے ہو تم ..." سوروپ جی میری طرف مڑے۔
"اُس اکیسویں صدی میں جس کا دروازہ چھٹی صدی میں کھلتا ہے۔"
غلط۔ جس کا دروازہ پاشان یگ میں کھلتا ہے ... جب تہذیب سے بے بہرہ

تھے ہم اور آج کی سیاست نے جس تہذیب کو داؤ پر لگا دیا ہے ... گندی سیاست کے بارے میں کبھی بولتا ہوں تو لگتا ہے خود پر پتھر اُچھال رہا ہوں ... یونو سدھاکر ... ہم کیا کر سکتے ہیں۔ آر وی پارالائزڈ ... نہیں تو کتنوں کی طاقت بن سکے ہیں ہم۔ آر وی امپوٹنٹ ... نہیں تو ملک میں نئی دھارا نیا خون کیوں نہیں آتا۔ مطلب صاف ہے سدھاکر ... ہم پارالائزڈ بھی ہیں اور امپوٹنٹ بھی ...؟

سوروپ جی خاموش تھے ...؟ آؤ چلتے ہیں۔ کتنا بھی قہقہہ لگالو، ملک کی موجودہ حالت پر غور کرو تو لگتا ہے کہ آزادی کی جنگ فضول میں لڑی گئی۔ کل ظلم تھا تو تسلّی تھی کہ غیر ہیں۔ آج افراتفری ہے تو آنسو بہتے ہیں کہ اپنی سرکار ہے اور اپنے لوگ ہیں۔"

افسردہ قدموں سے کینٹین سے نکل کر ہم باہر کی طرف چل پڑے۔ گیلری پار کرتے ہوئے اچانک میں ٹھہر گیا تھا۔ اور ٹھہر گئے تھے سوروپ صاحب۔ یہ وہی لڑکی تھی جو مجھے ہماچل پردیش بھون بس اسٹاپ سے ذرا چند قدم کے فاصلے پر ملی تھی۔ آزاد خیال نشے میں ڈوبی ہوئی ــــ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ۔

"لتیکا ..." سوروپ جی نے پلٹ کر آواز لگائی۔

لڑکی پلٹی۔ آنکھوں میں ہلکی چمک۔ قدم آگے بڑھے۔

"ہاؤ آر یو لتیکا"

"ویری فائن" لڑکی کے چہرے پر تھکی تھکی مسکان تھی۔ وہ اب بھی لڑکے کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئی تھی۔

"کچھ پریشان سی ہو؟"

"پریشان" لڑکی ہنسی۔ آنکھوں کا نشہ کچھ اور گہرا ہو گیا۔ "ٹینشن پر یولیڈ فارم ڈیڈ" .. اس نے کندھے اُچکائے ... اب کوئی ٹینشن نہیں ..

"کیا ہوا تھا؟"

"ڈیڈی ممی میں ڈائیورس ..."

"ڈائیورس؟" سوروپ چونکے ..."

"وہاٹس رانگ" لڑکی نے آنکھیں مٹکائیں... "آئی ڈونٹ وانٹ اینی سمپتھی فرام اینی ون... یہ تو زندگی کے اُتار چڑھاؤ ہیں... یہاں تو ان باتوں کو اتنا بڑا لیا جاتا ہے کہ... سم ٹائم آئی فیل گلٹی... میں یہاں کیوں پیدا ہوئی... آئی تھنک... ہم لوگ اب بھی کتنے بیک ورڈ ہیں... اپنی زندگی ہے... جیسے چاہو گزارو۔ کیا فرق پڑتا ہے..."

لتیکا ناراض ہو گئی تھی... آخری جملے کو ذرا غصے سے کہتی ہوئی وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ جھولتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ میرے قدم اپنی جگہ شل تھے...

"یہ لڑکی تو..." شاید لفظ بھی اپانگ تھے اور کھوکھلے اور بے جان...

"مجھے اس سے ہمدردی ہے... سوروپ جی نے بس اتنا کہا... وہ غور سے اُسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے... پھر انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

دراصل یہ لوگ راستہ بھول گئے ہیں۔ یہ تمام لوگ جو اس آرٹی فیشیل کلچر کا کسی نہ کسی طرح ایک حصہ بنے ہوئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے آج کی اجتماعی بے حسی کا، ہم پر حاوی ہوتی ہوئی گندی سیاست کا، ہمارے چپ ہونٹوں کا، ہماری تمام تر کمزوریوں کا ان راستہ بھولے ہوئے لوگوں سے بھی ایک مضبوط رشتہ ہے۔ تم جس سسٹم کی تبدیلی کی بات سوچتے ہو، پہلے اس سے الگ انہیں راستہ پر لانے کے بارے میں سوچو... جیسے لتیکا کو بتاؤ کہ زندگی صرف اس کی نہیں ہے۔ اس کی زندگی پر اُس کے سماج اور مُلک کا بھی پورا پورا حق ہے۔ وہ اتنی آزاد اور خود مختار نہیں کہ اپنے طور پر بھی کسی بھی زندگی کا انتخاب کرے۔ صحیح انداز سے سوچنے والوں کی جماعت جب تک نہیں بنتی ہم کوئی بڑی لڑائی نہیں لڑ سکتے سُدھاکر... اس سطح پر بھی اُن کے چہرے سے نقلی مکھوٹے ہٹانے کے لئے بھی ایک جنگ کی ضرورت ہے..."

رات کے آٹھ بج چکے تھے... ایسا لگ رہا تھا، جیسے صدیاں گزر گئی ہوں... تین چار گھنٹے کئی سو سال میں کھو گئے ہوں... پتہ نہیں کب وہاں سے اُٹھنا ہوا... مگر پہلے دن کی یہ تھکان مجھے پورے طور پر نچوڑ گئی تھی۔ پتہ بھی نہیں چلا، ہم کب علاحدہ ہوئے۔

سوروپ جی بنگالی مارکیٹ کی طرف نکل گئے اور میں ہماچل پردیش بھون بس اسٹاپ پر کھڑا سوچوں کے جزیرے میں گم اس بات کا احساس کر رہا تھا کہ کیا آج میرا دہلی میں پہلا دن ہے۔ نہیں تو میں اب تک کہاں تھا... کون سی دلّی میں ... کیا اصل دلّی منڈی ہاؤس میں بستی ہے۔ یا نو دریافت شدہ تہذیب نے منڈی ہاؤس میں ہی آکر پناہ لی ہے ... اس دن کمرے میں واپس آتے ہوئے رات کے گیارہ بج گئے تھے ... حسبِ عادت میں نے ڈائری کھولی... سوروپ جی کی بھاری آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی ...

"یہ فنی لینڈ ہے ... کتنے ہی کونے ہیں اس کے ... ہماچل پردیش بھون، فکّی آڈیٹوریم، تروینی، سری رام آرٹ سنٹر، ۳۵ فیروز شاہ، بنگالی مارکیٹ، ڈرامے، فلم، صحافت، اسٹیج سے جڑے ہوئے لوگ اس فنی لینڈ کے اہم ستون ہیں۔ آزاد خیال لڑکیاں، بکھرے بالوں، بڑھی ہوئی داڑھی والے لڑکے، یہ سب اسی زندگی کی باتیں کرتے ملیں گے، جن سے یہ کٹ گئے ہیں، بائکاٹ رہے ہیں ... آر یو فولوئنگ می ... لیٹ می ایلوبریٹ ... یو نو وہین اے فلم آرٹسٹ پروڈیوس آر ڈائرکٹ اے فلم سینٹی مینٹل اینڈ آئیڈیل ون، دین پیپل تھنک، اوہ، ہاؤ مچ اٹیچڈ ہی از... وِدھ پیپل آف سوسائٹی ... بٹ اِن فیکٹ ہی اِز سمپل اے پروفیشنل... ہیم وِدھ دَ فنی لینڈ... کیچڑ میں پڑے ہوئے ان آدرشوں پر تھوکنے کی خواہش ہوتی ہے بھاسکر... یہ مین ہول دیکھ رہے ہو... ان کے آئیڈیلزم شہر کی ساری گندگی سمیٹ کر مین ہول کے نیچے بہتے رہتے ہیں..."

(۴)

میں گھر لوٹ چکا ہوں ... ہاں وہی گھر جسے کرائے کا کمرہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ مگر پھر بھی یہ گھر ہے میرے لئے کہ اس ایک کمرے میں، میں نے زندگی سے جڑی سچائیوں کو قریب سے پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ جہاں دیواروں پر فریم کرائی ہوئی ماں باؤجی کی تصویریں لگی ہیں... دھول بھری ہوئی میز پر پرانا البم پڑا ہے۔ البم، جس میں میرا بچپن چھپا ہے جسے کھولتا ہوں... اور اپنے چھوٹے شہر کے اس پرانے گھر میں پہنچ جاتا ہوں...

جہاں سیلن ہے۔۔۔ دھوتی کے چھور سے بہتی ہوئی ناک کو صاف کرتے ننھو چچا ہیں ۔۔۔ جنھیں
کوئی احساس نہیں ہوتا کہ ایسا کرتے دیکھ کر انھیں کوئی کیا کہے گا۔ سیلن ہے۔ چائے خانہ
ہے ۔۔۔ اور بابو جی کے بدبداتے ہونٹوں کا کپکپن ۔۔۔ کبھی تو میرے لئے بھی وقت نکالا کرو
تم ۔۔۔ یہ کیا کہ سارا دن دوستوں کے ساتھ ہی گھرے رہتے ہو۔

تو یہ کمرہ بھی میرے لئے گھر ہے ۔۔۔ پتہ نہیں وہ کیسے احساس ہیں جنھوں نے پورا
پورا اوپر سے لے کر نیچے تک مجھے نچوڑ لیا ہے ۔۔۔ قطرہ قطرہ ۔۔۔ کمرہ میں آنے کے بعد صرف
ایک دن کے گھٹنا چکر ۔۔۔ میرے حواس پر بجلی بن گر رہے تھے ۔۔۔ کہاں گئے تھے تم آج۔
۔۔۔ کس سے ملنے ۔۔۔ امیدوں کا بھی کوئی موسم ہوتا ہے کیا ۔۔۔ پریشانیوں کے بیر کھٹے
ہی ہوتے ہیں۔ کبھی میٹھے نہیں ہوتے ۔۔۔ چائے خانہ ۔۔۔ سیلن ۔۔۔ دلّی کا سفر ۔۔ بابو جی کی
بجھی بجھی آنکھیں۔ پہوشش ۔۔۔ چھوٹی سی میگزین کا امس دیتا ہوا کمرہ ۔۔۔ کمپوزنگ سے آتی گیلیاں
۔۔۔ منڈی ہاؤس ۔۔۔ اور بغیر برا والی وہ لڑکی ۔۔۔ دھوتی پہنے ہوا جلیس ۔۔۔ امرت ۔۔۔
سب ایک قطار سے میرے اِردگرد کھڑے ہو گئے ہیں، مجھے گھیر کر جیسے کوئی شو چل رہا ہو۔ اسٹیج پر اندھیرا ہو اور
سب کے سب اپنے بے زبان مکالموں کو دُہراتے ہوئے آٹا چکّی کی طرح مجھے پیس ڈال رہے
ہوں ۔۔۔ آٹا چکّی گھڑ گھڑ کی آواز کے ساتھ گھوم رہی ہے ۔۔۔ گھڑ گھڑ ۔۔۔ اب صرف آوازیں
ہیں ۔۔۔ رام سوروپ جی ہیں ۔۔۔ منڈی ہاؤس گئے ہو کبھی ۔۔۔ امرت ہے ۔۔۔ ایک فرانس
کی پارٹی پھنسی ہے ۔۔۔ اور تھوپی ہوئی ہندوستانیت ہے کانوں کے پاس کافی دیر
سے ہتھوڑے برسائے جا رہا ہے جلیس ۔۔۔ جس سرکاری کارخانے میں نئے نئے مسئلے
پیدا کرنے کی غیر ملکی مشینیں فٹ ہوں اُس سرکاری کارخانے میں ۔۔ صرف ایک دن ۔۔۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کے بعد سے کبھی منڈی ہاؤس نہیں گیا ۔۔۔ نہیں جا سکا ۔۔۔ ہاں ہاں
وہاں سے گزرا کئی بار ۔۔۔ کتنی بار ۔۔۔ مگر ہر بار ۔۔۔

اندر کے کسی کونے سے سیلن کا دُھندلا دُھندلا سا چہرہ جھانکتا ہے۔ تم سچ کہہ رہے
ہو بھا سکر، ادب کو ہتھیار کے طور پر استعمال ہونا ہی چاہیئے ۔۔۔ سیلن کا چہرہ دُھندلا
ہوتے ہوتے ایکدم سے ماند پڑ گیا ہے ۔۔۔ اور اب ۔۔۔ یہ کوئی دوسرا ہی سیلن ہے۔ آنکھیں

پڑی ہوئی ... ہونٹوں پر طنز کی آمیزش۔ پیاسے تم اب بھی گھر کے بند کمرے سے جن واد بگھار رہے ہو... صرف ایک دن ... ایک دن میں تم نے اس اصلی جن واد کا چہرہ دیکھ لیا ہے ... جو مختلف شکلوں میں صرف ایک دن کے کچھ گھنٹوں میں چہرے بدل بدل کر کتنی ہی بار تمہارے سامنے آئے۔ صرف ایک دن میں ... اس تڑپتے ہوئے جن واد کے جنگل میں کیسا درشن ڈھونڈنے کے ہو تم ... بتا سکو ...؟"

کمرے میں اُس کا ان ہے ... تین چار دنوں سے جھاڑو بھی نہیں پڑی۔ بستر پر، کمرے میں رکھے ہوئے اسٹیل کے اس بڑے سے ٹرنک پر، ٹیبل پر، اکلوتی کرسی پر ہر جگہ گرد ہی گرد ہے ... ماحول میں عجیب سی بدبو گندھ ہے۔ ایک لمحے کو خواہش ہوتی ہے، اُٹھ کر سارے سامانوں کو تھپا دوں۔ مسٹری باندھ لوں ... کانوں میں کہیں دور چھک چھک کرتی ہوئی گاڑی کی آواز گونج رہی ہے۔ ان پانچ چھ مہینوں میں کتنی ہی بار ایسا ہوا، جب جب گھر کی یاد آئی ہے، وہ نئی دلی ریلوے اسٹیشن نکل گیا ہے ... گھر وطن کی تلاش میں یہ گاڑی پکڑ جاتی ہے ... اس کے اپنے شہر ... شاید کسی سے ملاقات ہو جائے ... نہ بھی ہو، تب بھی سارے کے سارے اپنے لگتے ہیں۔ جیسے اپنے ہی گھر جا رہے ہوں ... اپنی بھاشا ... اپنی سنسکرتی ... کہیں تڑپ ہوئی ادھ پچار کا نہیں ... سب ویسا کا ویسا۔ شور شور کرتی گاڑی پلیٹ فارم سے آکر لگ گئی ہے ... اسے لگتا ہے وہ اپنے بچھڑے تمام سامانوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا ہے ... سگنل ہو چکا ہے ... گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم چھوڑ رہی ہے ... اور اس نئی دلی سے دور ... بہت دور ... وہ آہستہ آہستہ اوجھل ہوتا جا رہا ہے ...

دہلی، ۱۹۹۰ء ◆◆

پربت

وہ چپ چپ کرسی پر بیٹھے تھے۔ بالکل خالی۔ ذہن سے بھی۔ میز پر کتابیں اِدھر اُدھر پسری تھیں۔ میز کے پاس ہی دائیں طرف کھڑکی کھلتی تھی۔ لیکن باہر کے نظاروں میں بھی اُن کے لئے کوئی کشش باقی نہیں تھی۔ جب کہ بغیر پلکیں جھپکائے نظریں باہر ہی رینگ رہی تھیں۔ اور وہ کسی مُردے کی طرح کرسی پر تھکے ہارے پڑے تھے۔ شاید کسی انہونی یا معجزے کے انتظار میں۔۔۔ کہ باہر کے بے کیف نظاروں میں اچانک جان پڑ جائے۔ کوئی ہلچل سی مچ جائے۔ کوئی خوشبو سی لہراتی ہوئی ان کے پور پور میں اتر جائے۔ ایسے وقت میں بوڑھے وجود میں کون سا احساس ٹھاٹھیں مارے گا، سوچا نہیں جا سکتا۔

ایک بار رما آئی تھی کمرے میں۔ اسے دیکھا۔ یوں ہی بے سدھ سا پڑا ہوا۔۔۔ یا دہ مُردہ سا۔ دیکھ کر ایک بار ٹھٹکی تھی۔ پھر پوچھا تھا۔

"چائے پیو گے؟"

اس نے ویسے ہی انجان بنے ہوئے اسی انداز میں "منڈی" ڈلا دی جیسے اُسے احساس دلایا ہو کہ اس وقت اس کی موجودگی اسے پسند نہیں ہے۔

"ایسے کیا بیٹھے بیٹھے سوچتے رہتے ہو۔ کچھ چلا پھرا بھی کرو۔ تازہ ہوا کھایا کرو۔"

رما اتنا کہہ کر جا چکی ہے۔

وہ پھر ویسے ہی ہیں۔ سُن سا چہرہ لئے۔ دماغ ایکدم سے خالی ہو رہا ہے۔ نیچے جتنا بھی نہیں۔ اس سے۔ بھی خالی۔ جیسے کسی غبارے سے پوری پوری ہَوا نکال دی گئی ہو۔

اچانک ایک تیز 'پٹ' کی آواز ہوئی۔ آنکھیں تھوڑی سی ترچھی کیں۔ کمرے میں چھلک کر گیند آئی تھی۔ ساتھ میں آیا تھا چہکتا ہوا چھوٹا سا بچہ سنبھالے رکّی۔

"دادا، گیند پھینکو گے؟"

اس نے پھر منڈی ہلا دی۔

"پھینکو نا دادا؟"

اس بار اس نے ہاتھ اٹھایا ہے مارنے کے لئے۔

"ٹھینگی!" رکّی نے منہ بنا کر انگوٹھا دکھایا ہے اسے۔ گیند غصے میں ایک بار پھر زمین پر پٹکی۔ وہاں سے بولتی ہوئی گیند اس کی پیٹھ کے پاس آکر ٹھہر گئی ہے ... ویسے ہی پڑے پڑے اس نے رکّی کو گیند اٹھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ رکّی پھر غصے سے کر چلا گیا ہے۔ جاتے جاتے کہہ گیا ہے۔

"کیسے نہیں بولوں گا دادا۔ تم گندے ہو۔۔۔!"

اس نے لمبی سانس لی: 'ہو جیسے' پھر ویسے ہی کھڑکی سے باہر کے بے کیف نظاروں میں خود کو سمونے کی تیاری کرنے لگا۔

کھڑکی سے باہر بڑے بڑے مکانات کی قطار ہے۔ مکانات کی قطار سڑک کے اُس پار ہے۔ سڑک سے اس وقت ٹیکسی اور گاڑی کم گزرا کرتی ہے۔ دو بجے کا وقت یعنی لنچ آور ... اس وقت کم بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ ٹیکسی اور گاڑیوں کے ہارن بھی کم ہی بجتے ہیں۔ اس لئے وہ کھڑکی کھول کر ذرا دیر باہر کے مناظر میں گم ہونے کا جرم کر سکتا ہے۔ بعض دفعہ گاڑیوں کے ہارن اور شور اتنے گراں گزرتے ہیں کہ وہ کانپ اٹھتا اور جوش سے کھڑکی کا شیشہ بند کر دیتا ہے۔ اتنے جوش سے کہ رما کے جھرّی بھرے چہرے پر غصے کی چھایا دکھ جاتی ہے۔

"کام دھام نہ ہو تو شیشے پر غصہ اتارتے ہوئے اچھا لگتا ہے۔ کھڑکی کے شیشے کو توڑ ڈالو گے کیا۔ یہ تمہیں کیا ہو جاتا ہے ...؟"

شام کے آٹھ بجے تک بڑکا بھی آجاتا۔ یوگندر۔ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے وہ اس کی آواز کو محسوس کرتے ـــ بابو جی کہاں ہیں۔ پھر رما کی آواز کانوں سے ٹکراتی ..... ہوں گے کہاں .... اپنے کمرے میں.... تم نے بابوجی کو کمرے پر چائے وائے دی تھی۔ اب وہ من ہی من میں انو کا چہرہ پڑھ رہا ہے۔ یہاں سے صرف محسوس ہی تو کر سکتا ہے ... اور انو .... یوگندر کی موجودگی میں بھی اتنا دھیرے بولتی ہے کہ .... اور کیا.... اس نے صفائی پیش کی ہوگی .... یا کوئی نیا بہانہ بنایا ہوگا .... دیر ہوگئی .... چائے لے کر گئی تو بابو جی سوئے تھے۔ ہونہہ۔ یہاں کس کو اس کی فکر ہے .... سب اپنی دُنیا میں مست ہیں۔ بس لے دے کر یہ بڑکا ہی ہے جو ہر بار اس کی خیریت پوچھنے آجاتا ہے۔ اب وہ بڑکا کے خاص پدچاپ کے انتظار میں ہے جو اس کے دروازے پر آکر ٹھہر گئی ہے۔

"بابو...."

کرسی سے بیٹھے بیٹھے اُس نے نظریں گھمائی ہیں، مُسکرایا بھی ہے۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا بابو جی؟"

اس کی مُنڈی ہاں میں ڈول گئی۔

"نیچے آئیے نا۔ ٹی وی ساتھ ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔"

"نہیں، تم لوگ دیکھو۔"

بس اتنا ہی تو کہہ پائے۔ یوگندر چلا گیا ہے۔ لیکن یوگندر کے لفظ اب تک ذہن میں بج رہے ہیں۔ ٹی وی ساتھ ساتھ .... اس لفظ میں اُترنے کی کوشش کرتے ہیں وہ .... ساتھ ساتھ بیٹھنا کسے پسند نہیں۔ عمر کے ۶۲ ویں پڑاؤ پر پہنچ کر وہ تو خود بھی بچوں میں، بہوؤں میں، پتنی میں رل بیٹھنے کا احساس زیادہ سے زیادہ پال لینا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ احساس کب کتنی بار ٹوٹتا ہی جاتا ہے۔ ٹی وی .... الگ الگ مناظر پر ٹکی نگاہیں۔ ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے بھی الگ الگ ہونے کا احساس.... یہ احساس کہیں توڑتا ضرور ہے۔ کتنی ہی بار بچوں سے، پوتوں سے اور رما سے بات کرنے کی خواہش ہوتی ہے ان کی۔ وہ کبھی کچھ بولنا چاہتے ہیں تو الگ الگ ٹی وی پر جمی نگاہیں انھیں ہاتھ کے اشارے

سے منع کر دیتی ہیں۔ اور وہ بے کار، بے وجہ اور بے معنی سی ہنسی اور قہقہوں کے بیچ سے
اچانک اُٹھ کر اپنے کمرے میں آجاتے ہیں۔

اور وہی کمرہ ۔۔۔۔ وہی میز ۔۔۔۔ وہی آرام کرسی ۔۔۔۔ وہی کھڑکی ۔۔۔۔ سب کچھ
جامد ۔۔۔۔ ٹھہرا ہوا ۔۔۔۔ سارے منظر بے کیف۔

تب اچانک ویسے ہی کرسی میں دھنسے دھنسے وہ ایک ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہیں۔
کمزور جھرّی بھرے ہاتھوں سے سر پر ادھر اُدھر اُگے تھوڑے سے بالوں کے بیچ انگلیاں
دَوڑاتے ، سر کھجلاتے ہیں ۔۔۔ ناک پر ٹکے ہوئے چشمے کو برابر کرتے ہیں۔ کچھ کچھ دُھندلا نظر
آتا ہے تو میز پر کسی کتاب کے بیچ پڑے چشمے کے کور کو برابر کرتے ہیں۔ کور ملتا ہے تو اس
کے کپڑے سے چشمہ صاف کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اطمینان کر لینا چاہتے ہیں کہ چشمے پر
جمی گرد صاف ہے۔ دیکھنے میں اب کوئی دقّت نہیں ہے۔ چشمے کے کور کو پھر کسی موٹی کتاب کے بیچ
پھنسا کر اب وہ قلم ڈھونڈ رہے ہیں۔ ایک بار پھر کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ لیمپ
جلا لیا ہے۔ ڈائری کے ورق کھل گئے ہیں۔ ایک لمحے کو آنکھیں پھر سوچ میں ڈوب گئی ہیں۔
کیا لکھیں اور کیا نہیں لکھیں۔ ٹھنڈی سانس چھوڑی ۔۔۔ ڈائری پر پہلے آج کی تاریخ
لکھی۔ پھر نظریں دیوار گھڑی کی جانب اُٹھائیں۔ وقت لکھا۔ ہاتھوں میں لرزش تھی۔
۔۔۔ لکھا۔

"کوئی بات ۔۔۔۔ کوئی بات ۔۔۔۔ آج بھی نہیں ہوئی۔ اس عمر میں کوئی انوکھی بات
ہو ہی نہیں سکتی۔"

پھر ٹھہرے پھر لکھا۔

"نو بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔ بچے بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ جانے
کیوں اب یہ سب کچھ متھیا (मिथ्या) لگتا ہے مجھے۔ جھوٹ، فریب۔ یہ رشتے ناطے ۔۔۔
سب کچھ ۔۔۔۔"

پھر ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی۔ جیسے سوچ رہے ہوں۔ یہ کیا لکھ رہے ہیں وہ ـــــ
یہ سب نہیں لکھنا چاہیئے۔ ڈائری ان سب باتوں کے لکھنے کے لئے نہیں بنی ہے۔ لیکن وہ

اپنے احساس کو کاغذ پر اُتارنے کی بال ہٹ پر اُتر آئے ہیں ... پھر لکھ رہے ہیں۔

"دفتر میں سب سے اچھی جگہ مجھے میری میز لگتی ہے، جہاں میری کرسی ہے اور جہاں سے میں نیلے آسمان کو جھانک لیتا ہوں۔ آسمان جیسی اونچی عمارتوں کے بیچ وہاں وہ بڑا سا جھماٹ درخت بھی ہے۔ پتہ نہیں کس چیز کا ہے۔ پتے بڑے بڑے اور ہرے ہیں۔ ایک سمے میں اس شہر میں پھل پھول اور درخت لگانے کی مہم چلی تھی ... شہر کو خوبصورت بنانے اور گندگی سے بچانے کی مہم ..."

وہ پھر ٹھہرے ... اس بار انھیں لگتا ہے جیسے وہ کوئی مضمون لکھ رہے ہوں۔ یا آلتو فالتو۔ وہ پھر بھی لکھتے جاتے ہیں۔

"پیڑ اچھے لگتے ہیں ... آسمان اچھا لگتا ہے ... اور اچھا لگتا ہے۔

انھیں دیر تک دیکھنا .... دیکھتے رہنا تمام رشتے مِتھیا ہیں۔

اور جھوٹ ... اسی لئے کبھی کبھی مجھے لگتا ہے قدرت ہی سب کچھ ہے۔ قدرتی مناظر مجھے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اپنی طرف بلاتے ہیں۔"

انھیں یہ سب لکھنا اچھا نہیں لگ رہا۔ اس لئے ڈائری بند کرکے اُلجھے اُلجھے سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب وہ کھڑکی کے سامنے ہیں اور نیلے آسمان کو تک رہے ہیں۔

سوچنے لگتے ہیں وہ ... کیا ان کا اب تک کا اپنا سفر ختم ہو گیا۔ خاندان در خاندان بیٹے اور پوتے پوتیوں والے ہو جانے کے بعد کیا اُن کی اپنی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ نِکھٹّو اور بے کار بنا دیئے گئے ہیں وہ۔ بچے بھی ان سے بات کرنے کا ایک ہی مطلب جانتے ہیں۔ بابو جی کو تھوڑی دیر کے لئے بہلا دینا۔ اور کیا؟ اپنے قیمتی لمحوں کا یوں بے کار میں خرچ کر دیا جانا بھلا کسے پسند ہو گا۔ تو کیا وہ بھی ان سب سے اکتا چکے ہیں — یعنی اگر بیوی بچے ان سے اکتا گئے ہیں تو کیا وہ بھی — اور اس کے بعد — اس عمر میں — کیا ایسی اُکتاہٹ سے کسی دوسری طرح کے ایڈونچر کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی اگر دوسری طرح سے کہا جائے تو وہ کسی بھی طرح کے خوبصورت احساسوں والے سلسلے سے باہر نکل آئے ہیں۔

اُنھیں خوف محسوس ہوا۔ اگر ایسا ہے تو یہ احساس انھیں توڑ دے گا ... ختم کر دے

گا... اس لئے کہ سب سے ضروری چیز ہے اپنے آپ کو زندہ رکھنا یا زندہ رہنے کے تصوّر کو جگائے رکھنا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟

انھیں احساس ہوا وہ سو رہے ہیں۔ اور صحیح معنوں میں وہ زندگی کے خوبصورت احساسوں والے سلسلے سے پوری طرح دور نکل آئے ہیں۔

اچانک ان کی ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی ... س... سکیں۔

اندر کچھ کھلبلی سی مچی۔ بوڑھے جسم میں ٹھہرے خون میں کہیں بہاؤ پیدا ہوا۔ انھیں احساس ہوا، اندر اب بھی تازہ خون موجود ہے جو احساس کی تازگی کے ساتھ مچل سکتا ہے۔ اندر طوفان اُٹھا سکتا ہے۔ آہستہ سے اپنے کھُردرے ہاتھوں سے اپنے جسم کو اسپرشش کیا تو کہیں اکہرے تناؤ کی کشتی بھی چل پڑی۔ چہرے پر ایک کھنچاؤ پیدا ہوا — نہیں... وہ پوتے پوتیوں والے ہیں اور ان کی پتنی ایک احساس سے کٹی، ایک بیمار چڑچڑی سی عورت، جو اُن کے ناکارہ ہوگئے وجود کا مذاق تو اُڑا سکتی ہے، اُنھیں سکھ کا خمار نہیں دے سکتی ... پھر...؟ اب اپنی اس زندگی کو وہ کیا نام دیں — انھیں لگتا ہے قدرت سے چلائے گئے قانون کی بس اُنھوں نے بھی چُپ چاپ پیروی کر ڈالی ہے — پتنی کو، بچوں کے سُکھ اور بچوں کو اپنے اپنے خاندان کے سُکھ میں بانٹ کر وہ اپنے اب تک کے فرائض سے آزاد ہوگئے ہیں۔ اس لئے اب اگر ان کے پاس کچھ تازہ سانسیں باقی ہیں تو ایک نئی زندگی کا تصوّر پھر اُن کے پاس بچ جاتا ہے اور وہ جیسے چاہیں اس تصوّر کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اب خوش تھے وہ۔ اس لئے کُرسی پر آکر بیٹھ گئے۔ ٹھنڈے دماغ سے دھیرے دھیرے پُرانی یادوں کو نوچتے رہے۔ شام میں پڑوس کی لڑکی وِدیا آئی تھی۔ وِدیا ابھی پڑھ رہی تھی۔ پورے گھر میں وِدیا کا مَن اکیلے ان کے پاس ہی لگتا تھا۔ سانولی سی عمر کے بیسویں پڑاؤ پر کھڑی وِدیا کو وہ اتنے غور سے دیکھتے رہے کہ وِدیا پریشان ہوگئی۔

"بات کیا ہے انکل؟"

"پُنر جنم کی بات سوچ رہا تھا۔ آواگون کے اس عقیدے کو مَیں تو نہیں مانتا۔ لیکن سوچتا ہُوں ایک جیون میں بھی تو کئی کئی جنموں کے سلسلے کی بات ہوسکتی ہے۔"

"کیا؟ مَیں سمجھی نہیں انکل" وِدّیا چونکی۔

لمحے بھر وہ وِدّیا کو دیکھتے رہے۔ کُرسی سے اچانک اُٹھ کھڑے ہوئے۔ لگا جیسے کمرے میں اتنا حبس ہو کہ سانس لینا دوبھر ہو۔ لفظ جوڑے۔ پھر بولنا شروع کیا۔

"وِدّیا، فرض کیا ہوتا ہے اور فرض سے مُکتی؟"

"انکل آپ پہیلیاں کیوں بجھا رہے ہیں" وِدّیا پریشان ہو گئی۔

"نہیں" وہ دوبارہ کُرسی پر جھک گئے۔ "پہیلی نہیں وِدّیا۔ سچ۔ یعنی حقیقت۔۔۔۔ اب میری طرف دیکھو۔۔۔ سوچو۔۔۔۔ مَیں کتابیں پڑھتا ہُوں۔ خوش ہوتا ہوں تو گھٹنوں بچوں سے کھیلتا رہتا ہُوں۔ اب بھی میرے اندر کا خون گرم ہے۔ جوش بھی مارتا ہے۔ پھر ـــ مَیں پوتے پوتیوں والا ہُوں۔۔۔۔ تو اتنا کچھ کرنے کے بعد ـــ کیا مَیں اسی جیون میں اپنے لئے ایک دوسرا جیون نہیں چُن سکتا"

"یعنی آپ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں انکل؟" وِدّیا حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"نہیں ـــ تم پھر بھی نہیں سمجھیں ـــ شادی کی بات تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے لگتا ہے سب مجھ سے کٹ گئے ہیں۔ اس لئے کہ سب کے پاس اپنی اپنی اور نئی نئی باتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ جہاں تک پتنی کی بات ہے وہ اتنا تھک گئی ہے یا اوب گئی ہے کہ اُداسین ہو گئی ہے۔ سو اس کے پاس جیون یا کسی بھی طرح کے خوبصُورت احساس کے نام پر کچھ نہیں بچا۔ سوائے پوتے پوتیوں میں جیون کاٹ لینے بھر کے۔۔۔۔ بچّوں کے پاس اپنے الگ راستے اور مسائل ہیں۔ میری باتیں وہ سمجھ نہیں سکتے۔ اب رہ جاتا ہُوں مَیں جسے وہ ایک بوڑھا اور ناکارہ سمجھنے کی بھُول کرتے ہیں جب کہ ایسا ہے نہیں۔ اس جنم میں مجھے، باقی جنموں کو مدھر بنانے کے لئے کیا کچھ دنیا، نہیں کرنا چاہیئے"

وِدّیا لمحے بھر پھر اُن کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر بولی "انکل، مَیں پھر بھی کچھ نہیں سمجھی۔ ابھی تم پریشان لگتے ہو انکل۔ مَیں بعد میں پھر آجاؤں گی"

وِدّیا کے جانے کے بعد بڑا کالڑکا آیا تھا۔ رکی ـــ ہاتھ میں پلاسٹک کی بال تھامے۔ ایک جھٹکے

سے آگے بڑھ کر انھوں نے بال چھین لی۔

"جاؤ نہیں دیتا"

"کیوں نہیں دیتے؟"

"نہیں دیتا۔ اس لئے کہ بال اب میری ہو گئی ہے"

"گندے ۔۔ دادا گندے

رکّی چیختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ پچھاڑیں مار کر روتا ہوا۔ اگلے ہی پل وہ رما کے ساتھ لوٹ آیا تھا۔

"بچّے کی بال کیوں چھین لی؟"

"بس اچھا لگا"

"بڑھاپے میں اتنا بچپنا اچھا نہیں لگتا"

رما کے اس جملے کو سُن کر اچانک ہی غصّے میں بال رکّی کی طرف اُچھال دیتے ہیں وہ ۔۔۔
"لے جا کمبخت ... دفان ہو ... رما آنکھیں دِکھاتی ہوئی غصّے میں لوٹ گئی۔ سوچتے ہیں وہ یہ سب کیا تھا۔ اُن کا بچپنا ... رکّی کا پچھپر پچھڑ کر رونا اور رما کا آنکھیں دِکھانا۔ سب ایک دوسرے ایک دوسرے کو جوڑنے کی علامتیں ہیں۔ یا انجانے طور پر وہ رشتوں کے بندھن سے کٹ ہی نہیں سکتے۔ رما مشین کا ایک بے کار کل پُرزہ بن گئی ہے اور بچّوں کی دَیا پر اپنا جیون کاٹے جا رہی ہے۔ جینے کا کوئی مقصد نہیں رہ گیا ہے اس کے پاس۔

بڑ کا کے خاندان ہی میں کتنی عزت ہے اس کی ... سب تو جیسے ایک رسم نبھا رہے ہیں۔ بزرگی کی عقیدت بھر رسم۔ اس سے زیادہ نہیں۔ برداشت نہیں ہوتا ان سے۔ شاید برسوں سے انسان نے تبدیلی کا مطلب اب تک نہیں سمجھا۔ یا ان کی اپنی تہذیب ابھی بھی اتنی تہذیب یافتہ نہیں ہوئی۔

[illegible] ہے۔ سچ بھاگتے بھاگتے کہیں چھپ گیا ہے یا سچ ہی جیون کا حصّہ ہے۔ جیسے بنائے رکھنے کا وہ راستہ تلاش کر رہے ہوں۔

اور اچانک جیسے راستہ مل گیا۔ ان کے ہاتھوں میں کُدال اور پھاوڑا آ گیا۔ باہر کی کچھ

زمین خالی پڑی تھی۔

ہاتھ میں کدال لے کر وہ دیر تک مٹی کوڑتے رہے۔ ایک بار بڑکا بھی آیا تھا۔ رما بھی آئی تھی۔ رکی بلانے کر آیا تھا۔ پھر بلا چھوڑ کر وہ بھی ان کے ساتھ کام میں لگ گیا۔ بہویں آئی تھیں۔ اُسے کام میں لگا دیکھ کر لوٹ گئی تھیں۔ وہ جانتے ہیں اندر باتیں چل رہی ہوں گی۔ بابوجی کو نیا شوق چرایا ہے۔

بڑکا نے کہا ہوگا ــــ کرنے دو نا... جی کو بہلانے کو اب وہ کوئی بھی سامان کریں۔ اتنی عمر ہو گئی۔ اس عمر میں سب سے مشکل کام ہوتا ہے جی کو بہلانا۔

پہلے دن ہی کافی کام کیا۔ مٹی کوڑی۔ برابر کی۔ پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ زمین نم ہو گئی تو پھر اپنے کمرے میں آ گئے۔ سوچنے لگے کل کچھ پھولوں کے بیج لے آئیں گے۔ پھول لگائیں گے۔ باغیچہ لگائیں گے اور کتابیں پڑھیں گے۔ خالی وقت میں رکی سے باتیں کریں گے۔ اب کافی کام ہیں ان کے پاس...

اُس رات وہ ذہنی طور پر خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہے تھے۔ دیر تک سیاہ آسمان کو تاکتے رہے۔ پھر کرسی پر بیٹھ گئے۔ میز سے وہی پرانی ڈائری اُٹھائی اور لکھنے لگے۔

ایک طرف وہ ہیں...

سوکھے بنجر سے...

اپنی پریشانیوں پر بکھر بکھر جانے والے...

اور ایک طرف قدرت ہے...

وہ آگے نہیں لکھ سکے... دراصل اب انھیں نیند آ رہی تھی۔

آجکل۔ مئی ۱۹۹۰ء ◆◆

مہاندی

"سَردارے! تم میری کہانیوں میں کیوں نہیں اُترتے؟"

"اس لئے کہ تم اُتارنا نہیں چاہتے!"

"سردارے، تمھیں اُتاروں بھی تو کیسے اُتاروں؟ تم تو مہاندی ہو ——— ہاں، مہاندی، جہاں دُنیا کی ساری ندیوں کا سنگم ہوتا ہے۔ کتنی نسلیں ایک ساتھ بستی ہیں تمھارے اندر! کتنے رنگوں، ذاتوں، مذہبوں، زبانوں کے لوگ پلتے ہیں تمھارے اندر! تم تو جیسے سب کی بھاشائیں جانتے ہو۔ اسی لئے تو سب کو سمو کر مہاندی بن گئے ہو تم! ہاں سردارے تم کبھی نہیں مروگے۔ مہاندی بھی مرتی ہے کیا؟ ساگر کبھی خاموش ہوا ہے کیا؟"

مَیں شونیہ (صفر) میں ہوں اور شونیہ میں دُور تک پھیلی ہوئی ایک گپھا دیکھ رہا ہوں۔ تاریک گپھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، جیسے کسی ڈراؤنی طوفانی رات کا کالا آسمان ہو۔ اُفق تک بچھا ہوا۔ میں اس گپھا میں ہی کہیں ہوں، کہیں بیچ میں، جہاں دونوں ہاتھوں کی قینچیاں کاٹتے ہوئے بھی اندھیرے میں راستہ نہیں ملتا۔ بس آنکھوں کے پردے پر دھیرے دھیرے ایک ایک تصویر بنتی ہے، اُبھرتی ہے۔ بہت سفید ڈاڑھی، نورانی چہرہ، لمبا قد، سر پر بجی ہوئی اُجلی پگڑی، براق کرتا پاجامہ۔ عمر کی لمبی ندی پار کرنے کے باوجود چہرے پر جھُرّیوں کا نام و نشان تک نہیں۔ مسکرانے میں کبھی کسی لمحہ کوئی کمی نہیں آئی۔ ہر وقت گنگناتے، مسکراتے ہونٹ اور بولتی ہوئی آنکھیں۔ ان آنکھوں میں بس ایک ہی

بار کسی شکایت کے لبوں کو جگہ ملی تھی۔ وہ ۱۹۸۴ء کی خونی نومبر کے پچھلے پہلے کی بات تھی۔ سردارے کے ہونٹوں پر یہ لفظ تھرتھرائے تھے ۔" مجھے لگتا ہے ـــــ مجھے پتہ نہیں کیوں لگتا ہے کہ میرے دل پر کوئی چپکے چپکے سیندھ لگا رہا ہے۔ کون ؟ میرے ہی اپنے ـــــ مجھے لگتا ہے ۔۔۔"

"سردارے " میں بس اتنا ہی بول کر خاموش ہو گیا تھا۔ اور سا گر بھی اتنا ہی بول کر چُپ ہو گیا تھا۔ اُس نے خود کو چھپانے والی وہی مسکان اوڑھ لی تھی جس پر ہم سب کو فخر رہا تھا۔ سردارے جیسا بزرگ ہمارے درمیان ہو تو ہم پر کوئی مصیبت نہیں آسکتی، کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ مسئلہ سردارے کی زندگی میں تو پیدا نہیں ہوا۔ جو اپنی مسکان سے زندگی بھر آتشِ نمرود کو بجھانے میں لگا رہا۔ آزادی سے اُبھرے ہوئے دنگے، ۱۹۴۷ء کی آگ رہی ہو یا ۱۹۸۴ء کے خونی نومبر کا لہو، سردارے تو بس مسکراہٹوں کی تجارت ہی جانتا تھا۔" بھائیا جی! اب اپنی خاک چھوڑ کر جانا بھی کہاں ؟ ہم سے اپنی مٹی نہیں چھوڑی جاتی۔ ہم نے تو ٹھان لی ہے۔ مار دو تو مر جائیں گے اور لمبی ہجرت کر لیں گے۔ مجھے لگتا ہے۔(آواز بھرّا گئی ہے) مجھے لگتا ہے چُپکے چُپکے کوئی دِل پر سیندھ لگا رہا ہے۔ کون ؟ میرے اپنے "

مہاندی چُپ ہے۔ اتہاس کے سارے پنّوں کو اوڑھ لو تو وہی اَنت تک پھیلی ہوئی مسکراہٹ۔

اُس دن امریک بتا رہا تھا:" تُو نے سُنا ؟ سردارے کے نام پر محلّے میں ایک خوبصورت سا چوک بنانے کی یوجنا چل رہی ہے "

" کہاں ؟"

" ارے یار، وہیں اپنے کھیاڑی میدان میں۔ اُسی کو نئے سِرے سے پارک کی شکل دی جائے گی "

"کون کرا رہا ہے یہ سب ؟"

ایک لمبی خاموشی اوڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ سیاسی مُہروں نے سردارے کی

موت کو بھی کیش کرانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اس میدان کو پارک بنانے کی اسکیم کتنی ہی بار بنی ہوگی مگر عمل کبھی نہیں ہوا۔ لیکن اس بار سردارے جیسی داستانی شخصیت کا نام جڑا ہو تو؟

امریک نے میری آنکھوں میں جھانکا تھا۔ "میں مانتا ہوں کہ سردارے کے نام پر کوئی یادگار بنی چاہیئے۔ پارک بھی اچھی چیز ہے۔ مگر جن کا نام ایسی یادگار قائم کرنے سے جڑا ہے وہ لوگ؟ سردارے جیسی شخصیت کا نام کیش کرنے میں بھی انھیں شرم نہیں آئی؟"

میں شونیہ یاترا میں ہوں اور اس صفر کے سفر میں صرف ایک چہرہ ہے۔ جو میرے آگے ڈولتا ہے، ابھرتا ہے، روشن ہوتا ہے، بجھتا ہے اور یہ چہرہ سردارے کا ہے۔ سردارے جس نے صدیوں کے اتہاس کی جگالی کی ہے اور پھر خود ایک اتہاس بن گیا ——— وہ کہانی جو اس جونرڑا بستی میں گھر گھر گونجتی ہے۔ خود میں نے بھی کتنی ہی بار سردارے کی زبانی سنی ہے۔ آج یہ کہانی مجھ سے مانگ کرتی ہے کہ اسے لکھوں۔ اسے جوندی نہیں، مہاندی تھا، جہاں دُنیا کی ساری ندیوں کا سنگم ہوتا ہے۔ انجانے میں قلم اٹھاتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ سردارے یہاں بھی ایک گائیڈ کی طرح میرے سامنے ہے۔ وہی نورانی چہرہ، مسکراہٹوں کی اننت یاترا پر نکلا ہوا۔

بات ۱۹۴۷ء کے دنگوں کی ہے۔

جونرڑا بستی کوئی ایسی بستی نہیں ہے کہ تاریخ میں اس کا کوئی مقام ہو اور آپ کا اس کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہو۔ ہاں کسی واقعہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس کا جغرافیہ پہلے سے جان لینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تقریباً پچاس باون گھروں پر مشتمل ہوگی یہ بستی۔ بہار کے ایک چھوٹے سے ضلع بھوجپور کے نقشے میں آپ اس بستی کا سراغ پا سکتے ہیں۔ آگے لکھی پور ہے۔ یہ بھی پچاس باون گھروں پر مشتمل بستی ہے۔ ان دونوں بستیوں کو ایک چھوٹی سی ندی جوڑتی ہے، جہاں ڈباؤ بھر پانی ہے اور مچھلیاں اتنی کافی کہ ان بستیوں کے کتنے ہی لوگ مچھلی پکڑتے اور شہر جا کر فروخت کرنے کا دھندا بھی کرتے ہیں۔ لکھی پور بستی میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے تو جونرڑا بستی میں اہیروں کی۔ جونرڑا بستی میں پکّے مکانات گنتی کے ہیں۔ سب سے پختہ مکان پریم سنگھ کا ہے،

جو اپنی خوش مزاجی، دوستی اور سب سے محبّت کا برتاؤ کرنے کی وجہ سے "سردارے" بن گئے ہیں۔ پتہ نہیں کب کس کے منہ سے پہلی بار یہ محبّت بھرا لفظ نکلا ہوگا: "او سردارے!" اس وقت سے سردارے ہیں پریتم سنگھ۔ کسی کی لڑکی سیانی ہو گئی ہو اور شادی کرنی ہو، کسی کو جہیز جوڑنا ہو، کسی کے گھر فاقہ ہو، سردارے کا مکان سب کے لئے کھلا ہے "آؤ بادشاہو" گاؤں والے کہتے بھی ہیں، حاتم طائی کی کہانی دیکھنا ہو تو چوہڑا بستی میں آجاؤ اور سردارے کے دروبچے چلے جاؤ۔ کوئی کبھی خالی ہاتھ نہیں گیا۔ پریتم سنگھ کے گھر کے برابر میں دو مسلمانوں کے گھر ہیں۔ ایک ہے لطیف میاں۔ دوسرے جنید میاں ہیں۔ ان دونوں کے یہاں کھیت ہیں۔ زندگی کی گاڑی ان ہی کی مدد سے چلتی ہے۔ ان گھروں سے پندرہ سترہ مکان چھوڑ کر جنید میاں کا مکان ہے، جو جنید میاں کہہ کر پکارے جاتے ہیں۔ یہ شہر جا کر گھر گھر کپڑے بیچنے کا دھندا کرتے ہیں۔ بیوی گھر میں ہی رہتی ہیں۔ دو بچے ہیں۔ بہت چھوٹے۔ گود کے۔ چوہڑا بستی میں کل تین گھر ہی تھے مسلمانوں کے دس بارہ گھر سکھوں کے تھے اور باقی گھر اہیروں کے، مچھواروں کے۔

یہ اُن ہی دنوں کی بات ہے جب غلامی کی بیڑیاں تنگ ہو گئی تھیں تو جیالوں نے سر سے کفن باندھ لیا تھا۔ وہ موت مٹھیوں میں لے کر گھر سے نکلے تھے۔ سب کے ہونٹوں پر صرف آزادی کی پکار تھی۔ سڑکوں پر بے رحمی سے معصوم ہندوستانیوں کا لہو بہہ رہا تھا۔ پورے بھارت میں آگ لگی تھی۔ "انگریزو بھارت چھوڑو!" کے نعرے بچے بچے کی زبان پر تھے۔ بغاوت کی صدا جو تیز ہوئی تو انگریزوں نے جلے پر تیل چھڑکا۔ "پھوٹ ڈالو اور راج کرو۔" آزادی کا تحفہ ہاتھوں میں دیتے دیتے وہ ہر چہرے پر مذہب کی بھاشا لکھتے گئے۔ اِدھر آزادی ملی اور اُدھر ملک کے مختلف علاقوں سے دنگوں کی خبریں آنے لگیں۔ ہندو مسلم فساد۔ بٹوارے کی آگ اپنا کام کر گئی تھی۔ پورا برّصغیر تباہی کی بھٹّی میں سُلگ رہا تھا اور دھیرے دھیرے آگ کی یہ لپٹ چوہڑا بستی میں بھی آپہنچی تھی۔

لطیف میاں نے پریتم سنگھ کے دالان میں بیٹھے بیٹھے ٹھنڈی سانس بھری۔ "سردارے، اب ہمارا کیا ہوگا؟"

پریتم سنگھ نے دیوار پر ٹنگی ہوئی گرودوں کی مقدس تلوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "قسم ہے

واہے گرو کی، لطیفے چین سے رہ کچھ نئیں ہونے کا۔"

"مگر سردارے، اگر یہ آگ یہاں بھی پہنچ گئی تو ——— ہم تو یہاں کُل ملا کر صرف تین گھر ہیں۔"

"تین نہیں، باون گھر۔ سب اپنے ہیں، لطیفے۔ پیرو میاں سے بھی بول، گھبرائیں نئیں۔ کچھ نئیں ہونے کا۔ صرف احتیاط رکھیں۔ جب تک آگ گرم ہے، گھر سے باہر قدم نئیں رکھیں۔"

لطیفے کو تسلی دے کر پریتم سنگھ گھر سے باہر نکلے۔ کمر میں تلوار اڑسی۔ صبح کا سورج آگ کے گولے برسا رہا تھا۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے سردارنی نے ٹوکا بھی: "کتھے چل دیئے؟" پریتم سنگھ صرف ہاتھ سے چپ رہنے کا اشارہ کر گئے۔ باہر نکل کر انھوں نے ہردیال سنگھ اور دو ایک سکھوں سے باتیں کیں۔ سب نے ہی کہا کہ آنے والے خوفناک لمحے کے بارے میں ابھی سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن لکھی پور بستی میں مسلمانوں نے کافی مار کاٹ کی ہے اور یہاں اہیروں میں بھی کافی بے چینی ہے۔ وہ کچھ کرنے پر اتر آئے تو ـ ـ ـ۔"

"نئیں، اس بستی میں ایسی کچھ نئیں ہوگا۔"

"حالت گمبھیر ہے سردارے۔"

"واہے گرو کی قسم، اگر ایسی نوبت آئی تو کیا تم لوگ ـ ـ ـ؟"

"ہم لوگ تمھارے ساتھ ہیں سردارے۔"

"بس ہو گیا ہمارا کام۔"

پریتم سنگھ مطمئن تھے۔ وہاں سے لوٹ کر گھر آئے تو بے چینی سے ٹہلتے ہوئے جندو میاں، لطیفے اور پیرو میاں موجود تھے۔ سردارے کو دیکھ کر آس بندھی۔

"تم لوگ اطمینان رکھو۔" سردارے نے کہا۔

"اطمینان ہے کہاں، سردارے؟"، پیرو میاں کی آنکھوں سے ٹپ سے ایک قطرۂ لہو ٹپکا۔ "گھر پر بیوی ہے، بچیاں ہیں اور باہر آگ لگی ہے۔ مسلمان، ہندو مر کٹ رہے ہیں۔ بھائی بھائی ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہیں سردارے، یہی آزادی ـ ـ ـ؟"

پریتم سنگھ نے پیرو میاں کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آزادی کے بارے میں کچھ مت

بولنا۔ یہ تو نئی سیاست کی پکی ہوئی آتش بازی ہے، پگلے۔ اسے تو ان کے جاتے ہی چھوٹنا تھا اور یہ چھوٹ رہی ہے۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔"

"کچھ دنوں کی ــــــ جب سارے مسلمان یا تو مارے جائیں گے یا پھر پاکستان۔۔۔"
لطیف میاں بولتے بولتے رُک گئے۔

پریتم سنگھ نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری" واہے گرو کی قسم، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، کچھ نہیں ہوئے گا۔ تمہارا اسی وقت بگڑے گا جب وہ ہماری لاشوں سے ہو کر۔۔۔"

"نہیں سردارے" چندو میاں کی آواز کانپی" بڑے وقت میں ایسا کچھ مت بول۔ میرا تو جی ڈرتا ہے' سردارے۔ آج ہی تجارت کے کام سے باہر جا رہا ہوں۔ ہفتہ دس دن تو لگ ہی جائیں گے۔ مگر سلمہ اور بچے اکیلے رہیں گے۔ سردارے بس تمہارے ہی آسرے چھوڑے جا رہے ہیں انہیں۔"

"کیا جانا بہت ضروری ہے؟" پریتم سنگھ نے پلٹ کر چندو میاں کی طرف دیکھا۔

"ہاں سردارے، تجارت ہے ہی ایسی چیز نہ جاؤ تو بہت نقصان ہو جائے گا۔"

"باہر آگ لگی ہے چندو میاں۔ اپنی بیا ہتا اور چھوٹے چھوٹے بچوں سے زیادہ تم کو اپنے نقصان کی پڑی ہے۔"

"اللہ مہربان ہے سردارے۔ اس سے آگے کچھ مت بولنا۔ ورنہ دو قدم بھی آگے نہیں چل پاؤں گا۔"

"جا۔ واہے گرو سب ٹھیک کرے گا ــــــ جاؤ، تم لوگ سب اپنے اپنے گھر جاؤ۔"

سب اپنے اپنے گھر چلے گئے، لیکن پریتم سنگھ کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوا۔ خبر خبر لینے کے لئے بستی کے کئی چکر لگا ڈالے۔ ہر پل ان کا اندیشہ خوف میں بدلتا جا رہا تھا۔ حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بستی کے لوگ ان تین گھروں کو ختم کرنے کے لئے سلگ رہے تھے۔ شام گئے ہر دیال نے آ کر خبر دی
"سردارے، حالت گمبھیر ہے۔ لکھی پورا میں مسلمانوں نے کافی مار کاٹ کی ہے۔ ہندوؤں کے گھر جلا دیئے ہیں۔ عورتوں کو بے آبرو کیا ہے۔ یہاں کے لوگ بھی ایسا ہی کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے رات کے وقت۔۔۔"

پریتم نے سنگھ نے سسکی بھری۔ کچھ نوجوان سکھوں کو جمع کیا۔ پھر حکم ہوا" جاؤ، چندو میاں

کی گھروالی اور بچوں کو حفاظت سے یہاں لے آؤ۔ گلی کے راستے، لیطیفے اور پیٹر کو بھی گھر کے تمام ضروری سامان کے ساتھ یہاں بھیج دو۔"

اُس رات واقعی ایک قیامت گزر گئی، جب غصّے میں بپھرے ہوئے اہیروں کے پُتروں نے ٹولی بنا کر راستہ روکے ہوئے سکھوں کو ہٹ جانے کو کہا۔ سردارے کا چٹان جیسا جسم سامنے آگیا۔

پُتر! مارنا ہے تو پہلے ہمیں مار۔ اس کے بعد اندر سے زنانیوں کو کھینچ کر اپنی بزدلی دِکھانا اور اپنی قوم کا نام۔۔۔"

"سردارے، وہ دشمن ہیں، غدّار ہیں، لکھی پُورا ہیں۔۔۔"

"کچھ لوگ اگر بھٹک جائیں تو پوری قوم کو قصوروار نہیں ٹھیرایا جاسکتا، پُتر۔ یہ سب اپنے ہی بھائی لوگاں ہیں۔ برسوں سے ساتھ ساتھ رہتے آئے ہیں۔ ڈکھ سُکھ، برب تیوہار کے موقعوں پر۔۔۔"

سردارے! راستے سے ہٹ جاؤ!"

اور پتھر جیسا سینہ اُس وقت بھی سامنے اَڑ رہا "پہلے ہمیں مار ڈالو، پُتر۔ اس کے بعد جتنا خون بہانا ہے، بہالو۔"

غصّے میں بپھرے ہوئے گھر لوٹ تو گئے لیکن پریتم سنگھ سمجھ گئے تھے کہ چنگاری ان کے سینوں میں بھڑک رہی ہوگی۔ وہ کسی وقت بھی حملہ کرسکتے ہیں۔ جیسے تیسے رات کٹی۔ پھر ہلکی ہلکی صبح نمودار ہوئی اور دھوپ کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔ سردارے بار بار دالان میں جا کر تسلّیاں دیتا رہا "مہاجرو، اپنے ہی وطن میں غیروں جیسا سلوک ہو تو آزادی کے نام پر یہ بھی سہہ لو۔ کچھ نئی ہوئے گا۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو ــــــــــ" سردارنی اور پریتم سنگھ کے تینوں بچّے اور لڑکی بنتو ان کی خاطر مدارات میں لگے رہے، لیکن آگ بجھی نہیں۔ دو چار روز اور گزرے۔ اُس دن ہردیال پھر خبر لایا "سردارے، معاملہ پھر بگڑ رہا ہے۔ کہتے ہیں پڑوس والی نند نگری بستی سے ہندو بلائے جارہے ہیں۔ اب خیر نہیں، سردارے۔ ابھی وقت ہے، جتنی جلدی ہوسکے، انھیں بھگا دو۔"

"بھگا دوں؟" پریتم سنگھ کے دل پر جیسے بجلی ٹوٹ کر گر پڑی ہو "مگر کہاں؟ کیسے؟ کیا

سوچیں گے یہ بھی کہ سردارے دو روز کھانا بھی ٹھیک طرح نہیں کھلا سکا۔ یہ میرے مہمان ہیں ہردیال۔ اور تم کہتے ہو۔۔۔"

"سردارے، اگر ان کی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو۔۔۔"

"کون جائے گا انھیں پہنچانے؟"

"ہم سب۔ ہم انھیں ندی پار کرا کے لکھی پورا بستی تک چھوڑ آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ جب تم لوگ ایسا سوچتے ہو تو۔۔۔"

تھکے ہارے، بوجھل سا دل لئے پریتم سنگھ دالان میں آئے۔ مجرم جیسے۔ چہرے پر تشویش کے بادل دیکھ کر لطیفے اور بیرو کی سانس ٹھہر گئی۔

"خیر تو ہے سردارے۔"

"نہیں۔" پریتم سنگھ نے سر جھکا لیا۔ "تم سب کو یہاں سے جانا ہوگا۔" آواز ایسی تھی جیسے اب رو پڑیں گے، لیکن گھبراؤ نہیں۔ ہمارے آدمی تمھیں لکھی پور حفاظت سے پہنچوا دیں گے۔"

لطیف میاں اور بیرو میاں کے چہرے پر برفانی ہوا جیسے اپنی نشانی چھوڑ گئی۔

"مگر میں نہیں جاؤں گی۔" کمرے کے کونے سے ایک تیز آواز ابھری۔ پریتم سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ چندو میاں کی بیاہتا تھی۔ سینے سے دونوں بچوں کو چمٹائے "میں نہیں جاؤں گی۔ میرے میاں باہر ہیں۔ مروں گی تو یہیں بچوں کے ساتھ۔"

آنکھوں میں آنسوؤں کے خشک سوتے لئے پریتم سنگھ نے چندو میاں کی بیاہتا کو غور سے دیکھا۔ پھر پتہ نہیں کیا سوچ کر حامی بھر لی۔ "ٹھیک ہے بہن۔ واہے گرو تیری مدد کرے۔ ترماں والیا، بچاں والیاں تیری گود بھرے۔ تو نہیں جانے کی، مگر یہ دونوں۔۔۔ پھر گلوگیر آواز میں کہا "سامان باندھ لو، میاں۔ آزادی نے نصیب میں اگر ہجرت ہی ہجرت لکھی ہے تو پھر۔۔۔"۔

لطیفے کی تو سسکیاں گونج گئیں۔ بیرو کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔ گھر والی بچے سمیت الگ بڑے وقت کو کوس رہی تھی۔ پھر سامان بندھ گئے۔ آدھی رات گزری۔ سردارے نے چند سکھوں کو ساتھ کر دیا۔ وہ جا رہے تھے اور سردارے صرف ان ماتمی دھنوں کی گونج سن رہے

تھے جو فضا میں پھیل رہی تھیں۔

دوسرے دن سورج نکلنے تک یہ خبر اہیر برادری میں پھیل گئی کہ سردارے نے غدّاری کا ایک اور ثبوت دے دیا۔ اس نے دشمنوں کو بھگا دیا۔ پھر یہ بات بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ سردارے نے چندو میاں کی بیاہتا کو اب بھی اپنے گھر پناہ دے رکھی ہے۔ پھر کیا تھا آگ ایک بار پھر بھڑک اٹھی۔ سردارے ایک بار پھر چندو میاں کی بیاہتا کے سامنے مجرم بنے کھڑے تھے۔

"بہن، مذمت کر۔ تمہیں جانا ہی ہوگا۔ آگ اس گھر تک پہنچ چکی ہے۔ بہن، تیرے بھائی تیرے ساتھ ساتھ جائیں گے۔

چندو میاں کی بیاہتا جیسے سکرات کے عالم میں کھڑی تھی۔ مگر کہاں جاؤں؟ میں کسی کو پہچانتی بھی تو نہیں۔ پھر عورت ذات۔"

بچے اس کے سینے سے چپٹے رو رہے تھے۔ سردارے کی روح میں کتنے ہی نشتر اتر گئے۔ پھر کہاں بھیجیں؟ کہاں؟ آنکھیں بند کیں تو خان بہادر کا خیال آگیا، جو اس وقت پولیس میں کسی بڑے عہدے پر تھے۔ ان کے گہرے دوست۔

"تو گھبرا نہیں بہن۔ میں تجھے شہر بھیجنے کا انتظام کرتا ہوں۔ وہاں میرے ایک دوست ہیں، وہ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال لیں گے۔"

وہ رات بھی سردارے کے لئے قیامت کی ہی رات تھی۔ روتی آنکھوں سے سردارے نے چندو میاں کی بیاہتا کو روانہ کیا۔ ہیٹے کے تین سکھ نوجوان ساتھ تھے۔ خان بہادر کے نام ایک چٹھی بھی دی تھی۔ چٹھی میں دونوں قیامتوں کا پورا پورا ذکر تھا۔ تیسرے روز وہ تینوں سکھ نوجوان آگئے۔ خبر لائے کہ خان بہادر نے روک لیا تھا، حفاظت کے خیال سے۔ بہن خیر خوبی سے پہنچ گئی۔ سردارے نے چین کی سانس لی۔ اس کے بعد صرف ایک حادثہ ہوا: غصے میں آئے ہوئے لوگوں۔ نے تینوں مسلمانوں کے گھر پھونک ڈالے اور انتقام کی آخری مشعل بجھادی۔

پھر وقت گزرا اور آگ دھیرے دھیرے بجھنے لگی۔ اِکا دُکا لوگ اب بھی پاکستان جا رہے تھے۔ دنگوں کی خبریں آنی کم ہوگئی تھیں۔ لطیفے اور بیرو میاں کے بارے میں یہ خبر اڑی تھی کہ وہ

وہ کسی کیمپ میں ہیں اور پاکستان جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اِدھر مصیبت کے مارے چندو میاں اپنی بیا ہتا اور بچّوں کی خبر لینے روتے دھوتے سردارے کے یہاں پہنچے۔ سردارے نے اطمینان دلایا اور خان بہادر کے یہاں بھیج دیا۔

پھر ایک دن چندو میاں خوش خوش پورے خاندان کے ساتھ صحیح سلامت چونڑا بستی پہنچ گئے۔ گھر جلنے کی خبر انھیں مل چکی تھی۔ کچھ بھی بچا نہیں تھا۔ بس لے دے کر سردارے کا آسرا تھا۔

"سردارے!"

پریتم نے گلے لگا لیا "پُتّر! رب دا شکر کر۔ سب سلامت ہے۔"

"ہاں سردارے۔ سب تیری مہربانی۔"

پریتم سنگھ نے پھر اُسے بیچ میں روک دیا: "غلط بات۔ سب رب کی مہربانی ہے۔ ویسے اب کیا ارادہ ہے بادشاہو؟ سب تو پاکستان چلے گئے۔"

"ہم یہیں رہیں گے سردارے۔ یہیں اسی مٹّی میں۔"

"سوچ لیا ہے؟ یہاں تمھاری قوم کا کوئی آدمی نہیں۔"

"اور آپ لوگ؟" چندو میاں کی آواز کانپ رہی تھی۔

"یہ بات ہے تو لے۔ تیرا گھر آج سے ہی بننا شروع ہوگا۔"

سردارے نے محبّت کے جوش میں چندو میاں کو لپٹا لیا۔ پھر کیا تھا۔ بستی میں جیسے تیوہار کی دُھوم تھی۔ کوئی پھاوڑا لے کر صفائی میں لگا تھا تو کوئی ٹرک میں مٹّی پھینک رہا تھا۔ مزدور بُلا لئے گئے۔ "ہیّا ہویا۔ ہیّا ہویا" کام تیزی سے شروع ہوا۔ دل کے سارے غبار ایک طرف رکھ کر پوُری بستی جیسے اس کام میں جُٹ گئی تھی اور کچھ دن میں چندو میاں کا نیا مکان آباد تھا۔

پھر دن گذرتے چلے گئے اور وقت نے ایک لمبی اُڑان بھرلی۔ ہردیال سنگھ اور دیگر لوگ پُرانے کاروبار کے جاں باز سپاہی آہستہ آہستہ رخصت ہوتے چلے گئے۔ نئی نسل جوان ہوگئی۔ آزادی کے کتنے برس گزر گئے۔ پچاس باون گھروں کی یہ بستی اب سو سے زیادہ گھروں

پر مشتمل تھی۔ پریتم سنگھ نے اپنی بیٹی بنتو کی شادی امرتسر کے ایک کپڑے کے بیوپاری سکھ نوجوان سے کر دی تھی۔ وہ وہیں بس گئی۔ لڑکے شہر میں رہ کر کپڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ مکان یہاں آباد تھے۔ سردارے بھی بوڑھے ہو گئے تھے۔ چندو میاں کے دونوں بیٹے جوان ہو گئے تھے۔ شہر میں کماتے تھے۔ پھر وقت کے ساتھ چندو میاں بھی رخصت ہو گئے اور پھر قصّے رہ گئے۔ اتنا اس رہ گیا کہ چونڑا بستی میں کبھی ایسی قیامت گزری تھی اور سردارے نے اکیلے جان پر کھیل کر اس بستی کو قیامت کی نذر ہونے سے رکا تھا۔ اب سکھوں کے کتنے ہی پکّے گھر یہاں تعمیر ہو چکے تھے۔ کچھ لوگ تو اپنے مکان بیچ کر ہمیشہ کے لئے شہر چلے گئے تھے۔ یہاں کی پکّی سڑک سیدھی شہر سے جا ملتی تھی۔ کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ۱۹۴۷ء میں جو قیامت اس گاؤں میں گزری تھی، وہی تاریخ رُوپ بدل کر ایک بار پھر دُہرائی جائے گی۔

اور یہ بات ۱۹۸۴ء کے خونی نومبر کی ہے جب پورے ملک میں سکھوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا تھا۔

میں اس واقعہ سے کہیں جُڑا ہوں۔ چندو میاں میرے دادا تھے ــــ دادا جو اس بستی کے لئے اب ایک تاریخ بن گئے ہیں۔ لوگ حیرت سے بتایا کرتے ہیں کہ کیسے دادا نے اکیلے مُسلمان ہو کر بستی میں رہنا منظور کیا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب ہر طرف شعلے اُٹھ رہے تھے۔ اب اس بستی میں مسلمانوں کے کتنے گھر آباد ہیں۔ لیکن دادا کے قصّے آج بھی عام ہیں۔ پریتم سنگھ اب سردارے ہیں، صرف سردارے، جن کے ہونٹوں پر قصّے سجے ہوتے ہیں۔ ماضی کے، آزادی کے، چونڑا بستی میں آئی ہوئی قیامت کے۔

پھر آیا خونی نومبر ــــ اس خونی نومبر سے پہلے بھی سردارے سے ملنے کا کئی بار اتفاق ہوا۔ ہر بار ایسا لگا جیسے امرتسر کے گولڈن ٹیمپل سے نہیں، سردارے کی آنکھوں سے گولیاں چھوٹ رہی ہیں۔ لہولہان سے نظر آئے تھے سردارے ــــ شہادت کی تاریخ لکھنے والے اب غدّار ہو گئے پُتّر۔ آنکھوں سے چنگاریاں سی چھوٹیں... "مجھے لگتا ہے" پھر ٹھہرے تھے: "مجھے لگتا ہے پُتّر، کوئی چپکے چپکے میرے دل پر سیندھ لگا رہا ہے ــــ کون؟

وہی میرے اپنے "۔ سردارے کی آنکھوں کو پوری صدی ڈس گئی ہے۔ خونی نومبر نے چاروں طرف سکھوں کا قتلِ عام شروع کرا دیا۔ ہوتے ہوتے آگ ایک بار پھر چونڑا بستی پہنچ گئی۔ سردارے کے لیے بھی اب بستی والوں کی عقیدت سونے لگی تھی۔ پھر وہ دن آگیا جب بابا نے سویرے ہی مجھے اٹھا ڈالا تھا: "سردارے کے یہاں چلنا ہے"

"خیریت؟"

"خیریت نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ بھڑکے ہوئے ہیں۔ مشورہ کرنا ہے"

سردارے بستر پر تھکے سے پڑے تھے۔ کتنی لمبی جنگ لڑی ہے زندگی سے۔ اب تھکنے لگے ہیں۔ لیکن ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ جمی ہے۔

"بات کیا ہے حنیف میاں؟"

"بُری خبر ہے، سردارے"

"لوگ ہمارا قتل ہی تو چاہتے ہیں نا"

سردارے کے ہونٹوں پر ویسی ہی معنی خیز ہنسی بجی تھی۔ چونڑا بستی میں اب بیس بائیس گھر تھے سرداروں کے۔ ایک سو بیس پچیس گھروں والی یہ بستی جیسے بارود کے ڈھیر پر کھڑی تھی۔ لوگ بھڑکے ہوئے تھے ـــــ پھر دھواں سا آسمان میں اٹھا اور پوری بستی دھوئیں سے بھر گئی۔ پولیس جیپ آگئی۔ کرفیو نافذ ہو گیا۔ چونڑا بستی میں موت ایسا سناٹا پھیل گیا۔

اُس دن بستی میں پندرہ سکھ نوجوانوں کی ہتیا ہوئی تھی۔ آٹھ گھر جلا دیئے گئے تھے۔

سردارے کا گھر اندھیرے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اندر سے بند۔ کوئی آہٹ نہیں۔

رات گئے چور قدموں سے بابا کے ساتھ سردارے کے پر دستک ہوئی۔

"کون؟" اندر سے سہمی ہوئی آواز آئی۔

"سردارے!"

"دروازہ کھول دے پُتر"

ایک نوجوان سکھ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ سردارے کا پوتا تھا، امریک سنگھ۔ الجھنوں کی گرد چہرے پر جمی ہوئی۔

"اتنی رات گئے؟ بات کیا ہے حنیف میاں؟"

"سردارے ہم شرمندہ ہیں۔ ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکا ہے۔ بستی میں دُھواں اُٹھتا رہا۔"

"نہیں پُتّر میں نے تو سہن کر لیا ہے۔ آزادی کی دوسری سوغات سمجھ کر ـــ کل مُسلم غدّار تھے اور سکھ ـــ واہے گرو کی قسم سچ بولوں حنیفے، یہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔"

"سردارے ایک بات کہنی ہے آپ سے۔"

بابا نے ڈرتے ڈرتے زبان کھولی ـــ "یہاں بہت سے نوجوان تیار ہیں۔ سردارے آپ لوگوں کو یہاں سے ہجرت کرنی ہوگی۔ معاملہ نازک ہے، سردارے۔ آپ جہاں کہیں ہم آپ کو بحفاظت پہنچا دیں گے۔"

سردارے کی آنکھوں سے اچانک لہو بہہ گیا ... "پُتّر، ہجرت کی بات تیری زبان پر آئی کیسے؟ تو کیا جانے ہجرت کا زخم؟ تیرا باپ چندو ہوتا تو یہ لفظ نہیں بولتا۔ وہ ہجرت کا زخم جانتا تھا۔ اسی لئے اکیلا رہ گیا، مگر پاکستان نہیں گیا۔ تو مجھے پنجاب بھیجے گا نا؟ اپنے لوگوں کے پاس؟ ارے یہاں کون غیر ہے اپنا؟"

آواز میں پھر وہی لچک، وہی جوش، جو کھوئی ہوئی آزادی کے برسوں بعد جوالامکھی بن کر سردارے کی آواز میں سما گئے تھے۔

بابا نے پھر التجا کی "سردارے، ضد نہ کیجئے۔ زمانہ بدلا ہے۔ لوگ آپ کی ..."

"میری جان لینا چاہتے ہیں نا؟"

سردارے اچانک بوڑھے پیکر کو سمیٹ کر اُٹھ گیا ہے۔ آواز میں لرزہ نمایاں ہے۔

"تو لے چلو نا باہر۔ پُتّر دیر کس بات کی ہے؟ پہلے بولا ہوتا، مجھے مار کر انھیں چین ملتا ہے تو۔"

گھٹی ہوئی آواز میں اچانک سردارے چیخ پڑے۔ پوتے پوتیوں کو صدا لگائی "تسّی دروازہ کھول دو۔ بند کیوں کر رکھا ہے دروازہ؟ کھول دو۔ آنے دو انھیں ـــ سارے دروازے کھول دو۔"

سردارے چیخ رہے تھے۔

وہ قیامت کی رات گزر گئی۔ اُس رات بس اتنا ہوا کہ ایک بوڑھا بم دروازے پر کھڑا چیخ رہا تھا اور سناٹے میں آئے ہوئے بستی کے لوگ شرمسار کھڑے تھے۔ پھر جیسے آئے تھے ویسے ہی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

نومبر کے اس خونی رقص کو بھی اب چار سال گذر گئے ہیں۔ دل کے کسی گوشے میں اب بھی وہی آواز گونجتی رہی "ہم کو ہجرت نہیں کرنی۔ یہ تو ٹھان لی ہے۔ مہاجر ہونے کا زخم نہیں کھانا۔ کل تک جو اپنے بھائیوں کو ہجرت کرنے سے روکتا رہا تھا، آج خود ہی ہجرت کا بار اُٹھائے گا۔ یہ سب آزادی کی سوغاتیں ہیں پُتر" آزادی کو پورے اکتالیس سال گزر گئے ہیں۔ اتنے برسوں بعد تاریخ کے اس بھیانک زخم کو یاد کرتے ہو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن سردارے کی ارتھی کو کندھا دے کر لوٹتے ہوئے اس کے سُونے دروازے کے پاس سے گذرتے ہوئے ایک برقی جھٹکا سا لگا تھا۔ بار بار اس سُونے دروازے تک جا کر نگاہیں ٹھہر جاتی ہیں۔ برف کی طرح سرد آواز میرے راستے میں بچھ جاتی ہے " ہم نے ٹھان لی ہے، ہم کو ہجرت نہیں کرنی۔ سارے دروازے کھول دو پُتر ــــ"

سردارے نہیں رہے۔ آزادی کی دی ہوئی سوغاتیں اتنی وزنی ہو گئیں کہ ان کا بار نہیں اُٹھا سکے سردارے۔ سو گئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

سردارے کی مَوت کا پُوری بستی نے غم منایا تھا۔ ساری آنکھیں جل تھل تھیں۔ پُرانی کہانیاں دُہرائی جا رہی تھیں۔ اس بیچ صرف اتنا ہوا کہ بستی کے کباڑی میدان کو پارک میں بدلنے کی بات اٹھی۔ لیکن پارک بنتے بنتے رہ گیا۔ نیت میں کھوٹ کی وجہ سے۔ سردارے کی مَوت کو کیش کرانے والے سیاسی مہرے آپس میں ہی لڑ پڑے اور پارک نہیں بن سکا۔

اُس دن امریک میرے پاس آیا تھا "کیوں نہ پارک خود کو مل کر بنا دیں۔ یوں بھی جب جب پارک میں سب لوگ مل بیٹھیں گے اور اچھی اچھی باتیں ہوں گی تو سردارے کی رُوح کتنی خوش ہو گی۔ یہی تو چاہتے تھے"

"مگر کیسے ؟"

"جیسے چندو میاں کا مکان بنا تھا۔ تمھیں یاد ہے نا؟"

امریک کی بات نے اچانک اُس سوئے قصّے کی یاد دلا دی ہے۔ اب صرف ایک منظر سامنے ہے ـــ ایک گرا ہوا گھر، اور ساری بستی والے اُس گھر کی مرمّت کر رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھا تو نہیں، لیکن زبانی سُن سُن کر پُورا منظر آنکھوں میں اُتر آیا ہے۔

ہتیا ہو یا ـــــ ہتیا ہو یا ـــــ ہتیا ...

مکان کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ نہیں پارک کی۔ امریک کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں دھیرے سے کہتا ہوں: ہتیا ہو یا ـــــ ہتیا ہو ...

شمع، دسمبر ۱۹۸۸ء ◆◆

خیمے

بڑا بھیانک طوفان تھا۔ صبح سے ہی آسمان کالے کالے بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ہلکی پھلکی بوندا باری کی توقع تو تھی مگر یہ امید نہ تھی کہ دیکھتے دیکھتے ہی آسمان اس قدر سیاہ پڑجائے گا اور ٹھنڈی ٹھنڈی بہتی ہوئی ہوا آندھی کی صورت اختیار کرلے گی۔ بادبان زوروں سے ہل رہے تھے اور معمولی سی کشتی (شیشم کی لکڑی کے تختوں کی مدد سے تیار کی ہوئی) سمندر کی لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ کشتی میں صرف دو ہی مسافر تھے۔ ایک بوڑھی عورت، ایک اس کا جوان لڑکا۔

"اب کیا ہوگا؟" بوڑھی عورت کی آنکھوں سے گھبراہٹ جھانک رہی تھی۔

"ہاں اب کیا ہوگا؟" نوجوان بھی پریشان نظر آرہا تھا۔ "کشتی شاید طوفان کا مقابلہ نہ کرپائے۔"

"کشتی ڈوب سکتی ہے؟"

"ہاں ڈوب سکتی ہے۔"

"پھر ہمارا کیا ہوگا؟" بوڑھی عورت کی آواز بیٹھ رہی تھی۔

"ہمت!" نوجوان آہستہ سے بولا "ایسے وقت ہمت کا دامن چھوڑنا نہیں چاہیے۔ مستقل مزاجی ہی ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب کرسکتی ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے چپو چلانا شروع کیا۔ طوفان بڑھتا جا رہا تھا اور کشتی ڈگمگا رہی تھی۔

"تم کشتی پیچھے نہیں کر سکتے ؟"

"افسوس میں نہیں کر سکتا !" نوجوان نے بہت تھوڑے لفظوں کا سہارا لیا ۔۔۔۔

"اور ماں تم چاہتی ہو ہم پھر وہیں جائیں جہاں خیموں میں بیٹے لوگ اسلحوں سے لیس ہمارے انتظار میں ہوں کہ ہم آئیں تو ہماری بوٹی بوٹی کرکے چیل کوؤں کو کھلا دیں"

"افسوس ! دُنیا پر بُرا وقت آیا ہے ۔ ہمارے زمانے میں ایسا نہیں تھا"

"تم نے غلط سمجھا ماں ۔ ایسا ہر زمانے میں تھا ۔ ذرا ٹھہر کر ۔۔۔" افسوس ہم پیچھے نہیں جا سکتے ۔ مگر تم گواہ رہنا کہ دُنیا کے بُرے سلوک نے ہی ہمیں اس سفر پر آمادہ کیا ہے"

"ہاں میں گواہ ہوں ۔ مگر تم چپو سنبھالو کشتی کیسے ڈگمگا رہی ہے ؟"

بوڑھی عورت اب پرسکون تھی ۔ آسمان بالکل سیاہ پڑ گیا تھا ۔ اتنا سیاہ کہ اب اسے اپنے بیٹے کا چہرہ بھی نہیں رکھ رہا تھا ۔

"تم کہاں ہو ؟"

"میں یہیں ہوں اور چپو تھامے رہا ہوں ۔ تم فکر مت کرو بس دل ہی دل میں طوفان تھمنے کی دُعا کرو"

"دعا میں طاقت ہوتی تو وہاں خیمے نہیں بنتے اور خیموں میں لڑائیاں نہیں ہوتیں ۔ دعائیں اپنا اثر کھو چکی ہیں"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو ماں ۔ مگر کیا اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہم خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں"

"نہیں ۔ تم چپو ٹھیک سے چلاؤ ۔ جو ہوگا بہتر ہوگا"

سمندر کی لہریں گرج رہی تھیں ۔ کبھی کبھی کوئی بھیانک لہر اٹھتی اور کشتی بہت اُوپر تک اٹھ جاتی مگر دوسرے ہی لمحے ایک نئی لہر آتی اور کشتی کو بہت نیچے تک پھینک دیتی ۔

بوڑھی عورت زیرِ لب بڑبڑائی "یہ حرکت ہی زندگی ہے اور انسان بہرحال سب سے طاقتور جانور ہے"

نوجوان خاموش رہا ۔ شاید اس لئے کہ اب وہ بوڑھی عورت کے لہجے میں جھوٹ

محسوس کر رہا تھا۔ اندھیرے کے باوجود اسے دِکھ گیا تھا کہ کشتی میں سوراخ ہو گیا ہے اور اب پانی اس میں داخل ہو رہا ہے اور اب اسے یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ سمندر بہرحال انسان سے زیادہ طاقتور ہے۔ کچھ ہی دیر میں یہ کشتی ٹوٹ جائے گی اور وہ سمندر کے رحم و کرم پر ہو گا۔"

"تم بولتے کیوں نہیں ؟" بوڑھی عورت کی آواز میں عجیب سی گرمی تھی۔

نوجوان نے اب بھی فیصلہ نہیں چھوڑا تھا۔ ماں تمہارے علم میں یہ بات ڈال دوں کہ اب یہ کشتی ہماری تھوڑی دُور کی ساتھی ہے۔ اس لئے کہ کشتی میں سوراخ ہو گیا ہے اور پانی بھرتا جا رہا ہے۔۔۔ ہم زندہ رہے تو۔۔۔"

بوڑھی عورت کی آواز لرز گئی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے ہمت سے کام لیا۔

"تم تیرنا جانتے ہو ؟"

"مگر سمندر کی لہریں سرکش ہیں"

"انسان سب سے زیادہ طاقتور جانور ہے۔ مجھے بھی تیرنا آتا ہے"

"مگر میرے مقابلے میں تیری ہڈیاں بوڑھی اور کمزور ہیں"

"تو بے وقوف ہے۔ مقابلہ نہیں جانتا۔ امتحان کے وقت بزدلی کو آواز دیتا ہے۔ دیکھ لینا میں کس بہادری سے تیروں گی"

نوجوان اب پُرسکون تھا۔

اور پھر ایک تیز لہر آئی۔ سمندر زوردار آواز میں گرجا۔ فضا میں ایک تیز چیخ گونجی۔ کشتی سمندر کی گہرائیوں میں جانے کہاں کھو گئی۔ طوفان آیا بھی اور طوفان گزر بھی گیا۔ اب سب کچھ شانت تھا۔ فضا شانت تھی۔ ایک ویران سا جزیرہ دِکھ رہا تھا اور اس غیر آباد سے لگنے والے جزیرے پر سمندر نے دونوں مسافروں کو لا کر پٹک دیا تھا۔

ذرا دیر میں نوجوان کو ہوش آ گیا۔ دماغ جھنجھنا رہا تھا۔ کپڑے پانی سے شرابور تھے۔ "اف" اس نے آنکھ کھولی۔ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سمندر کی لہریں اب خاموش تھیں۔ کچھ فاصلے پر درختوں کی قطار تھی، جو عجیب عجیب سے پھلوں سے لدے تھے۔ میٹھے ہوں گے اس نے سوچا۔ اب کرنا کیا ہے۔ جب قسمت یہاں لے ہی آئی ہے تو کچھ تو کرنا ہی

ہوگا۔

"انسان سچ مچ سب سے طاقتور جانور ہے"

نوجوان پنجے جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ دوسری طرف اس کی ماں بے سدھ پڑی تھی۔

"ماں بھی زندہ ہے"

نوجوان بوڑھی عورت پر جھک گیا۔ بوڑھی عورت کی آنکھیں بند تھیں۔ نبض دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ تو یہ زندہ ہے مگر ہوش نہیں۔ اسے پناہ چاہیئے مگر پناہ کہاں ملے گی؟ فوراً اسے خیال آیا کہیں اس جزیرے پر انسان نہ بستے ہوں ۔۔۔ اب انسان کہاں نہیں بستے۔ آبادی اتنی بڑھ گئی ہے کہ چاند ستاروں اور سیاروں پر بھی کھوج کرو تو قسمت کے مارے انسان مل جائیں گے پھر معلوم ہوگا کہ جگہ کی تنگی سے گھبرا کر چُپ چاپ یہ آدم کے بیٹے چاند ستاروں پر بھی اوڑھنا بچھونا لے کر نکل آئے ہیں۔ اس لئے اس جزیرے پر بھی آبادی ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ یہی سوچ کر نوجوان نے بوڑھی عورت کو آرام سے کندھے پر اُٹھا لیا جیسے شکاری رائفل یا سفری بیگ اُٹھاتے ہیں اور پناہ کی تلاش میں نکل گیا۔

پھر وہ چلتا گیا۔ شاید گھنٹوں گذر گئے تھے۔ دُور تک آدم زاد کا پتہ نہیں۔ بھوک لگی تو ایک درخت سے پھل توڑا۔ امید کے برعکس پھل کافی میٹھا تھا۔ پھل کھایا اور آرام کی سانس لی۔ قدم پھر تیز کیا اور اب اس کی آنکھوں میں دوبارہ چمک نمودار ہوئی تھی مگر یہ چمک فوراً بجھ گئی۔ پھر وہی خیمہ۔ وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

تو یہاں بھی ایک خیمہ ایستادہ تھا۔ بہت بڑا خیمہ۔ وہ ماں کو لئے تیز قدموں سے خیمے کی طرف بڑھا۔ خیمے کے اندر کا منظر وہ اس سے پہلے بھی اپنی دنیا میں دیکھ چکا تھا۔ اندر بہت سے لوگ تھے۔ سارے کے سارے سفید لباس میں۔ شاید عبادت کا وقت تھا اور وہ سجدے میں گرے تھے۔ منبر پر نورانی صورت والے ایک بزرگ بیٹھے تھے جو آہستہ آہستہ کچھ بدبدا رہے تھے اور کچھ عجیب سی آواز کمرے میں پھیل رہی تھی۔

دفعتاً نورانی صورت والے بزرگ نے اسے دیکھ لیا۔ اب ان آنکھوں سے حیرت برستی تھی۔

"ٹھہرو" وہ تیز آواز میں بولے۔ سجدے میں گرے ہوئے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بزرگ نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھایا۔ ان سب کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک تھی۔ دفعتاً نورانی صورت والے بزرگ بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور اس سے دریافت کیا۔

"نوجوان تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ لباس سے تو ہمارے خیمے کے نہیں لگتے۔ پھر یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"خیمے؟" نوجوان پھر چونک گیا تھا "یہ میری بوڑھی ماں ہے" اس نے اشارہ سے بتایا "بیہوش ہے، ہمیں پناہ چاہیئے"

"پناہ۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کیا تمھارا تعلق ہمارے خیمے سے ہے؟"

"نہیں۔ ہم اجنبی ہیں"

"اجنبی!" بزرگ کے ہونٹوں پر مایوسی تھی "افسوس نوجوان تمھارے لئے اس خیمے میں کوئی جگہ نہیں۔ تم کوئی دوسری جگہ تلاش کرو" اسی کے ساتھ بزرگ پلٹے۔ باقی لوگ پھر سے عبادت میں منہمک ہو گئے۔

نوجوان کچھ دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر کمزور چالوں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس کے قدموں میں نقاہت آگئی تھی۔ بوڑھی ماں کا وجود وزن دینے لگا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک بار پھر ٹھہرا۔ آنکھوں میں تھوڑی چمک لہرائی۔ یہاں بھی ایک خیمہ نصب تھا۔ کافی بڑا خیمہ۔ نوجوان تیزی سے آگے بڑھا۔ خیمے کے آگے رُکا۔ اندر جھانکا اور پھر اپنی جگہ جیسے تھم گیا۔ اندر ایک نیتا جیسا آدمی سفید ٹوپی پہنے، کھادی کے کرتے پائجامے میں ملبوس ہاتھ نچا نچا کر تقریر کر رہا تھا۔ باقی لوگ سن رہے تھے۔ سب کا لباس ایک جیسا تھا۔ سفید ٹوپی اور سفید کھادی کا کرتا پائجامہ۔

"شاید یہاں پناہ مل جائے" نوجوان نے سوچا۔

اور یہاں بھی وہی حادثہ ہوا۔ تقریر کرنے والے شخص نے اسے دیکھ لیا۔ پھر تقریر روک کر وہ حیرت سے اس کی طرف لپکا۔ اس کے ہونٹوں پر بھی وہی مکالمہ تھا۔

"نوجوان۔ تم تو ہمارے خیمے کے نہیں لگتے۔ تمھارے سفید ٹوپی بھی نہیں۔ ہماری طرح کُرتا پائجامہ بھی نہیں۔ پھر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"پناہ ۔۔۔ پناہ چاہیئے۔"

"پناہ" اب وہ نیتا نما شخص ہنس رہا تھا۔ "افسوس نوجوان ہم تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر کہیں سے تم ہمارا لباس لے آؤ اور ہماری پارٹی جوائن کر لو تو ہم تمھیں پناہ دے سکتے ہیں۔"

لباس ۔۔۔ اور پارٹی ۔۔۔ نوجوان دھیرے سے بڑبڑایا۔ یہ اسے کہاں سے ملیں گے" اب وہ پُوری طرح ناامید ہو چلا تھا۔ اب وہ کہاں جائے۔ کہاں پناہ تلاش کرے۔ اچانک وہ چونک گیا تھا۔ کندھے پر پڑی ہوئی ماں کافی وزنی ہوگئی تھی۔ ایک جھٹکے سے وہ پلٹا۔ ماں اب ایک لاش تھی۔ بے حس و حرکت ۔۔۔ اور یہ لاش کافی وزنی ہوگئی تھی۔

"ماں مرگئی لیکن ماں کو کسی خیمے میں پناہ نہیں ملی۔"

نوجوان کے چہرے پر آگ سلگ رہی تھی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ ان تمام خیموں میں آگ لگا دے۔ ان خیموں نے اس کی ماں کی جان لی ہے۔ پھر اسے خیال آیا۔ خیموں کو جلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو بچ جائیں گے وہ پھر اپنا خیمہ بنا لیں گے ۔۔۔ پھر وہ کیا کرے ۔۔۔ اچانک ایک خوبصورت سا خیال اس کے دل میں آیا۔ کیوں نہ خود ہی ایک خیمہ بنا لے۔ ایک الگ خیمہ۔ پُرامید چالوں سے وہ آگے بڑھا۔ درختوں پر طیور چہچہا رہے تھے۔ مگر چلتے چلتے وہ پھر ٹھہر گیا۔ کچھ سوچ کر ماں کی لاش کندھے سے اُتاری۔ نہیں وہ خیمہ نہیں بنائے گا پھر اس میں اور ان خیموں والے میں کیا فرق رہ جائے گا۔ وہ کوئی خیمہ نہیں بنائے گا ۔۔۔

نوجوان اپنے فیصلے سے مطمئن تھا۔ ماں کی آخری رسم سے فارغ ہو کر وہ پھر ایک نئے سفر کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔!

— شب خون ۱۹۸۸ء ◆◆

تحفّظ

ہوش میں آنے پر دونوں نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا پھر آنکھوں آنکھوں میں کچھ سوالات ہوئے۔ نظر اُٹھاکے آس پاس کا جائزہ لیا گیا۔

ذرا ٹھہر کر بولا۔ "کچھ بھی سلامت نہیں ہے یار۔ سب برباد ہوگیا۔"

"ہش۔" دوسرے نے منہ پر انگلی رکھی۔ "آہستہ بول خیریت ابھی بھی نہیں ہے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو چھوکر اطمینان کرلیا۔

"خدا کا شکر ہے ہم بچ گئے مگر۔۔۔"

"سب کچھ لٹ گیا۔ ختم ہوگیا۔"

"وہ لوگ یہیں آس پاس ہیں۔" دوسرے نے کانا پھوسی کی۔ "ہم نے ذرا بھی آواز کی تو وہ ہمیں دیکھ لیں گے اور شوٹ کردیں گے۔"

"اب کیا کیا جائے۔"

پہلے نے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر ناامیدی سے آنکھیں بند کرتا ہوا بولا۔ "کچھ نہیں۔ اچھے آثار نہیں۔ سب مارے گئے۔" وہ تکلیف سے کراہا۔

دوسرے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "شی۔۔۔ خبر۔۔۔ مل گئی تو۔۔۔ جان سے مار ڈالیں گے۔ دیکھتے نہیں کچھ فاصلے پر سائے جیسے لوگ نظر آرہے ہیں۔"

پہلے نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "اب کیا کیا جائے؟ کیا ساری ساری رات۔۔"

"نہیں" دوسرے نے اِدھر اُدھر کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ یہاں رہے تب بھی مارے جائیں گے۔ ٹہلتے ہوئے وہ کسی وقت بھی یہاں پہنچ سکتے ہیں"

"پھر ہم کہاں جائیں گے؟"

"کوئی نہ کوئی ٹھکانہ ڈھونڈنا پڑے گا"

"بہت دیر ہو گئی ہے"

"شاید ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا ہو" پہلے کو خوف محسوس ہوا۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ہمیں مرا ہوا سمجھ کر آگے بڑھ گئے ہوں"

"وہ دوبارہ ہماری تلاش میں لوٹ سکتے ہیں، کہ مُردے کہاں گئے" پہلے نے تشویش ظاہر کی۔

"تحفظ کہیں نہیں ہے۔ کہیں نہیں ہے" دوسرا بڑبڑایا۔ "نہ فساد سے پہلے تھا نہ فساد کے بعد، مگر خود کو یوں موت کے حوالے چھوڑ دینا بھی تو عقل مندی نہیں۔ اب جب کہ ہم بچ چکے ہیں تو۔۔"

"اپنی حفاظت بھی تو ضروری ہے" پہلے نے جملہ پورا کیا۔

"مگر ساری ساری رات ۔۔۔ تمھیں بھوک نہیں ہے؟"

"ہے تو!" دوسرے نے غصّہ میں کہا۔ "سمجھو ہم جنگ پر ہیں اور سب سے ضروری چیز جان بچانی ہے"

"تحفظ کہیں نہیں ہے" پہلا بڑبڑایا۔

دوسرے کے چہرے پر اچانک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اندھیرے میں اسے کچھ دکھ گیا تھا، سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "مل گئی، مل گئی جگہ۔ وہ ٹوٹا پھوٹا گھر دیکھ رہے ہو۔ باہر اکھڑی ہوئی کواڑ بھی ہے۔ ہم دوسری منہدم عمارتوں سے وہاں زیادہ محفوظ ہیں"

"وہ ملبہ تھا۔۔"

"ہاں ۔۔۔ شاید وہاں اطمینان سے رات بسر کر سکیں" دوسرے نے اشارہ کیا اور

آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔

"شی۔۔۔ آواز نہیں ہو"

پہلے نے بھی منہ پر انگلی رکھی۔

"آواز نہیں ہوگی"

دونوں چپ چاپ بغیر آواز نکالے دبے دبے سرکتے رہے۔

"ڈر لگ رہا ہے نا۔۔۔؟"

"ہاں!" پہلے نے خوف ظاہر کیا "سب مارے گئے"۔

"اپنے بچنے کی خوشی نہیں ہے"

"ہے تو۔ زندگی ایک قیمتی شے ہے۔ سب سے قیمتی شے ہے"

پہلا بڑبڑایا "مگر دُور پر زندگی چھیننے والے بھی ہیں۔ اب سوال ہے زندگی بچائی جائے تو کیسے؟"

"جیسے ہم تحفظ کے لئے جگہ کھوج رہے ہیں" اس نے پھر ہونٹوں پر انگلی رکھی "شی۔۔ آہستہ آہستہ۔۔۔ پتہ بھی نہیں کھڑکے۔ کچھ معلوم نہیں ہو۔۔"

سرکتے ہوئے دونوں ملبے نما مکان میں داخل ہو چکے تھے "اب اطمینان ہے" پہلا اینٹوں کی آڑ لے کر بولا۔

"نہیں۔ اب بھی نہیں۔ اب بھی ہم محفوظ نہیں ہیں۔ مگر زندگی سب سے قیمتی شے ہے"

"لگتا ہے یہاں کا بھی سب کچھ لُٹ گیا۔ ایک ایک سامان۔ کچھ بھی نہیں چھوڑا کمبختوں نے"

"اینٹے، پتھر۔۔۔ یہ سب تو باقی ہیں" دوسرے نے طنز کیا مگر اچانک اسے کچھ یاد آگیا "مگر۔۔۔ یہاں ہم محفوظ نہیں۔ ہمیں بات چیت سے پرہیز کرنا چاہیئے"

"سوال ہے، ہم یہاں حفاظت سے ہیں یا نہیں"

"شاید نہیں" دوسرے نے تشویش ظاہر کی۔ "وہ لوگ زیادہ دُور نہیں۔ ہم کبھی بھی انھیں نظر نہیں آسکتے ہیں"

"تحفظ کہیں نہیں" پہلا زیرِ لب بڑبڑایا۔ اچانک جانے کیا ہوا، وہ زور زور سے کانپنے لگا۔ پھر ڈرے ڈرے لہجے میں بولا ..."سُنو... مجھے کھانسی ہو رہی ہے..."

"نہیں..."

"لیکن..."

"نہیں... نہیں... خدا کے واسطے..."

"مجھ سے کھانسی اب برداشت..."

"نہیں پلیز نہیں۔ وہ لوگ آجائیں گے..." دوسرے نے آس پاس کی وحشت کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"مگر اب نہیں کھانسنے..."

"ٹھہرو" دوسرے نے دبی آواز میں ڈانٹا۔

"اندر آؤ۔ شاید کوئی اور محفوظ مقام ہو..."

"اندر... اندھیرا بہت ہے..." پہلے کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔

دوسرے نے پہلے کا ہاتھ پکڑ لیا، اور اندر سرنگ جیسی شے میں دونوں اُترتے چلے گئے...

"ہم کہاں آگئے؟"

"یہاں تم کھانس سکتے ہو"

اور پہلے نے بولنے سے قبل ہی زور سے چھینک ماری... آخ... چھیں...

پھر وہ سنبھلا۔ "کچھ محسوس کر رہے ہو تم... میں باس محسوس کر رہا ہوں"

دوسرے نے بھی ناگواری سے ناک بند کی۔ "ہاں، بہت باس ہے۔ شاید ہم لوگ..."

"تم ٹھیک کہتے ہو، بہت باس ہے"

"مگر..."

اچانک پہلے کا ہاتھ کسی تیسرے سے اور دوسرے کا کسی چوتھے سے جا ٹکرایا۔

"کون ہے؟" دونوں ایک ساتھ چیخے۔

"کون چھپا ہے" دونوں اندر ہی اندر کانپ گئے۔

"ہم ہیں۔"
تیسری اور چوتھی آواز بھی کانپتی ہوئی اُبھری ـــ "تمھاری طرح ہی تحفّظ کے مارے۔۔۔"
"نام؟" ایک ساتھ دونوں نے پوچھا۔
اور نام سُن کر دونوں چونک گئے۔
"تم تو۔۔۔ ہاں تم تو۔۔۔ وہ نہیں ہو۔۔۔ مگر دوسرے نے پھر لمبی سانس کھینچی۔ "خیر کوئی بات نہیں۔ مگر ہے نا عجیب بات۔۔۔ کہ ہم تمھارے ڈر سے اور تم ہمارے ڈر سے۔۔۔"
مگر یہاں سب کے لئے تحفّظ ہے۔"
ان دونوں نے پھر کہا کتنی باس ہے۔
اس بار ادھر سے بھی دونوں مسکرائے اور ایک ساتھ بولے۔
"ہاں بہت باس ہے۔ بہت باس ہے۔"

جمنانٹ، قرطاس ۱۹۸۸ء
ہندی جن سنسار،
◆◆

تحریکیں

مجھے یہ احساس تھا کہ میں بدل رہا ہوں۔ میں تھوڑا تھوڑا کر کے بدلنے لگا ہوں۔ دوستوں کے درمیان بھی اب پہلے والی وہ بات نہیں رہی۔ وہ بات بات پر قہقہے لگانا لطیفے سُنانا۔ شاید صرف میں ہی نہیں بدلا تھا بلکہ دوست بھی آہستہ آہستہ بدل رہے تھے۔ ایک ایک کر کے سارے دوست۔ اور جیسے یہ احساس مجھ کو تھا ویسے ہی الگ الگ یہ احساس سب کو تھا۔ بند کمرے میں اپنا احتساب کرتے ہوئے ایسا احساس ہونا تو واجب تھا۔ مگر دوستوں کے جھنڈ میں اپنے آپ پر نقاب ڈالتے ہوئے ہر کوئی اپنی بات دوسروں پر الٹ دیتا۔ زاہد تم بدلتے جارہے ہو۔ جاوید میں اب وہ پہلی والی بات نہیں رہی۔ مشرّف نے اب گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا ہے۔ سنجیو میں بھی کیسا زبردست چینج آیا ہے۔ ایک شام ہی تو رہ جاتی ہے، جب اکیلے پن سے گھبراتے ہوئے دوستوں کے ساتھ یونہی سڑکوں پر گھومنے کی خواہش ہوتی ہے کہ کچھ تفریح کر لی جائے، مگر خاک تفریح ——— ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی بے چینی اور بیکاری کی کہانی لے کر بیٹھ جاتا۔ پھر فریسٹریشن کا چیختا ہوا پرندہ اپنی بے سکوں اور منحوس آواز سے ہم سب کو خاموش کر دیتا۔ کچھ دیر کے لئے ماحول میں سنّاٹا چھا جاتا۔ پھر ذرا ٹھہر کر سنجیو کی آواز اُبھرتی۔ "چائے پلاؤ گے مشرّف"! ایک دم سے سنّاٹے میں آجاتا ہوں۔ پاکٹ میں پیسے نہیں ہیں۔ یہ عمر بھی عجیب ہوتی ہے کہ گھر سے پیسے مانگنے میں شرم آتی ہے۔ نِٹھلّا۔ بیکار آدمی۔ روز روز اپلی کیشن کے فارم بھرنے کے بعد بچتا ہی کیا ہے۔ مگر یہ کیفیت صرف میرے ساتھ تو نہیں بلکہ اس پورے

گروپ کے ساتھ بھی ہے۔ سنجیو، زاہد، جاوید، سمن سب کے ساتھ ہی۔ سب چائے کے نام پر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کتنے سوال بنتے ہیں اور ٹوٹتے ہیں کہ چائے کون پلائے گا۔ کون پلائے گا چائے؟ مگر یہ ذلت میرے لئے دوسروں سے کچھ زیادہ ہے اس لئے کہ سنجیو نے یہ سوال سب سے پہلے مجھ سے کیا ہے اور اگر نہیں پلا سکا تو، رات میں بھی یہی سوال دیر تک بستر پر چبھتا رہے گا۔ اس لئے کبھی کبھی جی کرتا ہے، گھر آئے ہوئے دوستوں کو "منہ" کہلوا دوں۔ سب کے سب آنے کے بعد چائے کا توپ داغ دیتے ہیں۔ باپ کے "فری ہوٹل" سے کس کس کو مفت چائے پلائی جائے؟ اسی لئے اب پرانی ساری کہانیاں ایک ایک کرکے بند کر دی گئی ہیں۔ پکنک منانا، تفریح کرنا، ہوٹل بازی، سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ شعر و شاعری کا ماحول، گپ بازی، ہنگامے، سب کے ہونٹوں پر قفل پڑ گیا ہے۔ گھر کا چیختا سناٹا اندھیرے میں کیسے کیسے سوال کرنے لگتا ہے اور جب کوئی نہیں بولتا تو گھر کے ہی در و دیوار ایکدم سے گار جین بن کر اندر کے بیکار آدمی کو طرح طرح کے خونخوار سوالوں سے زخمی کرنے لگتے ہیں۔ ایسے میں کچھ اور تو نہیں ہوتا ہاں ایک طرح کا چڑچڑا پن اندر سما جاتا ہے اور برسوں سے اندر سویا ہوا کتا ایکدم سے اجنبی بن کر اپنے ہی دوستوں پر بھونکنے لگتا ہے۔ دوستوں میں لڑائی کب نہیں ہوتی مگر یہ لڑائی اب روز روز سننے میں آنے لگی ہے۔ روز ہی کچھ نہ کچھ نئی خبر معلوم ہوتی۔ جاوید، مشرف پر بگڑ گئے۔ سنجیو شمیم میں جھگڑا ہو گیا۔ زاہد، سمن ایک دوسرے سے خفا چل رہے ہیں۔ کچھ دیر کا جھگڑا اور پھر میل ملاپ۔ دراصل یہ سب اسی ایک چڑچڑے پن کی کہانی لگتی ہے جو تنہائی میں سینکڑوں ہزاروں طرح کے آوارہ پلوں کو جنم دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے... اپنا آپ نوچنے کے لئے... تھوڑا تھوڑا کرکے خود کو توڑنے کے لئے...!

"ہم سب بیکار ہیں اور شہر میں تحریکیں بڑھتی جا رہی ہیں" کبھی چلتے چلتے میں پوچھ بیٹھتا تو سنجیو ایکدم سے میری بات کاٹ دیتا۔ بڑی بڑی باتیں کہتے ہوئے جب اچانک اپنے کھوکھلے ہونے کا احساس جاگتا ہے تو لگتا ہے کسی بھی اس طرح کے پوچھے گئے سوال سے کوئی پرتیچے (تعارف) نہیں ہے ہمارا۔ جنم سے ہی اپاہج رہے ہیں ہم۔ پارالائزڈ کر دیا گیا ہے ہمارے اندر کے آدمی کو۔ کھوکھلا اور نپنسک (نامرد)۔ اب تمام باتیں اصلیت کی آڑ میں چوٹ کرتی ہیں اور سامنے دکھتا

ہے۔ سڑے ہوئے گوشت والا بدبودار آدمی ۔۔۔ بیکار آدمی ۔۔۔"

سنجو چپ ہے ۔۔۔ شاید سب ہی چپ ہیں۔ مگر یہ سفر جاری ہے اور ایسے کتنے ہی سفر جاری رہیں گے۔ سڑک پر چلتے چلتے ٹھہر گئے ہیں ہم۔ کوئی جلوس پار کر رہا ہے۔ نعرے لگ رہے ہیں۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے۔ شعلہ بار تقریریں۔ بھنچی ہوئی مٹھیاں اور سلگتے ہوئے نعرے۔۔۔

سب نعرے جاگ رہے ہیں اور ہم سو رہے ہیں۔ دراصل اب ان سوالوں کی لکھا پڑھی کا کام چھوڑنا ہوگا جو اکیلے میں۔ اپنے آپ سے کئے جانے والے ندامت آمیز سوالوں پر ٹھنڈے سرد گوشت میں تبدیل کر دیتے ہیں ہمیں۔ اب تو ہر بات چوٹ کرتی ہے اور ایسے میں اچھی بُری بات کی تمیز نہیں ہو پاتی۔ لوگ باگ صرف اُس آدمی کو دیکھتے ہیں جو چڑچڑا ہو گیا ہے، اس آدمی کو نہیں دیکھ پاتے جو ہر دم اپنے آپ سے لڑتا رہتا ہے۔ ایسے میں کچھ بھی سچ نہیں لگتا۔ عشق محبت وغیرہ کی باتیں بھی کتابی جان پڑتی ہیں۔ دراصل ہم سب اپنے نکمّے ہونے کے پاگل کر دینے والے احساس میں گھر گئے ہیں۔ چلتے ہوئے ہنسی مذاق کے اس اوباؤ ماحول میں پھر وہی سوال ہمیں روک دیتا ہے۔ کون چائے پلائے گا ۔۔۔ کون پلائے گا چائے؟ آوارہ چلتے ہوئے اندر گرمی بھرنے کا احساس ایکدم سے سب کو ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھنے پر مجبور کر دیتا ہے ۔۔۔ کون پلائے گا؟ اس بات پر پھر ایک قہقہہ بلند ہوتا ہے۔ مگر میں بھی جانتا ہوں اور سب جانتے ہیں۔ ابھی ہم میں سے ہی کوئی نوکری کی بات چھیڑ دے گا اور سب اُداس ہو جائیں گے۔ ایک لمبی چپّی اختیار کر لیں گے۔ پھر کچھ نہیں ہوگا۔ سوائے اس فرسٹریشن والے جانور کے، جو اندر ہی اندر اپنا پوسٹ مارٹم کرتا رہے گا۔ اپنے آپ کو چیرتا پھاڑتا ملے گا۔ نکمّے بیکار آدمی۔ سڑک چھاپ۔

یہ سب کچھ سچ نہیں ہے سنجو۔ سڑک کی دھول چھانتے ہوئے ذرا ٹھہر کر اپنے آپ کو تسلی دے کر سمجھانے والا یہ کھیل بھی اب پرانا ہوتا جا رہا ہے۔ اب دل نہیں مانتا۔ دل صرف گالیاں دیتا ہے۔ کبھی ایجوکیشنل سسٹم کو۔ ان امپلائمنٹ کے نام پر گھٹیا ویوستھا کو، کبھی اپنے چھوٹے سے شہر کو اور کبھی حکومت کے سرد رویّے کو۔ اور کبھی کبھی لک کو۔ لک جو فیوریبل نہیں ہے۔

ہر قدم پر لگتا ہے ایک مذاق بنتے جا رہے ہیں ہم۔ اُس برائٹ فیوچر کے نام پر جو ماں باپ نے کبھی دیکھے تھے۔ کبھی کبھی غصّے میں لگتا ہے، پُوری دُنیا میں آگ لگا دوں۔ کچھ غلط کر بیٹھوں۔ مگر اپنا آپ پھر بھی ٹھنڈا نہیں ہوتا!"

زاہد بول رہا ہے۔ اس کا چہرہ دیکھ رہا ہوں۔ لال چہرے پر تنی ہوئی گہری لکیریں۔ شاید سب ہی کچھ دُکھ بول رہے ہیں۔ بول کر اندر جمی ہوئی کائی کو باہر نکال رہے ہیں۔ دل کی بھڑاس نکالنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ مگر خود کو کیسے سمجھاؤں۔ ایسے میں ایکدم سے چُپ ہو جاتا ہُوں۔ ایکدم سے گونگا۔ ایسی باتوں سے اندر کوئی بات بھی نہیں اُٹھتی۔ بس دل اینٹھنے لگتا ہے۔ شاید دل کا مریض ہو گیا ہُوں۔ سوچتا ہوں گھر واپس لوٹنا چاہیئے مجھے۔ ان پریشان کر دینے والی باتوں سے ذہن ہٹانے کے لئے۔ روزانہ اس طرح کی باتیں دماغ کی تنی ہوئی نسوں کو ایک جھٹکے سے توڑ دیں گی۔ برین ہیمرج۔ اندر چلنے والی کارروائی سے جوجھتے ہوئے پھر بھڑ گیا ہوں۔ پھر کوئی جلوس پار کر رہا ہے۔ نعرے آسمان چھُو رہے ہیں۔ بہت لمبی بھیڑ ہے۔ دُور تک آدمیوں کے سر ہی سر نظر آ رہے ہیں۔۔۔

"تحریکیں جاری ہیں۔ بیکاروں کو اور کوئی کام نہیں رہ گیا ہے۔" روز روز ایک سے نعرے، ہڑتال، بندی، کیا ملتا ہے ان کھوکھلی پُکاروں سے۔ سلگتے نعروں سے، ملک کی جڑیں کمزور کرتی جا رہی ہیں یہ تحریکیں۔ تم کیا سوچتے ہو جاوید؟"

ہم پانچوں ٹھہر گئے ہیں۔ دُکان پر ٹھنسے ہوئے دوسرے لوگوں میں شامل۔ نعروں میں اپنی آواز بھی کھو رہی ہے اور جاوید کہہ رہا ہے۔ "ہاں یار یہ سچ ہے۔ تحریکیں توڑ رہی ہیں، تھوڑا تھوڑا کر کے اس ملک کو۔ روز پنپتی ہوئی ان تحریکوں سے کسی کا بھی بھلا نہیں ہو گا۔ نہ ملک کا، نہ اپنے آپ کا۔ مگر یہ بات بھی تو سوچنی ہو گی کہ روز روز یہ تحریکیں جنم لیتی ہی کیوں ہیں؟" اس کی ضرورت کیوں پڑتی ہے، کہیں نہ کہیں اس میں حکومت کی وہ کمزوری ضرور شامل ہے، جو ان تحریکوں کی وجہ بنتی ہے۔ دراصل ٹکڑے ٹکڑے ہم بھی ٹوٹ رہے ہیں اور مُلک بھی ——"

"ہم بھی اور مُلک بھی ۔ ۔ ۔"

جلوس پار کر گیا ہے مگر سب چُپ ہیں۔ جاوید کی بات سے کاٹھ مار گیا ہے۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ چلتے رہے سب چُپ چاپ۔ بجتے ہوئے نعرے جلوس کے بہت دُور نکل جانے پر بھی

اب تک کانوں میں گونج رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا، میں کتنا تھک گیا ہوں اور تھکا گئے ہیں یہ لوگ۔ ایسا کہتے ہوئے ان سے روز ملتے ہوئے، روز ہی کچھ نہ کچھ زیادہ ٹوٹتا ہوا محسوس کرتا ہوں خود کو ـــــ آخر کیا ملتا ہے ان باتوں سے، اندر کے کھوکھلے پن کا احساس دلانے سے، گزرے ہوئے کو بغیر محسوس کئے کیوں نہیں دیکھا جائے کہ زندگی بغیر سوچے اور محسوس کئے ہوئے بھی تو گزر سکتی ہے... مگر کوئی یہ نہیں چاہتا۔ سب رُک کر اور پلٹ کر ضرور جھانکتے ہیں۔

"کہاں کھو گئے ہو تم؟" سنجو مسکراتے ہوئے پوچھ رہا ہے۔

"نہیں۔ نہیں یار، کہہ کر خود بھی محسوس کرلیتا ہوں۔ آواز تھوڑی بے جان ہو گئی ہے میری۔ شاید اندر سے لہو لہان کر دیا گیا ہوں۔ اب ان میں سے کسی سے بھی نہیں ملوں گا۔ سب یہ بات پریشان کر دیتے ہیں مجھے۔ اور ہر بار سوچتا ہوں میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے انہیں دینے کے لئے... یہاں تک کہ چائے پلانے کے لئے بھی نہیں ..."

دو چار روز سے یہی کر رہا ہوں۔ دوست آتے ہیں اور بڑی بے دردی سے "نا"، کہلوا دیتا ہوں۔ نہیں چاہتے ہوئے بھی۔ گھر کے لوگ گھور کر دیکھتے ہیں مجھے۔ جیسے مجھے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ روز روز ملنے والے دوستوں سے اس طرح کیوں کترا رہا ہوں۔ کتابوں میں سر دیئے دروازے پر میرے نام کی کوئی بھی دستک پاتے ہی، ہاتھ کے اشارے سے کہلا دیتا ہوں۔ کہہ دیجئے کہ گھر میں نہیں ہے۔ جانتا ہوں، وہ تمام دوست سمجھ رہے ہوں گے۔ مشرف ملنے سے کترا رہا ہے، کیا وجہ ہے۔ کیوں ملنا نہیں چاہتا۔ پھر خود ہی دس طرح کی کہانیاں گڑھ لیں گے۔ کہیں گیا ہوگا۔ کچھ مستی کر رہا ہوگا۔ مگر ہر بار اپنے اس رویئے پر اپنے آپ کو توڑتے ہوئے خود سے کتنا جھیلتا ہوں میں۔ یہ کون جان سکتا تھا۔ سامنے والے خالی دنوں کی تکان کا ایک لمبا سلسلہ بے سوچی سمجھی اسکیمیں، من گھڑت خیالی پلاؤ۔ اب سب باسی ہو رہے ہیں۔ بے چینی کے اُباؤ، سڑے ہوئے پتو پورے وجود میں ناچ رہے ہیں، بھیں بھیا رہے ہیں، مگر نہیں۔ کچھ شانت ہوا ہوں۔ بھیم سین سے اس اچانک ملاقات نے کچھ شانت کر دیا ہے مجھے۔ بیکاری میں کئے جانے والے اس فیصلے سے میں مطمئن ہوں۔

تحریکیں زور پکڑتی ہیں تو پکڑیں، ان میں شامل ہونے میں نقصان ہی کیا ہے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ان بے سر پیر کی تحریکوں میں اپنا دلی جذبہ بھی شامل ہو۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لیا تھا۔ خالی دنوں کی تکان کو بھرنے کے لئے اور چائے پانی کے انتظام کے لئے اب یہ ایک طرح سے میرے لئے ضروری ہو گیا تھا۔

بھیم سین سے جب میں بہت پہلے ملا تھا تو وہ ایک غیر سرکاری اسکول میں معمولی سا ٹیچر تھا اور میں معمولی سا طالب علم۔ ادھر اس غیر سرکاری اسکول کی قسمت میں اندھیرا لکھا گیا تو بھیم سین کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ اس دن گوپالی چوک پر بنے ہوئے پبلک منچ پر بہت سے لوگوں کے ہمراہ مجھے بھیم سین بھی نظر آیا جو کھادی کا کرتا پائجامہ پہنے زوردار آواز میں تقریر کر رہا تھا۔ کافی لوگ جمع تھے۔

"یہاں روز ہی بھیڑ رہتی ہے۔" ایک شخص کہہ رہا تھا۔ "روز ہی نیا نیا ڈیمانڈس لے کر یہ لوگ یہاں بھیڑ لگا دیتے ہیں۔ کچھ پمفلٹ بانٹ دیئے۔ کچھ اشتہارات دیواروں پر چپاں کر دیا اور آگ اگلتی تقریر جھاڑ دیا۔ بس ان کا منشا پورا ہو گیا۔"

میں غور سے بھیم سین کو دیکھ رہا تھا۔ تقریر ختم کرنے کے بعد وہ ڈائس سے نیچے اتر آیا۔ کچھ لوگ اسے اب بھی گھیرے ہوئے تھے۔ ان سے نمٹنے کے بعد وہ مجھ سے ملا۔

"کیا کر رہے ہو آج کل؟"

"کچھ نہیں۔ آپ کی تقریر سن رہا تھا ماسٹر جی!"

"ماسٹر جی نہیں۔ ایک نیا دھندہ شروع کیا ہے آجکل۔ تحریکیں چلاتا ہوں۔ آؤ چائے پیتے ہیں۔"

بھیم سین زبردستی مجھے چائے پلانے لے گیا۔ وہیں اس نے اپنی گپ چھیڑ دی۔ "ہندوستان بہت بڑا ملک ہے دوست۔ یہاں نوکریوں کی کمی نہیں۔ بس ذرا ہوشیاری اور دماغ چاہیئے۔ اب مجھے دیکھو۔ اسکول ختم ہو گیا تو تحریکیں چلانے والے اس گروپ میں شامل ہو گیا۔ اور یہ ایسا دھندہ ہے جو کبھی مندہ نہیں ہو گا۔"

"مطلب؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

بھیم سین ہنسا۔ "تم روز ہی دیکھتے ہوگے بندی، ہڑتالیں، روز روز جلوس نکل رہے ہیں۔ کبھی حکومت کے خلاف، کبھی اپنی مانگوں کو لے کر۔ کبھی خراب ویوستھا کو لے کر۔ پانی، بجلی اور بھرشٹاچار کو لے کر۔ بڑے بڑوں کے مفاد چھپے ہوتے ہیں ان میں۔ اور سوچو اتنے لوگ آتے کہاں سے ہیں۔ میں خریدتا ہوں انھیں۔ یہ ٹھیکہ اپنا ہے۔ آدمی ٹھیک کرتا ہوں اور جلوس تیار۔ کون سا ایمان جاتا ہے اس میں۔"

بھیم سین ہنس رہا تھا۔ "ہمارے ملک کی جنتا بہت سیدھی سادی ہے، کٹھ پتلیوں کی طرح۔ جب جی چاہے اشارے پر نچالو۔ آسانی سے بیوقوف بنالو۔ واقعات یہاں ہوں یا کہیں اور کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مخالف جماعتوں کو جلوس سے کام ہوتا ہے۔ بھوپال گیس ٹریجڈی ہو یا نیلی کانڈ یا روز روز ہونے والے رائٹ یا فساد ہوں۔ اب دیکھو پارٹیاں کیا کرتی ہیں غریب جنتا کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا اور بس اس کا فائدہ اٹھالیا۔ اس دھندے میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کوئی دن مندہ نہیں جاتا۔ روز روز کچھ نہ کچھ واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور ان کا ردِعمل جلوس کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ لوگ سوچتے ہیں جنتا جاگ رہی ہے۔ بیدار ہو رہی ہے۔ ان تحریکوں سے گرمی آگئی ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے بس اپنا دھندہ چمکتا رہتا ہے۔ ابھی پچھلے سال الیکشن میں تو یہ دھندہ اور بھی چمک رہا تھا۔ اور دوسرا فائدہ ہے ....."

بھیم سین نے چائے ختم کرتے ہوئے کہا۔ "لائم لائٹ میں آجانے سے لیڈر بننے کا موقع ملتا ہے پھر الیکشن کی بازی اپنے ہاتھ میں۔"

بھیم سین کی باتوں میں میری دلچسپی بہت حد تک بڑھ گئی تھی۔ کچھ سوچتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "ایک آدمی کو کتنا دیتے ہوں گے آپ؟"

"ایک گھنٹہ بھونکنے کا دس روپیہ۔ پارٹی تگڑی ہوئی تو پندرہ اور بیس تک کے فائدے ہو جاتے ہیں۔ مگر وقت زیادہ دینا پڑتا ہے۔" بھیم سین نے اس بار غور سے میری طرف دیکھا۔ فرصت میں ہو تو میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ کل مزدوروں کی طرف سے ایک بڑا جلوس نکلنا ہے۔ مطالبے کے لئے ڈی ایم کے یہاں بھی جانا ہے۔ اس دھندے میں آگے نکلنے کے بہت امکانات ہیں۔"

میں دیکھ رہا تھا۔ بھیم سین مجھے تول رہا ہے۔ بلی جیسی چمکنے والی اس کی آنکھوں نے کھرے سونے کی طرح مجھے اپنی آنکھوں میں اُتار لیا ہے۔ صرف ایک گھنٹہ اور دس روپے۔ سودا بُرا نہیں ہے۔ ایسا سوچتے ہوئے اندر کے اس برائٹ فیوچر والے آدمی کو توڑتے ہوئے کیں کس سطح پر اتر گیا تھا، یہ میں جان رہا تھا مگر اب میں نے ارادہ کر لیا تھا۔ میں بھیم سین کے ساتھ تحریکیں چلانے والے گروپ میں شامل ضرور ہو جاؤں گا اور میں شامل ہو بھی گیا تھا۔

پہلے دن کا تجربہ تو کچھ عجیب سا رہا۔ بہت سی جانی پہچانی آنکھوں کو اپنی طرف اُٹھتے ہوئے دیکھ کر کچھ عجیب سا ضرور لگا۔ مگر یہ سوچ کر خود کو چُپ کرا لیا کہ لیڈر بننے کے لئے کچھ نہ کچھ ہتھکنڈے تو کرنے ہی پڑتے ہیں۔ گوپالی چوک، چتر توئی روڈ ہوتا ہوا جلوس اب ڈی ایم کے احاطے میں داخل ہو گیا تھا۔ چلاتے چلاتے آواز بھاری ہو گئی تھی۔ بھیم سین نے کئی بار مسکراتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اب میرا کام ختم تھا۔ دس کا پتہ پکڑتے ہوئے تھوڑی کمزور چال سے بار بار ضمیر کی آواز کو بے بنیاد تسلیوں سے روکتے ہوئے بھیم سین کی آواز ہی برابر کانوں میں گونج رہی تھی " کل پھر ملوں گا۔ کل پھر ایک جگہ جانا ہے۔

کل ... روز کے دس روپے۔ یعنی مہینے کے تین سو روپے۔ روز کئی جلوس اٹینڈ کرو تو مہینے میں چھ سو روپے بھی بن سکتے ہیں یا پھر بھیم سین بن جاؤ تو مفت میں ہزاروں روپے کے فائدے ہیں مگر کھوکھلے بے سُرے نعروں میں تمام تر تسلّیاں سو گئی تھیں۔ جاگ گئے تھے تو صرف سکّے ... جو اس وقت میری جیب میں بج رہے تھے۔ جو ایک تھکے ماندے اپاہج قدم کو گھسیٹتے ہوئے گھر لے جا رہے تھے۔ پھر ایسا کتنی ہی بار ہوا جب ایک اپاہج آدمی کو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے اندر پناہ دینی پڑی۔ اندر کی تکلیف کا اندازہ تھا مجھے۔ جانتا تھا اب تسلّیاں بیکار ہو گئی ہیں۔ مگر دوستوں کے ساتھ ندامت اور شرمندگی جیسی کوئی بات اب میرے ساتھ نہ تھی۔ ہاں اتنا ضرور تھا۔ اپنے کھوکھلے قہقہے اب خود ہی پہچاننے لگا تھا میں۔ دوستوں میں حاتم طائی جیسا دبدبہ رکھنے کے باوجود اپنے اندر کے بھیم سین کو پہچان گیا تھا۔ اب ساری باتیں جھوٹی معلوم ہو رہی تھیں۔ دوستوں کی بڑی بڑی باتیں اب انجانی سی لگنے لگی تھیں۔ اخبار، ریڈیو، ٹی وی کی کھوکھلی بے بنیاد اصلیت بھی اب پوری طرح سامنے آچکی

تھی۔ ایک توازن چاہتے ہیں سب۔ اپنے آپ کی زندگی محسوس کرنے کے لئے بھی۔ ملک میں زندگی کی برقی کرن کے لئے بھی۔ توانائی محسوس کرنے کے لئے بھی ۔۔۔ ہر طرف سے ہونے والی یہ بے زبان کارروائیاں ہی دراصل زندگی ہیں، حرارت ہیں اور توازن کا رویّہ بھی ۔۔۔ سارا کھیل اسی کا ہے۔ میں سب کچھ جان رہا تھا اور جانتے ہوئے تھکے ہونے کا احساس اب پوری طرح مجھ پر حاوی ہو گیا تھا۔ شہر کا ایک سرگرم رکن ہونے کے باوجود اندر کے بے زبان جانور کی گالیاں بھی روز روز کھانے کا عادی ہوا جا رہا تھا۔ کتنی ہی کمیٹیوں سے جڑے ہونے کے باوجود اندر سے پوری طرح خالی ہونے کا احساس روز ہی مجھے کروسی فائیڈ crucified کرنے کے لئے کافی ہوتا۔ دوستوں سے کیسے کہتا کہ اب چائے پلانے کے لئے پیسے تو ہیں میرے پاس، لیکن اب تم سے زیادہ نکمّا بن گیا ہوں ۔۔۔ برائٹ فیوچر کے نام پر روز روز ہونے والے مکالموں سے جاگتے فریسٹریشن کے کیڑوں میں کچھ صداقت ہو یا نہ ہو ۔۔۔ اندر کے جُڑاؤ کا وہ احساس تو ضرور تھا جو ایک انرجی دیتا تھا خود کو ۔۔۔ جو روز تھکے ہوئے آدمی کے لئے ایک ٹانک کی طرح تھا۔

آج تین دن ہو گئے تھے۔ اُس آمرن بھوک ہڑتال کے لئے، زندگی کی آخری سانس تک لڑی جانے والی اس کارروائی کے لئے جو بھیم سین کی طرف سے لڑ رہا تھا۔ اپنے آٹھ دوسرے دوستوں کے ساتھ۔ غریب مزدوروں کے لئے۔ ان کے حق کے لئے۔ مزدوروں کا لیڈر ہو گیا تھا۔ پیپرس میرا نام اُچھال رہے۔ ڈاکٹر دن میں دو بار چیک اپ کے لئے موجود ہوتا۔ بہت تھک گیا تھا۔ پہلی بار اپنے بے جان ہونے کا احساس بھی ہوا تھا۔ چکّر آ رہے تھے۔ بھیم سین نے بہت ہی موٹی رقم کا حوالہ دیا تھا۔ مگر اب اپنے ہی بنائے ہوئے جال کی مضبوط سلاخوں کا احساس ہونے لگا تھا۔ اندر کی جڑیں ایک دَم سے کمزور جان پڑ رہی تھیں۔ پانی اور پھلوں کے رس اتنے کافی نہیں تھے، جو اپنے ذریعے کھوکھلے کئے گئے آدمی کو مضبوطی دے سکتے ہوں۔ ایک ایک گھنٹے بعد وزن دیکھنے کا اوباؤ سلسلہ بھی جاری تھا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ کتنے ہی دوست ملنے آئے۔ صرف خبر ملتی رہی۔ زاہد آیا تھا۔ جاوید سمن آئے تھے۔ سنجو بھی بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ گھر سے بھی کتنے ہی لوگ مجھے دیکھنے آئے۔ بہت پہلے سمن کی ہی کہی گئی

ایک بات مجھے یاد آرہی تھی۔ ان تحریکوں سے کسی کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ بندی، ہڑتال، نعرے ملک کی جڑیں کمزور کرتی جارہی ہیں ۔۔۔ یہ تحریکیں ——— بھیم سین مجھے دلاسہ دے رہا تھا۔ گھبراؤ نہیں خبر اچھی ہے۔ معاملہ آج ہی نمٹ جائے گا۔ آج آخری دن ہے۔ تمھارا وزن بہت ہی کم ہو گیا ہے۔ آج ہی ہماری مانگیں منظور کرلی جائیں گی۔

اور شام تک خبر بھی آگئی۔ مانگیں منظور ہو گئی تھیں۔ کیمپ میں جشن من رہا ہے۔ باہر نعروں سے فضا بوجھل ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں دُور تک سر ہی نظر آرہے ہیں۔ کافی ملی بھیڑ ہے۔ لوگ جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ کچھ مزدور طبقے ہنستے گاتے ہوئے جیت کے جشن میں شامل ہو گئے ہیں ۔۔۔ صرف میں کٹ گیا ہوں۔ ہاں میں کٹ گیا ہوں۔ کمزور اور تھکا ہارا، چپ چاپ سر جھکائے ہوئے بے جان قدموں سے گھسیٹتے ہوئے گھر لے جارہا ہوں ۔۔۔ کھوکھلے اور پارالائزڈ آدمی کو۔

زبان وادب ۱۹۸۴ء

ہندی (ایتو) ◆◆

کان بندھے

پتہ ہی نہیں یہ ہنگامے کب سے ہو رہے تھے۔ ماسٹر رام چندر نے شروع شروع میں تو ان ہنگاموں سے خود کو بے خبر رکھا۔ جان بوجھ کر کان بند کئے رہے کہ بیکار کے معاملوں میں پڑنے سے فائدہ کیا ہے۔ جو معاملہ بآسانی بات چیت سے نبٹ جائے اس میں جھنجھٹ جھگڑے کا کیا کام۔ یوں بھی وہ ماسٹر تھے اور ان کا پیشہ اصول اور قانون کی بات کرنا تھا۔ بچّوں کو قاعدے اور قانون کی تربیت دینا تھا۔ بچّوں کے ساتھ ساتھ یہ تربیت وہ خود کو بھی دیتے آئے تھے کہ ہنس کر مسکرا کر بات چیت کرو۔ کوئی گالی بھی دے تو نرم رویّہ اپناؤ۔ سادگی اور محبّت سے سب کا دل جیت لو مگر ماسٹر رام چندر نے یہ بات کافی دیر میں جانی کہ ہر معاملے میں کان کو بند بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ آتے جاتے و مل بابو جب قانون اور فوجداری کی بات کرنے لگے تو ماسٹر کو بھی اپنی نرمی میں تھوڑی سی سختی لانی پڑی۔ وہ ہر بات سمجھ سکتے تھے مگر یہ نہیں کہ انھیں ٹیوشن پڑھنے والے بچّوں کے سامنے شرمندہ کیا جائے۔ انھیں پڑھاتے وقت پریشان کیا جائے۔ باہر ہی اینٹ اور تختے پر بیٹھے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو وہ پڑھا رہے تھے کہ جانے کہاں سے و مل بابو نکل کر آ گئے۔ ماسٹر نے ہمیشہ کی طرح ان کے آگے ہاتھ جوڑے، نمستے کیا، بچّوں کو سبق یاد کرایا۔ پھر و مل بابو کو دیکھا جو آنکھیں لال لال کئے کہہ رہے تھے۔

"تو اب تم نے میرے مکان کو بچّوں کا اسکول بھی بنا دیا ماسٹر۔ بہت من مانی کرنے لگے ہو۔ یہ سب نہیں چلے گا۔

"کیسی مَن مانی ومل بابو؟"

"منہ مت لگو ماسٹر" ومل بابو غصّے میں تھے۔ باپ دادا گھر کی جو تھن چاٹا کرتے تھے۔ لڑکا ماسٹر بن گیا تو برابری اور اوقات پر اتر آیا۔

"وہ کل کی باتیں تھیں ومل بابو اور فرق کہاں نہیں آیا۔ خود اپنے ملک میں دیکھ لیجئے۔ ماسٹر نے ایک بار پھر نرمی کا سہارا لیا۔

"تو اب تم مجھے قانون بھی پڑھانے لگے ہو ماسٹر" ومل بابو گرجے "یہ بتاؤ مکان کب خالی کر رہے ہو یا ہمیں قانون کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہونا ہوگا"

"مکان خالی نہیں ہوگا ومل بابو" اس بار ماسٹر بڑے اطمینان سے بولے "اس لئے کہ اب میں اسے اپنا مکان سمجھتا ہوں۔ اپنے مکان میں جیسے چاہوں میں رہ سکتا ہوں"

ومل بابو گالیاں دیتے ہوئے واپس لوٹ گئے تھے۔ یہ مکان ومل بابو کے حصّے میں تھا۔ آس پاس کی زمین بھی ومل بابو کی ہی تھی۔ اور بغل والی کوٹھی میں وہ آج تک خاندان در خاندان رہتے آئے تھے۔ ماسٹر رام چندر نے بچّوں کی طرف دیکھا جو ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے انداز میں جاتے ہوئے ومل بابو کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دو بچّے تو مارے خوف کے رونے بھی لگے تھے۔

"تم لوگ پڑھو بچّو یا چھوڑو۔ آج رہنے دو۔ کل سے آنا"

ماسٹر نے بچّوں کو چھٹی تو دے دی۔ مگر دل میں چھپے ہوئے کانٹے کو الگ نہ کرسکے۔ جو برابر انھیں پریشان کئے جا رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت ماسٹر کی پتنی سیتا دیوی بہت سے گندے میلے کپڑوں کی تھال لئے کوٹھی کے گیٹ سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ دیکھتے ہی ماسٹر کا پارہ چڑھ گیا۔

"کہاں سے آرہی ہو؟"

سیتا نے سر جھکا لیا "یہ کپڑے دھونے گئی تھی۔ کوٹھی سے بلاوا آیا تھا"

"جانتی ہو۔ تم ایک ماسٹر کی پتنی ہو" ماسٹر رام چندر تقریباً چیختے ہوئے بولے۔۔۔

"مگر یہ کام تو۔۔۔"

"اب تمہیں کوٹھی جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے" ماسٹر رام چندر غصے سے بولے۔ ہم نے کوئی قرض کھایا ہے ان کا۔ نوکری ہمارے باپ دادا نے کی تھی۔ ہم نے تو نہیں کی۔ انھوں نے ساری زندگی نمک کا قرض اتارتے اتارتے ختم کر دی۔ اور کیا دیا ان لوگوں نے۔ یہ چھوٹا سا جھونپڑی نما مکان۔ کیا یہ بھی نہیں دیتے اور اب ومل بابو کہتے ہیں کہ یہ مکان بھی انہی کی ملکیت ہے"

"تو تم جھگڑا کرو گے؟" سیتا نے دبی زبان میں پوچھا۔

"نہیں۔ مگر جو حق بنتا ہے اسے چھیننے نہیں دوں گا اور ہاں سن لو۔ کل سے تم وہاں کام کرنے نہیں جاؤ گی"

ماسٹر رام چندر اندر چلے آئے۔ صبح کے سات بج گئے تھے۔ ہلکی ہلکی تھی۔ ان کے دو چھوٹے لڑکے تھے اور ایک لڑکی تھی۔ سب سے بڑا لڑکا سات سال کا تھا اس پر سے ایک لڑکی تھی۔ اور اس کے بعد چھوٹا والا۔ اس وقت تینوں مٹی مٹی کا کھیل کھیلے جارہے تھے۔ ماسٹر رام چندر نے غصہ میں آکر تینوں کو زور کی چپت لگائی۔ تین پائے کے اسٹول کے پاس پڑی ہوئی پرانی کتابوں میں سے مہینوں پرانا اخبار نکال کر اسے پڑھنے بیٹھ گئے مگر پڑھنے میں دل نہیں لگا۔ سوال وہی تھا۔ اگر ومل بابو واقعی اپنی بات پر جم گئے تو؟ اور مکان خالی کروانے کی نوبت آگئی تو؟ اس پورے خاندان کو لے کر کہاں جائیں گے وہ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا ہوگا۔ سیتا کا کیا ہوگا۔ مڑے تڑے اخبار کو لے کر وہ دونوں کمرے گھوم گئے۔ چھوٹا چھوٹا کمرہ۔ ایک کھٹے سے بھی کم میں پھیلا ہوا گھر۔ باہر تھوڑا سا برآمدہ جہاں صبح سویرے انھوں نے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا کام شروع کیا تھا۔ پرائمری اسکول کے ٹیچر کو ملتا ہی کیا ہے۔ تین بچوں کے دودھ میں ہی کتنا خرچ ہوجاتا ہے۔ ابھی سے پیسے نہیں جٹیں گے تو بڑی ہونے پر لڑکی کی شادی کیسے ہوگی۔ ماسٹر رام چندر کو برے دنوں کی ایک ایک گھڑیاں یاد تھیں۔ یہی تو صحن تھا جہاں ان

کی دو پیڑھیوں نے زندگی گزاری تھی۔ بابو کی ہلکی ہلکی جھلک ذہن میں اب بھی موجود تھی۔ سب کچھ یاد تھا۔ وہ اسکول میں پڑھنے لگا تھا مگر پتاجی کو بابو اور ماں کو مائی کہہ کر بلایا کرتا تھا۔ اپنے خاندان میں پڑھنے والا وہ پہلا آدمی تھا۔ بابو دن بھر کوٹھی میں جھاڑو لگاتے۔ کھانا پکاتے۔ پیر دبانے میں لگے رہتے، تو مائی زمین کا "پوچارا" لگانے، کپڑے دھونے اور دوسرے دوسرے کام میں مصروف رہتی۔ تھوڑا بہت کام تو بابو کے ساتھ مل کر وہ بھی کرنا رہتا۔ جیسے بازار جانا، سبزی ترکاری لانا۔ اسکول سے وقت نکال کر، دوڑ دوڑ کر وہ ڈھیر سارا کام کر دیا کرتا۔ بابو نے اس کو پڑھانے پر بہت زور دیا تھا۔ وقت نے سیاہ دنوں کی شروعات کر دی۔ پہلے مائی مری اور پھر بابو بھی رخصت ہو گئے اور اس کے بعد مکان کا یہ جھگڑا شروع ہو گیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ بابو کی زندگی میں ہی اسے نوکری مل گئی تھی۔ نوکری ملنے کے بعد پتہ نہیں کیوں یہ سب اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس نے کئی بار بابو کو سمجھانا بھی چاہا تھا اور ہر بار بابو ہنس کر ٹال گئے تھے۔ یہی کہتے رہے۔ انہی کے دروازے پر ساری عمر کٹی ہے۔ انہی کے چھت کے نیچے سہارا ملا ہے۔ ان کا نہیں تو کس کا کام کروں گا۔ بابو کے اس جواب کے آگے وہ کیا کہتا۔۔۔ کہ بابو ریٹائر تو ایک نہ ایک دن ہر آدمی ہونا ہے۔ گورنمنٹ بھی بڑھاپے کا لحاظ کر کے پینشن دے دیتی ہے۔ تم پینشن نہیں لوگے بابو۔۔۔؟ مگر بابو جی نے پینشن نہیں لی۔ مرنے کو مر گئے، مگر وہ مل بابو کے خاندان کے دیکھ ریکھ کی ذمہ داری اُسے سونپ گئے، کہ اپنی ماسٹری پر ناز نہیں کرنا۔ تیرے پُرکھے بھی کوٹھی کے ملازم رہے ہیں۔ تھوڑا بہت کام کر دینے سے آدمی چھوٹا نہیں ہو جاتا ہے۔ خود نہیں تو پتنی کو بھیج دیا کرنا۔ بابو کے وقت سے ہی سیتا بھی کام پر جانے لگی تھی۔ شروع شروع میں تو ماسٹر کو یہ سب بُرا ضرور لگا۔ پھر عادت بن گئی اور پھر اس نے خود سے سمجھوتہ بھی کر لیا کہ آخر ایک عمر گزری ہے یہاں۔ انہی کے سائے تلے پڑھا لکھا ہے۔ بڑا ہوا ہے۔ کوٹھی کا نمک کھایا ہے تو ساتھ بھی دے گا۔ اس لئے اس نے سیتا کو بھی کبھی منع نہیں کیا۔ جب بھی بلایا گیا اس نے سیتا کو بھیج دیا۔ شادی بیاہ جیسی تقریب میں تو وہ خود ہی بڑھ چڑھ کر سارا کام سنبھال لیتا۔ یہ سب کچھ تھا مگر پھر بھی۔ کبھی کبھی بُرا ضرور لگتا۔ اس لئے کہ اب وہ ایک ماسٹر تھا۔ اس کے بھی یار دوست تھے۔ سب کے سب کسی نہ کسی اچھے پیشے یا نوکری سے جُڑے ہوئے تھے۔

ان سے ملتے ہوئے کچھ نہ کچھ اَٹ پٹا ضرور لگتا۔ یا پھر جب یہ گھر آتے اور سیتا گھر میں نہ ہو کر کوٹھی میں ہوتی۔ یا پھر اسی وقت کوٹھی سے کام پر آنے کا بلاوا آتا۔ غصّہ تو ضرور آتا، مگر سیتا لوٹنے کے بعد اس درد کو ہلکا ضرور کر دیتی کہ جو سچ ہے اس سے انکار کیوں کرتے ہو؟ کیا ہے یہ سچ۔ کتنا کڑوا۔ کتنا زہر بھرا۔ پھر ماسٹر کو سب کچھ یاد آجاتا۔ ان کے ساتھ گزرا ہوا بچپن۔ تا بچپن کے برتن میں پروسا ہوا کھانا۔ کبھی کبھی جوٹھن بھی۔ بچپن سے اس نے یہی سب دیکھا ہے۔ اور بابو جی نہیں پڑھاتے تو اس کڑوے سچ کو محسوس کرنے کے وہ لائق بھی نہیں ہوتا۔ بابو جی نے سچ مچ بہت بڑا تیاگ کیا ہے اور یہ تیاگ تو اسے بھی کرنا ہے۔ مگر نہیں۔ تیاگ کی نئی پریبھاشاؤں نے اسے اچانک دُنیا داری، قانون اور سچ سے آگاہ کر دیا تھا، جیسے اب وہ یہ سوچنے لگا تھا ـــ کہ ماسٹر اگر یہ گھر تمھارا نہیں ہے تو یہ ملک بھی تمھارا نہیں ہے۔ دو پشتوں سے رہتے چلے آنے کے باوجود بھی اگر اس گھر پر تمھارا حق نہیں بنتا ہے تو پھر اس ملک کے جغرافیہ میں بھی تمھارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ ملک تمھارا نہیں ہے اور کیا ہے تمھارا اتہاس؟ کب آئے تم یہاں؟ کب بسے؟ کچھ معلوم ہے ـــ نہیں تو پھر۔۔۔؟

ماسٹر کی اُلجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس دن وکیل صاحب کے یہاں بھی اس نے اسی سوال کو اُٹھایا۔ آنند ترپاٹھی جی محلّے کے مشہور وکیل تھے۔ شام میں اسکول سے آنے کے بعد وہ آنند جی کے بچّوں کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ وکیل صاحب بھی کافی تیز آدمی تھے۔ دُنیا بھر کی باتوں کی خبر رہتی۔ گھر کے اس مسئلے پر وہ بھی چونک گئے۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔ وہ گھر تو تمھارا نہیں ہے۔ ومل بابو کے دادا نے وہ زمین تمھارے دادا کو رہنے کے لئے اس لئے دی تھی کہ پشت ہا پشت سے وہ لوگ ان کے یہاں کام کرتے آرہے تھے۔ یعنی کئی پشتوں کی خدمت کی تھی۔ اور یہ گھر اس وقت ایک طرح سے سرونٹ کوارٹر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔"

پھر آنند بابو نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا "اچھا یہ بتاؤ ماسٹر کہ ومل بابو کے دادا نے وہ مکان دیتے وقت کچھ لکھا پڑھی بھی کی تھی یا یونہی دے دیا تھا؟"

"لکھا پڑھی؟"

ہاں جیسے ان کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا کاغذ کہ وہ یہ زمین تمھارے دادا کے نام کرتے ہیں۔ اس طرح اس کاغذ کی قانونی حیثیت ہو جاتی۔

ماسٹر رام چندر کو ہنسی آگئی۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں آنند بابو۔ اس زمانے میں اتنا لوگ سوچتے کب تھے۔ فوج داری اور مقدمے کی باتیں تو اب شروع ہوئی ہیں۔ اس زمانے میں بھروسہ کیا اور زبان دے دی۔ خوش ہوئے اور مکان دے دیا۔ میں سوچتا ہوں یہ بھی تو ایک طرح کا پینشن ہی تھا۔ ایک مشت روپے کی جگہ مکان ہی دے دیا۔ جیسے گورنمنٹ اپنے ملازموں کے مستقبل کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتی ہے ویسے ہی میں سمجھتا ہوں کہ پرانے زمانے کے رؤسا بھی اپنے ملازموں پر کبھی کبھی بہت مہربان ہو جایا کرتے تھے۔۔۔

"کاغذ نہیں تو کچھ بھی نہیں" آنند بابو نے اپنا فیصلہ سنا دیا "مقدمے میں ان لوگوں نے الجھا دیا تو کیا کر سکو گے ماسٹر۔ کنگال کر دیں گے تمھیں۔ آج ہر کام لکھا پڑھی سے ہوتا ہے۔ تمھیں وہ مکان تو۔۔۔"

"وہ میرا مکان ہے" ماسٹر رام چندر مضبوط آواز میں بولے "دو پشت سے ہم یہاں رہتے آئے ہیں۔ مجھے ملا کر تین پشت ہو جاتی ہے۔ کیا تین پشتیں کافی نہیں ہیں ایک مکان میں حق دلانے کے لئے۔ تین پشتوں سے یہ مکان ہمارے حصے میں رہا ہے اب اسے چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ماسٹر رام چندر اس دن گھر تو لوٹ آئے مگر تھکان حاوی رہی۔ پرانی تہذیب سے اب تک نہیں کٹ سکے تھے وہ۔۔۔ آتے ہی بچوں کو دھون دیا۔ کس کر پٹائی کر دی۔ اندر تکلیف ہو تو درد نکالنے کا آسان طریقہ ہے یہ۔ برسوں سے یہی دیکھتے آئے تھے۔ بابو جی وغیرہ بھی تو یہی کیا کرتے تھے۔ اور اب ۔ وہ بھی اس پرمپرا (روایت) سے نہیں کٹ سکے تھے۔ بچوں کو مارنے پیٹنے کے بعد باہر نکلے ۔ سامنے ہی کوٹھی تھی۔ آس پاس کتنے ہی نئے مکان اٹھ گئے تھے۔ پرانے مکان ایک ایک کر کے شہر سے ختم ہوتے جا رہے تھے، جو بچے کھچے مکان تھے وہ بھی لائبریری، بینک یا گورنمنٹ آفس میں تبدیل ہو چکے تھے۔ باقی مارکیٹ بن گئے تھے۔ اور ومل بابو بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ حصہ جس میں رام چندر کا

خاندان رہتا تھا۔ یا ہر کا حصّہ تھا۔ وہ باہر کے اس حصّہ کو توڑ کر مارکیٹ بنا دینے کے حق میں تھے۔ آخر سب لوگ یہی کر رہے تھے اور فائدے کا سودا بھی یہی تھا مگر ماسٹر رام چندر کو کسی بھی طور پر یہ بات پسند نہیں تھی۔ وہ اس مکان کو اب و مل بابو کا مکان ماننے کو تیار ہی نہ تھے۔

دوسرے دن کوٹھی سے خبر آئی "سیتا کام کرنے کیوں نہیں آئی۔ بہت ضروری کام ہے۔"

یہ خبر و مل بابو کا چھوٹا لڑکا چندر لایا تھا۔ چندر کو غور سے دیکھا ماسٹر نے۔ دیر تک دیکھتے رہے۔ پھر بڑی مٹھاس سے بولے۔

"بغل سے سگریٹ لے آؤ گے چندر؟"

"نہیں۔" چندر رعب سے بولا۔

ماسٹر بھانپ گئے۔ اس چھوٹے سے لڑکے میں بھی خاندانی پن پورا پورا موجود ہے۔ خود کو جوڑتے ہوئے رام چندر سے بولے۔

"تو پھر جاؤ۔ سیتا بھی نہیں جائے گی تمھارے گھر۔ اور کہہ دینا۔ اب کام بھی نہیں کرے گی۔"

چندر حیران حیران سا ماسٹر کو گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سیتا نے باہر نکل کر پوچھا۔

"ایسا کیوں کیا۔ مجھے جانے دیا ہوتا۔"

"نہیں سے۔" ماسٹر کے ہونٹ مسکرا اٹھے۔ "تم نہیں جانتی۔ برسوں بعد مجھے سکون ملا ہے آج۔"

"بچّے کو ڈانٹ کر۔ و مل بابو آگئے تو؟"

"آنے دو۔" ماسٹر کو اطمینان تھا۔ "انھیں بھی یہی جواب ملے گا۔"

اور اس دن دوپہر ہوئی۔ شام ہوئی۔ مگر و مل بابو نہیں آئے۔ ہاں بلاوہ کئی بار آیا۔ جب تک وہ گھر میں موجود رہے ہر بار انکار کروا دیا۔ آج اسکول بھی نہیں گئے تھے۔ سر کے درد کا بہانا بنا دیا تھا۔ پھر شام ہوتے ہی آنند بابو کے گھر ان کے لڑکے کو پڑھانے چل دیئے۔

آنند بابو باہر ہی تھے۔ لان میں کرسی نکلی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں اخبار دبا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی بولے۔

"آؤ ماسٹر آؤ۔ ابھی تمھارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔"

"میرے بارے میں؟" رام چندر کو حیرت ہوئی۔

"ہاں تمھارے بارے میں۔ اب دیکھو نا شری لنکا کا مسئلہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ تاملیوں کے خلاف جس طرح وہاں ہنگامے ہو رہے ہیں اسے تم کیا نام دوگے۔ بنگلہ دیش میں ہزاروں بہاری آج تک مہاجر بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ پاکستان نے اپنا وعدہ آج تک نہیں نبھایا اور پھر آسام کا مسئلہ لو۔ میں سوچتا ہوں باہر سے آئے ہوئے لوگ پشت در پشت بس تو گئے مگر کتنے لوگوں کو شہریت کے حقوق ملے۔ ہنگاموں، فساد، دنگوں سے بھاگا ہوا ایک شخص کسی غیر ملک میں آتا ہے۔ پناہ لیتا ہے۔ بستا ہے۔ ایک خاندان بناتا ہے اور اپنی پوری زندگی ختم کر دیتا ہے۔ کیا اتنا کافی نہیں ہے اسے اور اس کے بچوں کو شہریت کے حقوق دلانے کے لئے۔ کتنے لوگ ہیں جنھیں ووٹ ڈالنے کی آزادی ملی۔ سچ پوچھو تو یہ مسئلہ بھی تمھارے چھوٹے سے گھر کے پیدا ہوئے مسئلے سے کہیں نہ کہیں سے ضرور جڑا ہوا ہے۔"

آنند بابو نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "اس لئے میں سوچتا ہوں کہ کوئی شخص اگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ گیا۔ بس گیا تو اسے وہ گھر ملنا چاہیئے۔ وہ ملک ملنا چاہیئے۔ اب یہی دیکھو نا... آج کی اوسط عمر کیا ہے۔ پچاس برس، زیادہ سے زیادہ ساٹھ برس۔ اگر بیس سال رہنے کے بعد بھی اسے شہری یا مالک مکان نہیں کہا جا رہا ہے تو یہ خوش نصیبی کیا اسے ساری زندگی حاصل نہیں ہوگی؟"

"یہی تو میں کہتا ہوں۔ اب چوتھی پشت آ گئی ہے میری۔ کیا چار پشتیں کافی نہیں ہیں۔"

"یہ رہی سوچ وچار کی بات۔" آنند بابو اچانک پلٹ گئے تھے۔ "اور سچ پوچھو تو چار پشتیں کیا دس پشتیں بھی کافی نہیں ہیں۔ بات مقدمے کی ہے اور قانون لکھا پڑھی کے کاغذ کو مانگتا ہے اور تمھارے پاس سب کچھ زبانی ہے۔"

"اس کا مطلب ہم ابھی سے ہار گئے ہیں۔"

"نہیں ہارے نہیں۔ قاعدے کے لحاظ سے تو وہ مکان تمھارا ہی ہے۔ مگر قانونی

پیچیدگی بھی تو کوئی چیز ہے۔"

نظر جھکالی تھی آنند بابو نے۔ اور آنند بابو کے بچّوں کو پڑھاتے وقت ماسٹر رام چندر اتنا ضرور سوچ رہے تھے کہ آنند بابو محض اخبار ہیں، جو جھوٹی سچی ہر طرح کی خبریں شائع کرتا ہے، مگر جو اپنی سطح پر ایماندار بہت کم ہوتا ہے۔ آنند بابو اخبار سے زیادہ نہیں ہیں۔ بچّوں کو پڑھا کر گھر لوٹے تو معلوم ہوا سیتا ابھی ابھی کوٹھی سے لوٹی ہے۔ مالکن خود آئی تھیں اسے بلانے کے لئے۔ سیتا نے اسے دیکھتے ہی آنکھیں جھکالی تھیں۔

ماسٹر کو اچانک غصّہ آگیا "۔۔۔ ح۔۔۔ رام۔۔۔ جا۔۔۔ دی"

"ان لوگوں نے کئی بار بلوا بھیجا۔ مالکن خود بھی آئی تھیں"

"ملکینی کی نوکرانی ہے تو" پُرانی پرمپرا کا آدمی پھر اُتر آیا تھا ماسٹر کے اندر "کچھ شرم نہیں آتی۔ اسکول ٹیچر کی پتنی ہو کر پرائے گھر میں کام کرنے جاتی ہے۔"

"وہ مالک ہیں"

"چوپ۔۔۔ ح۔۔۔ رام۔۔۔"

ماسٹر رام چندر غصّے میں آگ بگولا ہو گئے تھے۔ بچّے ڈر کے مارے کواڑ کے پیچھے چھُپ گئے۔ پتنی کو مار پیٹ کر کمرے میں آکر چُپ چاپ کھاٹ پر لیٹ گئے ماسٹر۔ سانس لمبی لمبی چل رہی تھی۔ یہ کیا کردیا اس نے؟ شاید ایک بار پھر پُرانی تہذیب سے جُڑنے کی کوشش کی ہے۔ ہانپ رہے تھے ماسٹر۔ پُوری طرح سے اب تک شانت نہیں ہو سکے تھے۔ پھر سب کچھ صاف ہو گیا۔ آنند بابو کی دو رُخی باتیں، معاملے کی پیچیدگی، بچّوں کو پڑھا کر لَوٹتے وقت اس نے ایک جھٹکے سے دیکھا تھا۔ ومل بابو، آنند بابو کے احاطے میں داخل ہو رہے تھے۔ کیا وہ یہ بازی ہار جائے گا؟ شاید یہی چڑچڑا پن تھا جو پتنی پر غصہ بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔ کیا سچ مچ یہ گھر خالی کرنا ہوگا؟ کیا خود سے سمجھوتا کرنا ہی اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ سیتا کو کام پہ جانے دیا ہوتا۔ ومل بابو سے ٹکر نہیں لی ہوتی۔ مگر نہیں۔۔۔

ماسٹر رام چندر اچانک بستر سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اب وہ مطمئن تھے۔ یہ بازی انھیں کوئی نہیں ہرا سکتا۔ وہ یہ بازی جیت چکے تھے۔

دوسرے دن صبح میں جب ومل بابو کے زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آواز آئی تو ماسٹر کو کچھ بھی عجیب نہیں لگا۔ وہ جانتے تھے۔ ومل بابو کو تو آنا ہی تھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے باہر آئے ماسٹر۔

"کیا بات ہے ؟"

ومل بابو دہاڑتے ہوئے بولے "تو بڑا بننے لگا ہے ماسٹر پتنی کو کام پر نہیں بھیجے گا۔ حیثیت اور اوقات کی بات کرنے لگا ہے "

"میری پتنی اب کسی کے بلاوے پر بھی کام کرنے نہیں جائے گی" ماسٹر نے بھی اپنا دو ٹوک فیصلہ سُنا دیا۔ ومل بابو کو بھی تاؤ آ گیا۔ "پُرانے دن بھُول گیا ماسٹر۔ بیوی کام نہیں کرے گی۔ بچے بوجھ نہیں ڈھوئیں گے اور سانپ کی طرح تو میرے گھر پر قبضہ جمائے رہے گا۔"

"میں کہتا ہوں یہ مکان میرا ہے۔ ماسٹر رام چندر کو بھی غصّہ آ گیا تھا۔ میں پھر کہتا ہوں ومل بابو دوبارہ مکان کے بارے میں کچھ بھی بولنے سے پہلے سوچ لیجئے گا۔ ہزار بار کہہ چکا ہوں۔ آپ کے دل میں جو آئے کیجئے۔ مگر یہ مکان میرا ہی رہے گا۔"

"تو آ گئے اپنی اوقات پر" ومل بابو نے گہری سانس بھری "تو سُنو ماسٹر۔ وکیل سے میری بات چیت ہو چکی ہے۔ سمجھ لو میں نے تم پر مقدمہ کر دیا ہے۔ اس مکان کے خلاف"

اور پھر وہ ہوا کہ ومل بابو بھی چونک گئے۔

ماسٹر جیسے اسی جواب کی توقع کئے بیٹھے تھے۔ زور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔ تو ومل بابو آپ جانتے ہیں۔ مقدمہ بھی ایک طرح کی جنگ ہے جو برابری والوں سے ہی لڑی جاتی ہے۔ اب میں بھی آپ کی برابری میں ۔ ۔ ۔"

ماسٹر ہنسے جا رہے تھے۔ برسوں سے ان کے باپ دادا ومل بابو کے گھر کی ملازمت کرتے آئے تھے۔ اب اس معاملے نے اچانک انہیں ومل بابو کی برابری میں لا کھڑا کیا تھا۔

آجکل ۱۹۸۹ء ◆◆

جلاوطن

پتہ ہی نہیں یہ کون اندر سے بار بار چیخ رہا ہے۔ تنبیہہ کر رہا ہے۔ ڈرا رہا ہے۔ اپنے ہی لفظوں کا زہر پوری عمارت کو ریزہ ریزہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ رما کانت! تم جلاوطن کر دیئے گئے ہو۔ تم جلاوطن کر دیئے گئے ہو رما کانت۔ اب وہ راجہ مہاراجاؤں کا زمانہ تو نہیں رہا جب ملک سے غدّاری کا جرم ثابت ہو اور عدالتِ عالیہ بھری مجلس میں انصاف کا فرمان تمھارے نام جاری کر دے۔ اب کسی ایسی عدالتِ عالیہ کا قیام نہیں ہے۔ اس کے باوجود رما کانت! ایک شہری کی طرح تم ہر وقت میرے سامنے رہے ہو۔ تمھاری حرکات وسکنات سب پر میری نظر رہی ہے۔ تم کیا کرتے رہے ہو اور کیا نہیں۔ میں سب کچھ اب تک بند آنکھوں سے دیکھتا رہا ہوں اور رما کانت، اب دیکھنے کی حد بھی ختم ہو چکی ہے اور اب میں۔ ہاں میں۔ تمھارے اندر ہی کسی گوشے میں بسنے والا یہ آدمی تمھارے نام یہ فرمان جاری کرتا ہے:

کہ رما کانت! تمھیں جلاوطن کیا جاتا ہے۔

تم جلاوطن کر دیئے گئے ہو۔

تمھیں پتہ ہے تم کہاں جاؤ گے؟

کنپٹیاں لال سُرخ ہو گئی ہیں۔ پسینے میں شرابور ہو گئے ہیں رما کانت۔ اندر سے

اٹھنے والی یہ کیسی آواز ہے۔ کیا، کیا ہے انھوں نے؟ جس کی وجہ سے ان کے اندر بیٹھا ہوا آدمی انھیں دیش نکالا دے رہا ہے۔ کیا قصور ہے ان کا؟ کمزور ہاتھوں سے لاٹھی پر گرفت مضبوط کی۔ مگر جائیں گے کہاں؟ نڈھال قدموں سے بیٹے اور بہو کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ ہاں جلتی ہوئی آنکھوں نے انھیں دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔ بیٹا کسی رسالہ کے ورق گردانی کرنے لگا تھا۔

کچھ دیر تک وہاں کھڑے رہے رما کانت۔ اندر کیا کیا گزر رہی ہے مگر زیادہ دیر تک کھڑے نہیں رہ سکے۔ پھر آگے بڑھ گئے۔ اندر کشمکش اب بھی جاری ہے اور اب تک اندر چلنے والی اس دُہری لڑائی کو وہ کوئی نام نہ دے سکے تھے اور کیا نام دیتے۔ آزادی کے بعد تو اتنے سارے گمبھیر مسئلوں نے ایک ساتھ جنم لیا ہے کہ انھیں چیرتے پھاڑتے ہوئے کبھی کبھی دُکھ ضرور ہوا ہے اور کسی نہ کسی انجانے گوشے سے یہ آواز ضرور اٹھی ہے کہ ان مسئلوں سے خود کو الگ کر کے رما کانت تم غداری کا ثبوت دے رہے ہو۔ کندھے ایک بار پھر جھک جاتے۔ کمزور آدمی کی حکومت سے لڑائی ہی کتنی ہوتی۔ مگر یہ لڑائی حکومت سے نہ تھی، وطن سے نہ تھی، بلکہ اپنے آپ سے تھی اور ہر بار رما کانت آئینے میں اپنی بزدلی کا چہرہ دیکھ کر ڈر جاتے۔

ایسا پہلے تو نہیں تھا رما کانت۔ مگر اب؟

خبروں کو چیرتے پھاڑتے ہوئے جب تم پورے قصاب بن جاتے ہو تو لگتا ہے تم اس ملک کے شہری نہیں ہو، یا اس ملک سے تمھارا دُور کا واسطہ نہیں ہے۔ تم ایک ٹوٹے پھوٹے گھر میں نظر آتے ہو اور کبھی کبھی لگتا ہے اس ٹوٹے پھوٹے گھر کو بھی تم پوری طرح برباد دیکھنا چاہتے ہو۔ خبروں کو چیرتے پھاڑتے ہوئے جب تم پورے قصاب بن جاتے ہو تو ایسا ہی لگتا ہے۔

نہیں ... کمزور جسم کی پوری عمارت کانپ گئی تھی۔ بڑکی کے سامنے اسی طرح سر جھکائے کھڑے ہو گئے۔ بڑکی اپنے شوہر سے لڑ کر بھاگ آئی تھی اور اب اس گھر میں اپنا حصّہ مانگ رہی ہے۔

"چھوٹا آیا ہے؟" آہستہ سے پوچھا رما کانت نے۔

"نہیں" بڑکی آج غصہ میں تھی "اس کو آوارہ گردی سے فرصت ملے تب تو گھر آئے"

"ٹھیک ہے"

رما کانت آگے بڑھ گئے۔ اپنے آپ سے فرار کا اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنے آپ کو سمجھا پانے والی ہر کارروائی دم توڑ گئی تھی۔ اندر سے اٹھی ہوئی چیخ کا سامنا کرنے میں بھی ہر لمحہ وہ خود کو کمزور اور معذور محسوس کر رہے تھے۔ پتہ نہیں کب کیسے برسوں پرانا آفس فائلوں میں گھرا ہوا رما کانت انھیں دِکھ جاتا، جسے اُس کے دوست احباب کام میں معروف دیکھ کر چھیڑ رہے ہوتے۔

"تم نے سُنا رما کانت۔ امریکہ بم برسانے والا ہے"

"بم؟" رما کانت کے ہوش و حواس پر یہ خبر بجلی کی طرح گرتی۔ بدحواس سا وہ اپنے دوستوں کا چہرہ دیکھنے لگتا۔

"کب کی بات ہے؟"

"آج کی خبر ہے پیارے۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا"

"نہیں، ابھی تو میرے کسی بچے کی شادی بھی نہیں ہوئی"

رما کانت کا چہرہ پیلا پڑ جاتا تو دوست یار قہقہہ مار کر ہنس پڑتے "تو اتنا کٹا رہتا ہے ملک سے۔ ملک میں ہونے والی خبروں سے کہ کبھی کبھی لگتا ہے تو اس ملک کا شہری ہی نہیں ہے۔ ہر بات پر آنکھیں موند کر بھروسہ کر لیتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے رما کانت؟"

"بھائی" رما کانت فائلوں سے سر اُٹھا کر کہتا۔ "ان کاغذات سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ اخبار پڑھ سکوں، ریڈیو سُن سکوں۔ دفتر کے بعد بھی یہی کاغذات مجھے ساری ساری رات تنگ کرتے رہتے ہیں اور گھر جا کر گھر کی فکر مجھے اتنا موقع نہیں دیتی کہ ان خبروں کے لئے وقت نکال سکوں، کچھ پوچھ سکوں"

"تو عجیب آدمی ہے رما کانت"

دوست مسکرا اُٹھتے اور وہ پھر سے فائلوں میں کھو جاتا۔ سرکاری کاغذات پر نظر میں

دوڑنے لگتیں۔ ٹائپ رائیٹر مشین کی کھٹ کھٹ گونجنے لگتی۔ آفس اور آفس سے گھر۔ یہی تو زندگی تھی رما کانت کی۔ اس سے ہٹ کر وہ کچھ سوچتا بھی کیسے، پڑھتا بھی کیسے جو کچھ سامنے ہو رہا ہے بس اسے ہی دیکھتا رہتا۔ بغیر کسی تجزیے کے۔ لوگ تو خوب باتیں کرتے۔ آفس میں بھی سارا کام چھوڑ کر ان کے پاس باتیں رہ گئی تھیں۔ اس نے کبھی دھیان نہیں دیا۔ بس ان باتوں سے اس نے یہی نتیجہ نکالا کہ ملک ٹوٹ رہا ہے اور اس ناسمجھی پر وہ خود بھی مسکرا اٹھتا۔ بھلا ملک ٹوٹنے کا کیسے۔ اتنی تپسیا کے بعد تو آزادی ملی ہے اور آزادی سے پہلے کا زمانہ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا۔ نوجوانی کے مضبوط ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ جاتیں۔ ان آنکھوں نے کیا کیا نہیں دیکھا تھا، مگر اب یہ سفر آفس اور آفس سے گھر تک محدود ہو گیا تھا۔ لڑکی اب بڑی ہو رہی تھی۔ بڑا اب کام کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا اور چھوٹا کمسنی کے کاندھے پر آوارہ گردی کا بوجھ ڈھو رہا ہے۔ رما کانت کو اپنے کندھے بڑے کمزور لگتے۔ پھر چھوٹی سی زندگی میں ایک اور طوفان آیا۔ جب بیوی گذر گئی، کندھے اور جھک گئے، چشمے کا نمبر بڑھ گیا۔ آفس میں فائلوں کی تعداد بڑھ گئی۔ آنکھوں کے آگے مٹیلا اندھیرا چھا گیا۔ کتنے چہرے اوجھل ہو گئے۔ کتنے چہرے گزرتے وقت کے ساتھ دھندلا گئے۔ لڑکی کی شادی ہو گئی۔ بیٹا اپنی پسند کی بیوی لے آیا۔ زندگی کی جنگ میں شاید اپنا حصہ بہت کم ہوتا ہے گھر کے بارے میں سوچتے ہوئے اس نے کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچا، مگر یہاں تو خود مختاری کی فضا تھی اور اس فضا سے سمجھوتہ کرنا ہی بوڑھے بیمار باپ کے حق میں بہتر تھا۔

پتہ نہیں وقت کیسے گذر جاتا ہے اس کا احساس ہی نہیں ہوا رما کانت کو۔ اس کے ریٹائر ہونے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا اور وہ دن اس کی زندگی کا خاص دن تھا۔ کوئی اداس نہیں تھا۔ کسی کی آنکھوں میں ساتھ ساتھ جینے والا کوئی لمحہ نہ تھا۔ اس کے برخلاف سب خوش نظر آرہے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ کام کرنے والے تھے۔ سب نے اس کے ریٹائر ہونے پر خوشی منائی۔

سمجھو، جو اس کی زندگی سے نکل گیا وہ بہت خوش قسمت ہے۔

"تم بہت خوش قسمت ہو رما کانت۔"

رگھو چودھری اُس کے پاس بیٹھ گئے تھے "کل تمھارے سامنے ایک ایسی کھلی فضا ہوگی رما کانت، جہاں آفس کی غلامی نہیں ہوگی۔ سب کچھ تمھارا ہوگا۔ پورے لمحوں پر تمھارا حق ہوگا اور ہاں ـــ تم خبروں کو چیرنے پھاڑنے کے لئے بھی پورے آزاد ہوگے"

"مطلب؟" وہ چونک گیا تھا۔

اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

"میرے معصوم دوست! خالی وقت میں اور کیا کروگے۔ یوں بھی ہندوستان کا بچہ بچہ اب تو پالیٹیشین ہوگیا ہے۔ خالی وقت میں تمھیں کتنے ہی خالی دوست مل جائیں گے، جن کے ساتھ مل کر تم بھی خبروں کے مرہل جانور کو ذبح کرنے میں لگ جاؤگے"۔

رگھو چودھری قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ اب امریکہ بم نہیں گرائے گا رما کانت۔ پورا ہندوستان تمھارے سامنے ہوگا اور پورا ہندوستان ہی کیوں پوری دُنیا تمھارے سامنے ہوگی اور خالی وقت کا احساس دنیا میں پلنے پکنے والے مسئلوں کے تمھیں قریب کردے گا پھر تمھیں جی بھر کے آزادی ہوگی بحث کرنے کی، قے کرنے کی۔ اس سے زیادہ ایک ہندوستانی کا اور کوئی فرض نہیں بنتا ہے"۔

رگھو چودھری ہنس رہے تھے۔

رما کانت اچانک سکتے میں آگئے تھے۔ موٹے شیشے والی عینک سے دوستوں کے دھندلاتے چہروں کو غور سے دیکھا۔ کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر دوپہر ہوئی۔ الوداعی پارٹی ہوئی اور گھر آگئے اور سچ مچ آزاد ہوگئے۔

آزادی کا پورا ایک ہفتہ سچ مچ بڑا عجیب ثابت ہوا۔ شاید اس درمیان بھی وہ دفتر سے نہیں کٹ سکے تھے۔ گھر میں جی نہیں لگتا تو اُٹھ کر کھانے کی پوٹلی کے ساتھ دفتر چلے جاتے، مگر اب وہاں کس کا اتنا دماغ تھا جو ایک ریٹائرڈ آدمی کے لئے وقت نکال پاتا۔ سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتے اور رما کانت سارا سارا وقت گذار کر شام کو تھکے ہارے گھر واپس آجاتے۔ ایک لمبی عمر آفس کی نذر ہوئی تھی۔ پڑوسیوں سے بھی تو کبھی وہ ٹھیک سے نہیں مل پائے تھے۔ کبھی کبھی کسی تقریب، شادی بیاہ یا کسی تیوہار کے موقع پر ملنا ملانا ہو جاتا،

مگر اب اُن کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ آس پاس کے کتنے ہی لوگ اُنہی کی صف میں شامل تھے۔ وہ لوگ وہیں انھیں بُلاتے۔ پھر وہ کاشی جی کے گھر بیٹھنے لگے، جہاں صمد بھائی، جسونت سنگھ اور شیام ناتھ بھی آیا کرتے۔ سارے کے سارے عمر کے آخری زینے پر کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر تک تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہتیں پھر سب اپنے فارم میں آجاتے۔ نشانہ صمد بھائی کی طرف بھی ہوتا۔ جسونت سنگھ چونک جاتے۔

کاشی گنگا رام پوچھ رہے ہوتے "صمد بھائی، کیا آپ بھی مان کر چلتے ہیں کہ دہشت پسند سکھوں کو ہتھیار باہر سے مل رہا ہے؟"

"کچھ حد تک تو میں بھی مان رہا تھا، مگر اب . . ." صمد بھائی کہتے کہتے ٹھہر جاتے ہیں۔

رما کانت غور سے صمد بھائی کو دیکھتے ہیں۔

"مگر اب کیا؟" جسونت سنگھ اپنی پگڑی برابر کرتے ہیں اور ساتھ ہی ٹھٹھا مار کر ہنستے ہیں "ہمیں تو کچھ بھی بولنے کی آزادی نہیں ہے بھائی۔ رما کانت تم ہی کہو۔ کیا کہتے ہو؟"

"جو ہو رہا ہے وہ اچھا نہیں ہو رہا ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم سب برابر ہیں۔ برابر کے بھائی۔ مارپیٹ، فساد دنگے اچھی چیز نہیں ہیں"

اپنی سمجھ کی بات کرتے ہیں رما کانت —

کاشی جی پھر دوسری دوسری خبروں کو لے کر اُلجھ جاتے۔ رما کانت بس اتنا سوچتے۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ملک میں بلکہ پوری دُنیا میں۔ اور وہ اب تک ان باتوں سے انجان رہے۔ کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔ تقسیم کے بعد ملک اپنے ہی لوگوں کے نیا پا پنجا میں اُلجھتا رہا ہے۔ ایسے میں بس رگھو چودھری کے قہقہے سُنائی دیتے۔ تم آزاد ہو رما کانت۔ تھوکنے کے لئے بھی، قے کرنے کے لئے بھی۔ خبروں کا زہر نگلنے کے بعد بس یہی ایک راستہ بچ جاتا ہے۔ اس سے زیادہ ایک ہندوستانی کا اور کوئی فرض نہیں بنتا۔

تھکے ہارے گھر لوٹنے کے بعد رگھو چودھری کا یہی جملہ برابر ان کے کانوں میں بجتا رہا۔ اپنا وجود انھیں ایک قصاب کی طرح لگتا، جس کے ہاتھوں میں ایک چھُری ہے اور گوشت کے ٹکڑے اس کے سامنے پھیلے ہوئے ہیں اور اُنھیں بے دردی سے وہ کاٹتے

چلے جا رہے ہیں۔ یہ کیسا احساس ہے۔ خود سے جُڑے اس ناجائز احساس پر وہ اب تک قابض نہیں ہو سکے تھے۔ ہاں صمد بھائی، کاشی جی، جسونت کی باتوں میں برابر کے شریک ہو گئے تھے۔ جرم کا احساس پہلے تو نہیں تھا، مگر اب پلنے لگا تھا۔ جب وہ باقاعدہ ان خبروں میں اُتر گئے تھے۔ آزادی سے پہلے والی نوجوان ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز اب دُور دُور تک نہیں سُنائی دے رہی تھی۔ ہاں ملک کے نئے چہرے پر آنکھیں پھراتے ہوئے وہ بوڑھی ہڈیوں کی چیخ ضرور سُن لیتے۔ یہ کون سا جذبہ ہے جہاں بھلائی کی بات سوچنے والا وطن پرست سو گیا ہے، جہاں مسائل کی پرت ہٹانے کی کوشش نہیں کی جاتی، بلکہ اس کے اُدھیڑنے بُننے کا ایک لمبا سلسلہ جاری ہے۔

جسونت سنگھ اُس دن موڈ میں تھے۔ ہاتھ میں صبح کا تازہ اخبار جھول رہا تھا۔ صمد بھائی اور کاشی جی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی جسونت سنگھ نے آواز لگائی۔

" بھائی رماکانت، اس خبر کو پڑھو۔ پنجاب میں دہشت گردی اب سچ مچ کم ہو گئی ہے "

رماکانت خبر پر جُھک گئے۔ سرورق کی تازہ سُرخی میں کہیں کسی فساد میں مرنے والے سیکڑوں آدمیوں کی تعداد درج تھی۔ اس کے ٹھیک نیچے ایک چھوٹی سی خبر تھی۔

" پنجاب میں پانچ مرے "

" دیکھا " جسونت ہنس رہے تھے۔ " کہاں دوسرے شہر میں فساد میں مرنے والے سینکڑوں آدمیوں کے بیچ پنجاب کی یہ چھوٹی سی خبر۔ کیا دکھانا چاہتے ہیں۔ یہ اخبار والے بھی مذاق کرنے لگے ہیں۔ خبروں ہی میں سہی۔ انسانوں سے کھیلنے لگے ہیں۔ عام جذبات سے کھیلنے لگے ہیں "

" جو خبریں اُنھیں ملتی ہیں وہی تو شائع کرتے ہیں "

" دُنیا کے نقشے میں فساد اور ہنگاموں سے الگ بھی کوئی چیز ہے "

" اب کچھ بھی اس سے الگ باقی نہیں رہا "

"پھر کیا ضرورت ہے روز روز اخبار پڑھنے کی"۔ جسونت سنگھ پہلی بار زور زور سے بولے تھے "یہ خبریں ہیں جنھوں نے تنگ نظر کر دیا ہے ہمیں۔ آگے پیچھے کچھ نہیں سوچتے ہم صمد بھائی! کچھ لو تم نے پھر ایک الگ پاکستان لے لیا اور ہم نے ایک الگ پنجاب اور باقی بھائیوں نے، ہندوستان کے جغرافیے میں جیسی پھوٹ اب پڑی ہے پہلے کبھی نہیں پڑی۔ اور ہم کیا ہیں؟ سؤر کے بچے۔ پشتہا پشت سے چلی آرہی محبتوں کو بھلا کر انہی خبروں کو سننے اور پڑھنے کے لئے زندہ رہ گئے ہیں"۔

"نہیں جسونت بھائی۔ یہ اخبار والوں کی غلطی نہیں ہے"۔ صمد بھائی نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "دراصل ہم ہندوستانیوں کی ہندوستانیت سو گئی ہے۔ جاتے جاتے فرنگیوں نے اسے سلا دیا۔ بس یہی چیز ہے اور ہم ہیں کہ بیدار ہونا نہیں چاہتے"۔

"جو ہوتا ہے وہی تو اخبار لکھتا ہے"۔ کاشی جی معنبوطی سے اپنی بات پر جمے رہے۔ "گورکھالینڈ، پنجاب، میزورم، تاملیوں کے ہنگامے۔ اخبار لکھیں نہیں تو ہم ان کی تہہ تک کیسے پہنچیں"۔

"کیا سچ مچ آپ باتوں کی تہہ تک جانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں!"

"تو کتنی تہہ تک گئے ہیں آپ۔ کتنے اندازے لگائے آپ نے۔ تھو کنے اور رونے کے علاوہ بھی جو ہمارا اور آپ کا فرض بنتا ہے۔ اس میں کس حد تک آپ کو کامیابی ملی ہے۔ بھونکتے تو کتے بھی ہیں، مگر ہم نے بھونکنے کے علاوہ اور کیا کیا ہے۔ کیا کیا ہے بتائیے کاشی جی۔ آنکھیں کل بھی بند تھیں اور آج بھی بند ہیں۔ نئی نسل آزادی کو ایک دھبہ مانتی ہے۔ ہم نے اور آپ نے تو اس غلامی کے کچھ رنگ دیکھے ہیں۔ قریب سے۔ اس آگ میں جلنے والوں کے منہہ سے اس کی کہانیاں سنی ہیں۔ انصاف سے بتائیے وہ آگ اس آگ سے زیادہ روشن نہیں تھی؟ آج کچھ لوگ غصہ میں کہتے ہیں وہ غلامی زیادہ اچھی تھی۔ تھپڑ مارنے کو جی چاہتا ہے ایسی باتوں پر۔ کہ پتر! تم نے غلامی دیکھی کہاں ہے! تاریخ کے رستھ کے چھینٹے بھی نہیں پڑے ہیں تم پر اور آج اس آزادی کا قرض اس طرح

اتار رہے ہو کہ تمہارے جذبے سے غداری کی بُو آنے لگی ہے۔"

اتنا کہہ کر اخبار کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے جسونت سنگھ نے اور غصّے میں اُٹھ کر گھر واپس چلے گئے۔

کاشی جی سکتے میں آ گئے۔ مدھ بھائی کو سانپ سونگھ گیا اور رما کانت بس ابھی ابھی آئی ہوئی آندھی کا سُراغ پانے میں لگے رہے۔ یہ کیا ہوا جسونت بھائی۔ لَوٹ کیوں گئے۔ یہ کیسا غبار تھا، جو پُورا پُورا جسونت کو جلا گیا تھا۔ پھر محفل برخواست ہو گئی۔ سب اپنے اپنے گھر لَوٹ آئے۔

اور گھر آ کر پھر وہی آدمی ان کے سامنے تھا۔ اندر کے کسی گوشے میں سویا ہوا آدمی، جو برابر انہیں چیر پھاڑ رہا تھا۔ پریشان کر رہا تھا۔

"تمہیں جلاوطن کیا جاتا ہے رما کانت۔"

"رما کانت تم جلاوطن کر دیئے گئے ہو۔"

"مگر کیوں . . . کیا قصور ہے میرا؟ کیا کیا ہے میں نے؟"

اُوپر سے لے کر نیچے تک کانپ گئے تھے رما کانت۔ ریٹائر ہوئے ایک مدّت ہو گئی تھی اور اس مدّت میں جو آدمی اُن کے اندر داخل ہوا تھا وہ کہیں سے بھی اس ملک کا شہری نہیں تھا۔ صرف اس کے علاوہ کہ وہ اسی ملک میں رہتا تھا۔ کسی بھی موقع پر اپنے وفادار ہونے کی شہادت نہیں دی تھی اس آدمی نے۔

"پھر . . .؟"

لاٹھی ٹیک کر اپنے کمرے میں آتے ہوئے غشی ان پر حاوی ہو رہی تھی۔ ایک نظر انھوں نے گھر پر ڈالی۔ یہ گھر بھی تو ٹوٹ رہا ہے۔ بڑکی حصّہ مانگ رہی ہے۔ اولاد ناکارہ نکل جائے . . .؟

تھکے ہارے بستر پر لیٹ گئے۔ بچّے گھر کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی مانگ کب سے کر رہے ہیں۔ نگران کا کیا فرض بنتا ہے۔

کیا وہ سچ مچ گھر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔

ایک حصّہ بڑکی کو اور ایک حصّہ بچوں میں بانٹ دیں ۔ پھر وہ کہاں جائیں۔
آنکھوں میں کتنی ہی دھندلی دھندلی تصویریں رینگ گئیں۔
مگر نہیں ـــــ
وہ ایک فیصلہ کر چکے تھے۔
شاید ـــ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔
اور ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتا ہوا جانی انجانی شاہراہوں کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

آجکل ۱۹۸۸ء ◆◆

ہندوستانی

ابھی وہ کھانے سے فارغ ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک کی آواز سُن کر سہم گئے۔

دستک کے ساتھ ہی ملی جُلی آوازیں بھی گونج اٹھیں۔

"بھائی کہاں چھپے ہو؟"

کانپتی آنکھوں سے عبداللہ بیگ نے زہرہ بیگم کی طرف دیکھا۔

"تم ہی کہو۔ کیا کہتی ہو؟"

"آپ کو جانا ہی ہوگا۔ محلّے کے ہر گھر سے کم از کم ایک آدمی کو تو پہرہ دینے کے لئے جانا ہی ہے۔ اور یہاں صرف آپ ہیں۔"

"تو مجھے بھی جانا ہوگا۔"

عبداللہ بیگ اب پُرسکون تھے۔ محلّے کے کتنے ہی لوگ ہوں گے جن کے ساتھ انھیں گشت پر نکلنا تھا اور ہوتا کیا تھا۔ رات بھر تفریح بازی، گپ شپ، دوسرے محلّے کے ہندو آکر حملہ نہ کردیں، اس کا خیال رکھنا تھا۔ اتنے سارے لوگ ہیں۔ عبداللہ بیگ نے اطمینان کی سانس لی اور دروازہ کھول دیا۔

"جلدی کیا ہے بھائی لوگو! کھانا کھا رہا تھا۔"

"ہمیں بھی بلا لیا ہوتا۔"

ایک بزرگ انتہائی سنجیدگی سے بولے اور کچھ نوجوانوں کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا۔

دفعتاً پھر کسی بات سے زہر خند ہنسی ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی

"شاستری نگر میں پھر دنگا ہوا ہے۔ مرنے والوں میں پچیس مسلمان گھر شامل ہیں۔ چار گھر پھونک دیئے ہیں۔"

عبداللہ بیگ کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ سرکار بوکھلائی ہے یا پاگل ہوئی جا رہی ہے۔ ووٹ مانگنے کے لئے خوش آمدی ٹٹو وعدوں کی کوٹھری لے کر تو چلے آتے ہیں۔ پھر سب کچھ بھول کر اپنی ستّا بچائے رکھنے کے لئے ہم میں پھوٹ ڈلوا کر جنگ کرواتے رہتے ہیں۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔۔"

کچھ بوڑھی سانسوں نے اپنا زمانہ یاد کیا۔ لمبی گہری سانس کھینچی ۔۔۔۔۔ پھر سڑکوں پر نکل آئے۔ کچھ ہاتھوں میں بھالے تھے، ڈنڈے تھے۔ کچھ ہاتھ خالی تھے۔ ایک طرف پولیس جیپ رات کے سنّاٹے میں آرام کر رہی تھی جس پر کچھ پولیس کے سپاہی بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

"سالے ہندؤں کے آدمی" ۔۔۔۔۔ ایک نوجوان غصّے سے بڑبڑایا۔ اس کے چہرے کے ماس آپس میں بھنچ گئے ہیں۔

"نہیں انور نہیں" ایک داڑھی والے بزرگ نے سمجھایا "یہ غلط ہے۔ بڑی مشکل سے تو ہمیں پہرے داری کی اجازت مل سکی ہے۔ کچھ ایسی ویسی بات ہوئی تو سب گڑبڑ ہو جائے گی۔ پھر ہم پہرہ نہیں دے سکیں گے اور ان کے رحم و کرم پر ہوں گے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" دوسرے بزرگ نے حامی بھری۔

سڑک پر اب متعدد قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی۔ ذرا ٹھہر کر کوئی نوجوان اونچی آواز میں چلاتا "جاگ کے سوئیو" ۔۔۔۔۔ اور بوڑھی آنکھیں اس جانب اٹھ جاتیں۔

"شرارت نہیں بچو! زمانہ خراب ہے اور تمھیں مسخری کی سوجھ رہی ہے۔ گھروں میں آگ لگائے جا رہے ہیں اور تمھارے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔"

"بھائی اشرف علی! مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا اس ملک میں ان کا مستقبل محفوظ ہے۔"

اشرف علی نے گھوم کر دیکھا۔ بوجھل سانس اچھالی کنویں کی گہرائی سے آتی ہوئی آواز

سُنائی پڑی۔ جیسے کسی تنگ کنوئیں میں کوئی وزنی پتھر اُچھالیے اور وقفہ بعد اُس کی تنگ دیواروں سے ٹکرا کر اُوپر لوٹ کر آپ کو سُنائی دے گا، ٹھیک ایسی ہی آواز۔۔ اشرف ملک کہہ رہے تھے :۔

" کچھ کہا نہیں جا سکتا میرے بھائی۔ لیکن ہم محفوظ نہیں ہیں۔ ابھی سے اگر کچھ نہیں کیا تو آنے والی نسلوں کے قدم اکھڑ جائیں گے۔ ہم ہر جگہ ذلیل و خوار ہوں گے "

" تم ٹھیک کہتے ہو بھائی :۔ ـــــــ ایک بزرگ نے ٹھنڈی آہ بھری اور آغا حشر کا یہ شعر درد بھرے انداز میں لہک کر پڑھا:

" آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو! ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لئے
خوار ہیں بدخوار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن تیرے محبوب کی اُمت میں ہیں
گر مُسلمانوں سے کی اب تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بُت کہ مُسلم کا خدا کوئی نہیں "

مسلم کا خدا کوئی نہیں ۔۔۔ اب اس آواز میں کتنے ہی لوگوں کی آواز شامل ہو گئی ہے بوجھل آوازیں رات کے ماتمی سناٹے کا حصّہ بن گئی ہیں۔

گشت پھر شروع ہوئی تھی ـــــــ

ایک بزرگ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ " کبھی اس ملک پر ہماری حکومت تھی اور آج ۔۔!"

عبداللہ بیگ کی تیوریاں چڑھ گئیں ـــــــ " اب رونا کیا ہے جو نااہل ہوتا ہے حکومت اس سے چھین لی جاتی ہے۔ عیاشی اور رنگ رلیوں میں ہم نے آج سب کچھ گنوا دیا تو اس کا ماتم کیوں؟"

" عیاشی اور رنگ رلیاں نہیں "۔ بزرگ نے گھور کر عبداللہ بیگ کو دیکھا ـــــــ " یہ تمہارے نصاب کی کتاب کا جھوٹ ہے جو تمہیں پڑھایا گیا۔ تم آج وہی کہتے ہو جو لوگ دہراتے پھرتے ہیں۔ سب چال تھی ۔۔۔ سازش تھی ۔۔۔"

کس کی ؟ انگریزوں کی تا ۔ ۔ ۔ ؟ اورنگ زیب کے آتے ہی حکومت اتنی کمزور کیوں پڑ گئی کہ الگ الگ صوبوں کے راجے رجواڑے بھی بغاوت کی صدا بلند کرنے لگے ؟"

بزرگ چپ رہے۔ کچھ بولے نہیں۔ ہاں ایک دوسرے نوجوان نے بوجھل سانس بھری۔

" پہلے فرنگی حکمراں تھے اور اب ہندو۔ مسلمان قوم کے نصیب میں اب ماتحتی لکھی ہے ؟"

" ان سے منہ لگانا بیکار ہے " ———— عبداللہ بیگ چپ ہو گئے۔ آگے کیا کہتے۔ باتیں رک گئی ہیں۔ چوکس چوکنا لوگ کان کھڑا کئے اِدھر اُدھر دیکھتے۔ کچھ دور تک چوکڑی بھر کر پھر واپس لوٹ رہے ہیں۔ اس پول سے لے کر اس پول تک۔ پو پھٹنے تک گشت جاری رکھنی ہے۔ کتنی مشکل سے پہریداری کی اجازت مل سکی تھی۔ وہ محلے کے ایڈیشنل جج شوکت صاحب کی سفارش کا نتیجہ تھا کہ یہ مسلمانوں کا محلہ ہے۔ یہاں کے لوگ خود کو غیر محفوظ سمجھ رہے ہیں۔ باہر سے کچھ لوگوں نے آکر رات کے وقت یہاں کافی لوٹ مار کر بازار گرم کیا تھا۔ انھیں رات میں پہرہ دینے کی اجازت دی جائے۔ ایڈیشنل جج صاحب کی بات کا اتنا ہی اثر ہوا کہ ایک پولس جیپ محلے میں بیٹھ گئی جس پر اونگھنے والے چند کانسٹبل کے سوا دوسرا کوئی افسر نہ تھا اور یہ محلے والے تھے ۔ ۔ ۔

عبداللہ بیگ کی آنکھوں میں صرف ایک مہینہ پہلے کا وہ دل ڈوبنے والا نظارہ گھوم رہا تھا۔ یوں تو فضا کب کی خراب ہو چکی تھی۔ جب ہر آنکھوں میں شک کا جانور مچلتا ہوا نظر آتا۔ ہندو کی آنکھوں میں مسلمان چور تھا اور مسلمان کانٹے کی طرح ہندو کو کھٹک رہا تھا۔ عبداللہ بیگ کو اس وقت رما شنکر کی یاد آ رہی تھی۔ بچپن کے دوست رہے تھے رما شنکر۔ ساتھ پڑھتے لکھتے بڑے ہوئے۔ ایک جگہ سروس کی۔ اس دن آفس گئے تو دیکھا رما شنکر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لنچ آور میں وہ تھکے ہارے قدموں سے رما شنکر کے ساتھ کینٹین میں آکر بیٹھ گئے۔

مولوی ———— رما شنکر اُسے مولوی ہی کہتا تھا۔ آج اس کی آواز میں لرزش تھی " مولوی ایک بات پوچھتی ہے۔ مجھ سے تسلی کرنی ہے خود کی " وہ آہستہ آہستہ لفظ چبا کر بول رہا تھا " کیا میں سمجھ لوں کہ مجھ پر وقت آیا تو تم میرا گھر جلا دو گے ؟"

اوپر سے لے کر نیچے تک سناٹے میں ڈوب گئے عبداللہ بیگ۔ تھرائی پلکوں سے

رماشنکر کو گھورا . . . پنڈت، اور کیا میں امید کروں کہ تم . . .؟
"بس دوست مجھے جواب مل گیا۔"
رماشنکر نے فرطِ محبت سے اُس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر چوم لیا تھا۔
"یہاں صرف ہم اور تم نہیں ہیں مولوی۔ پھر وہ کون لوگ ہیں وہ ہم میں سے تو ہو نہیں سکتے۔"
"جس ملک میں گاندھی جیسی عظیم ہستی کے مارنے والے کو بھی کچھ لوگ مہان بنا کر پوجتے وہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ میرے بھائی سوچتا ہوں کسی نے سچ کہا ہے۔ انسان اگر تہذیب نہیں سیکھتا تو وہ پُورا پُورا جانور رہوتا۔"
رماشنکر کا زوردار ٹھہاکا گونجا۔ "صحیح کہتے ہو تم۔ باشان بیگ کے آدمی مانو کو دیکھ لو۔ کیا وہ آدمی تھے؟"
اب وہ پُرسکون تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں وہ آگ روشن تھی۔ وہ آگ جو آزاد ملک کے آزاد شہری کو غیر محفوظ بتا رہی تھی۔
اور یہ ٹھیک اُسی رات کا قصہ تھا جب آدھی رات گئے فائر کی ایک تیز آواز محلے میں گونجی۔ پھر تو جیسے بندوقوں کے مُنہ کھُل گئے۔ عبداللہ بیگ سوتے سے اٹھے۔ زہرہ بیگم کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ باہر کمرے میں سویا ہوا قیوم ہتاش سا ان کے دروازے پر آکر ٹھہر گیا۔
"ساب ریٹ ہو گیا۔"
ایک ساتھ کتنی ہی گولیوں کی آواز متعدد چیخوں کے ساتھ فضا میں گونج گئیں۔ پاگلوں کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگے عبداللہ بیگ۔ بیگم نے سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کردی۔ وہ روئے بھی جا رہی تھیں اور لرزتے ہونٹوں سے تلاوت بھی کر رہی تھیں۔
"گھبراؤ نہیں۔ اللہ پاک پر یقین رکھو۔ سب ٹھیک رہے گا۔"
مگر تسلی کے یہ بول کس کو دیتے۔ چار گھنٹے تک مسلسل گولیوں کے چلنے اور لوگوں کے چیخنے چلّانے کی آواز فضا میں گونجتی رہی۔ اللہ نے واقعی ان کے گھر پر کرم کیا تھا۔ یہ افتاد اس وقت ٹلی جب دیوار گھڑی نے چار کا گھنٹہ مارا ٹھیک اس وقت باہر سے کچھ شور سُنائی دیا۔

باہر نکلے بیگ صاحب ! آصف میاں کا پورا خاندان شہید ہو گیا۔
زہرہ نے پریشان حال نظروں سے اُن کی طرف دیکھا۔ زہرہ کو سمجھاتے ہوئے وہ باہر آ گئے۔
باہر حواس باختہ محلے کے لوگوں کا گروہ کھڑا تھا۔
"غضب ہو گیا بیگ صاحب ! آصف میاں کا پورا خاندان شہید ہو گیا۔ آس پاس کے دو گھر بھی کمبختوں نے پھونک دیئے۔ باہر کے لوگ آ کر رعب دکھا کر چلے گئے اور ہم اپنے گھروں میں بند رہے۔"
کچھ نوجوان بھی کھڑے تھے جن کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔
"پورے چار گھنٹے بعد پولیس آئی ہے۔ چار گھنٹے بعد۔ چار گھنٹوں تک اس محلے میں غنڈے آ کر بے رحمی سے گھر پھونکتے اور لوگوں کو قتل کرتے رہے۔ اس وقت پولیس کے جوان کہاں تھے؟"
لوگ اُبل رہے تھے اور ادھر لاؤڈ سپیکر پر اعلان کر رہی تھی۔ "آپ سب لوگ اپنے اپنے گھر واپس جائیے۔ واپس جائیے شہر میں غیر متعینہ مدت کے لئے کرفیو لگایا جاتا ہے۔ ایک گھنٹے بعد کسی بھی آدمی کو دیکھ لینے پر گولی ماری جاسکتی ہے ....
ایسے نہیں ہو گا۔ اب چوڑیاں اُتارنی ہوں گی۔ بہت ظلم سہہ لیا۔" ایک نوجوان پھنکارتا ہوا بولا۔
"عبداللہ بیگ آئیے۔ ابھی کرفیو میں ایک گھنٹہ ہے۔ آصف میاں کے گھر پڑی لاشیں دیکھے۔ ایک قطار سے لاشیں سجی ہیں۔ مارنے والے تو مار گئے اب کیا یہ تجہیز و تکفین کی اجازت بھی نہیں دیں گے؟"
"ہم اس کی اجازت حاصل کریں گے۔"
پولیس کے سپاہی ڈنڈے کے زور پر لوگوں کو واپس بھیج رہے تھے۔ اب آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے۔ آپ اپنے گھروں میں واپس جائیے۔ پھر پانچ بج گئے۔ دروازے بند۔ محلہ صبح کے ہلکے اجالے میں اجاڑ اور ویران ہو گیا۔
مگر عبداللہ بیگ کی آنکھوں میں سکون کہاں۔ وہاں وحشت ہی وحشت تھی۔ وہ ایک قطار سے سجی ان لاشوں کو دیکھ آئے تھے۔ آصف میاں ... ان کا لڑکا سلمان ... تین سال کی

معصوم بچی رخسانہ، بہو، بیٹا۔۔۔ جاوید، جس کی صرف دو مہینے پہلے شادی ہوئی تھی۔ ایک قطار سے سجی تھیں لاشیں اور معاملہ کیا تھا۔۔ سلمان نے نوجوانی کے جوش میں آکر ہفتہ بھر پہلے محلّہ مانک پورہ کے ایک ہندو لڑکے کو گولی مار دی تھی۔ پھر وہ کہاں غائب ہو گیا کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ پولیس نے گھر پر چھاپہ بھی مارا۔ گھر والوں کو ڈرایا دھمکایا۔ بیانات لئے۔ "قرقی" ضبطی کا حکم لے کر آئے۔ گھر کی چیزیں توڑیں مگر سلمان کو جیسے زمین کھا گئی تھی۔ گھر والے روتے رہے۔ آصف صاحب شریف آدمی تھے۔ پولیس کے لوگوں کو لاکھ سمجھایا۔ سلمان نہیں ہے۔ آئے گا تو وہ ایک شریف شہری کی طرح اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ شہر کا ماحول تو پہلے سے ہی بگڑا ہوا تھا۔ اس قتل کے بعد فضا ہی دوسری ہو گئی تھی۔ مانک پورہ کے لوگ آصف میاں کے گھر کے پیاسے ہو گئے یہ بات پہلے سے ہی لوگ جانتے تھے کہ وہ لوگ سلمان کو چھوڑیں گے نہیں اور سلمان بچ کر جاتا بھی کہاں۔ وہ اس کا پٹھانی خون رنگ لایا تھا۔ جب اس نے چائے پیتے ہوئے ایک ہندو کو اپنے خلاف بولتے ہوئے دیکھ کر گولی مار دی تھی اور بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ سنا یہ بھی جا رہا تھا کہ جب سے فضا خراب ہوئی تھی تب سے ہمیشہ وہ اپنے پاس پستول رکھا کرتا تھا۔

اور مانک پورہ کے لوگوں نے سلمان کے جرم کا یہ ہولناک بدلہ لیا تھا۔ انھیں پتہ نہیں کیسے یہ خبر لگ گئی کہ آج رات سلمان اس محلّے میں دیکھا گیا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ راتوں رات لوگ جُٹ گئے اور دو تین محلّے کے لوگوں نے مل کر اس محلّے پر راتوں رات حملہ بول دیا۔ آصف میاں کے خاندان کے ساتھ بیچ بچاؤ کے لئے آئے ہوئے پڑوس کے دو گھر بھی پھونک دیئے گئے۔

جلے ہوئے نقوش اور قطار سے سجی لاشیں ——— عبداللہ بیگ کی آنکھوں میں وحشت کے کانٹے بو رہی تھی۔ چار دن تک مستقل کرفیو لگا رہا۔ پھر کرفیو میں ڈھیل دی گئی۔ اس بیچ بجلی فون کے تار بھی کاٹ دیئے گئے تھے۔ ایک ہفتہ بعد سب معمول پر آ گیا۔ کرفیو ختم تھا۔ مگر پولیس کی گشت جاری تھی۔ لیکن البتہ پولیس کے سپاہیوں سے امید اٹھ گئی تھی۔ کہنے کو محلے میں شانتی تھی، عبداللہ بیگ محسوس کرتے کہ جب تک یہ لاشیں ان آنکھوں میں سلگتی رہیں گی، برابری اور مساوات کی بات بیکار ہے۔ ساتویں دن انھوں نے اپنے دوست رما شنکر کو فون لگایا۔ ملاقات کئے بہت دن ہو گئے تھے۔

"کیسے ہو؟ رما شنکر کی کانپتی آواز ابھری یہ سالوں نے ٹیلی فون کے تار بھی کاٹ دیئے تھے۔ تمھارے بارے میں سخت فکر مند تھا۔"

"ٹھیک ہوں۔"

"دفتر تو شاید ابھی کچھ دن اور بند رہیں"

"اس نے محسوس کیا، رما شنکر محض بات بدلنے کے لئے دفتر کا ذکر لے کر بیٹھ گیا تھا۔ اس دن کی بات انھیں یاد نہیں۔ رما شنکر کا لہجہ بھولے نہیں تھے اور شاید یہی وہ زہر تھا جسے اس وقت وہ فون پر اگلنے والے تھے۔

"محلّے کی خبر تم نے اخبار میں دیکھی ہو گی۔"

"ہاں بہت بُرا ہوا۔"

"آصف بھائی کے گھر سے میرے گھریلو مراسم تھے۔ میری بیوی یہ حادثہ جھیل نہیں پائی ہے۔ ہفتہ دن ہو گیا کچھ بولتی نہیں۔" اس نے محسوس کیا فون پر رما شنکر کی آواز کانپ رہی تھی۔" مجھے معلوم ہے۔۔۔"

"میں نے وہ لاشیں خود دیکھی ہیں پنڈت۔ اور اب تم کیا کہتے ہو۔ جب تک یہ لاشیں میری آنکھوں میں سلگتی رہیں گی کیا تمھارے نام پر ایک شک ایک خوف ایک خطرہ ہمارے اندر نہیں جاگے گا۔۔"

"مولوی۔۔۔" اس نے تھرتھراتی آواز سُنی رما شنکر کی۔۔۔ ذرا صبر سے کام لو مولوی۔۔۔ تم نے میرے محلّے کی خبر پڑھی ہو گی۔ دین دیال کو جانتے ہو۔۔۔"

عبداللہ بیگ سَن سے رہ گئے تھے۔ دین دیال رما شنکر کے بھائیوں جیسے تھے۔ وہ چونکتے ہوئے بولے "کیا ہوا اُنھیں؟"

دوسری طرف سے آواز میں ہلکی سی طنز کی یورش تھی۔۔۔" اب اگر اس کی لاش کو میں اپنی آنکھوں میں بسا لوں تو کیا میں تمھارے لئے بدگمان نہیں ہو سکتا۔"

"رما شنکر!"

عبداللہ بیگ چپ ہو گئے تھے۔

"سیاست، سیاست۔ سب سیاست ہے عبداللہ بیگ۔"

"تو یہ سیاست لوگ سمجھتے کیوں نہیں۔ کیوں جانور بن جاتے ہیں؟"

"جانور نہیں بنیں تو پھر سیاست رہی کہاں؟ میرے دوست حادثہ کو بھولنے کی کوشش کرو جیسے مَیں کوشش کر رہا ہُوں۔ صرف ایک بات بتاؤں۔ ہمارے سیاسی رہنما سیاست میں فرنگیوں سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ چند سمجھدار لوگوں کو آگے آنا پڑے گا۔ ہم تم جیسے لوگ بھی اس چکّی میں پس گئے تو آنے والے بڑے خطرے سے ملک کو کوئی نہیں بچا پائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو رما شنکر۔"

عبداللہ بیگ نے ہار مان لی تھی۔

گشت جاری ہے۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ مشکل سے ایک مہینہ۔ کرفیو پُوری طرح سے ہٹ گیا تھا۔ دفاتر کھُل گئے تھے۔ ہاں اسکول کالج اب بھی بند تھے۔ اب بھی کہیں کہیں جھٹ پٹ واقعات ہو جاتے تو دھارا ۱۴۴ لگا دی جاتی۔ شہر کا سکون پُوری طرح چھن گیا تھا۔ لوکل اُردو اخبار ہندوؤں کے خلاف جی بھر کر لکھ رہے تھے تو ہندی سماچار پتر مسلمانوں کو غدّار اور پاکستانی بنا کر دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ عبداللہ بیگ صرف ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتے۔ توازن کہیں نہیں ہے۔ نہ یہاں نہ وہاں۔ توازن سے کوئی کام بھی نہیں لینا چاہتا۔ اگر یہی ماحول رہا تو آپس کی دوستی محبّت، خلوص سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ معاملہ کتنا نازک تھا مگر مجبُور تھے عبداللہ بیگ۔ جب گشت پر نکلے ہوئے ان لوگوں کو وہ سمجھا نہیں سکتے تو پھر وہ کسے سمجھائیں۔ جب اپنی گھر والی زہرہ کو وہ اپنی بات نہیں منوا سکتے تو دوسرے کی بات کیا چھیڑیں۔ وہ تو ہندو کا نام سُنتے ہی بھڑک اُٹھتی ہے۔ اب انھیں کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ شاید آنے والا وقت یہ زخم مندمل کر سکے۔ مگر یہ تو ہار ہوئی نا۔۔۔ صرف ہار۔۔۔"

چلتے چلتے پاؤں دُکھ گئے ہیں۔ ایک نوجوان کہہ رہا ہے۔

"خیر اس سے ایک فائدہ تو ہوا۔ ہماری آنکھیں کھُل گئیں۔ ہم میں اتحاد پیدا ہو گیا۔"

"اب کافروں کے خلاف جہاد کی ضرورت ہے۔"

ایک بزرگ نے تجویز پیش کی۔

"اگر جہاد کا اعلان ہو تو آپ لوگ تیار ہیں"

"ہاں ہم سب تیار ہیں"

نوجوانوں نے جوش سے کہا۔ سوال پوچھنے والے بزرگ نے راحت کی سانس بھری۔ پھر اس کی طرف مڑے۔ عبداللہ بیگ تم خاموش ہو۔ کیا تم جہاد میں ہمارا ساتھ نہیں دوگے۔

"یہ جہاد نہیں تو اور کیا ہے۔ رات کے دو بج رہے ہیں اور ہم گشت پر ہیں" مسکرا کر اس نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"تم نئے زمانے کے ہو، افسر بھائی" بزرگ کے لہجے میں خفگی تھی "تمھارے اندر یقین اور ایمان دونوں کی کمی ہے"

عبداللہ بیگ کا دماغ جھنجھنا گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا یا اس کے اندر اخلاق کی کمی ہوتی تو وہ بزرگ کی بات کا جواب دے دیتا مگر وہ مجبور تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو یہ جماعت اُسے اپنے خلاف سمجھ لے"

رات آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔ چمکتے ستارے ہلکی سفیدی میں چھپتے جا رہے تھے۔ اور گشت جاری تھی مستقل جاری تھی۔ قدم تھک گئے تھے اور نہیں بھی تھکے تھے کہ مستقل جوتے بج رہے تھے اور جوتے چپل کی آواز رات کے سناٹے میں شور پیدا کر رہی تھی۔

اچانک ایک کھٹکا ہوا ان کے اندر کیا وہ سچ مچ ہندوستانی ہیں اور یہ سارے کے سارے؛ یہ ہندوستانی ہونے کا کیسا عجیب و غریب ثبوت پیش کر رہے ہیں وہ لوگ کہ عدم تحفظ کا جذبہ رات کے سناٹے میں انھیں چوکیداری کے لئے مجبور کر رہا ہے۔ یہ کیسی اجنبی آوازیں ہیں جہاں اپنے ہی بھائیوں کے لئے خطرہ، خوف اور شک جاگتا ہے، نہیں وہ ہندوستانی ہیں۔ ہندوستانیت فرنگیوں نے بہت پہلے سلا دی۔ صرف کفن بچا تھا اور کفن کے بھی چیتھڑے چیتھڑے ہو گئے ہیں۔ اندر سے کوئی بے سُری آواز میں گا رہا ہے۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ... ہم بلبلیں ہیں اس کی ... یہ گلستاں ہمارا ...

نہیں... ہم سب غدّار ہو گئے ہیں۔ پورے ملک کے لوگ وفاداری اور محبت کا

کوئی جذبہ سالم نہیں بچا ہے ۔۔۔ سب کچھ ختم ہو گیا ۔

گشت کے لئے نکلے قدم تھک رہے تھے ۔ کیا یہی اپنے ہندوستانی ہونے کا ثبوت ہے ۔ چاروں جانب پھیلی ہوئی آگ ۔ یہ آگ فائر بریگیڈ نہیں بجھا سکتی ۔ یہ آگ بڑھتی جائے گی ۔ پھیلتی جائے گی ۔ پھر ایک دن پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی ۔

ایک پول سے دوسرے پول کی طرف قدم لوٹ رہے ہیں اور اب قدموں میں تکان سرایت کر گئی ۔ آنکھوں میں نیند کے ڈورے تیر رہے ہیں اور ایک بوجھل منظر نگاہوں سے فریاد کر رہا ہے ۔ کرفیو تھمنے کے بعد وہ اپنے دوست رماشنکر کے یہاں گئے تھے ۔ باہر کرسی نکلی تھی ۔ حالات حاضرہ پر انتہائی سنجیدگی کی کتاب کھل گئی تھی ۔ اچانک اندر سے ان کا آٹھ سالہ لڑکا پپّو دوڑتا ہوا آیا ۔ پپّو کے ہونٹوں پر سوال تھا :

"پاپا ۔۔۔ پاپا یہ ہندوستان کیا ہوتا ہے ؟"

"کیا ؟"

رماشنکر کے ساتھ عبداللہ بیگ بھی غور سے پپّو کا چہرہ دیکھتے ہیں جیسے کوئیز ، معمہ یا کوئی عجوبہ پہیلی حل کر رہے ہوں ۔

"ہاں ۔ وہ ٹی وی پر اکثر گانا ہوتا ہے نا سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا "

"ہاں ۔۔۔ " رماشنکر کچھ کہتے کہتے رک گئے ہیں ۔ میری طرف بیچارگی بھری نظروں سے دیکھتے ہیں ۔ خفگی کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں " تم کیسے لڑکے ہو ، ہندوستانی بھی نہیں جانتے "

عبداللہ بیگ کو ایک دلچسپ کھیل ہاتھ لگ گیا وہ انہیں روکتے ہیں ۔ مسکراتے ہوئے پپّو سے کہتے ہیں ۔

"بیٹے ۔ تم انڈیا جانتے ہو ؟"

"ہاں "

"بھارت ؟"

"ہاں "

"اور ہندوستان ؟"

"نہیں" پتو اطمینان سے جواب دیتا ہے۔

عبداللہ بیگ ایک لمبی سانس کھینچتے ہیں۔ رماشنکر اُن کی طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں جیسے سوچ رہے ہوں کہ پتہ نہیں وہ . . . عبداللہ کیا کہنے والا ہے۔

اور عبداللہ بیگ ایک تیز ہنسی اُچھالتے ہوئے پتو سے کہتے ہیں۔

"کبھی یہ بھی ایک ملک ہوا کرتا تھا، بیٹے۔ اس ملک کا تذکرہ اب تمھیں دُنیا کی کسی کتاب میں نہیں ملے گا۔ جیسے کچھ دِنوں بعد بھارت کا۔ تم صرف انڈیا سے اپنا سروکار رکھو سمجھے اب جاؤ تم . . ."

کچھ نہ سمجھتا ہوا پتو لوٹ گیا ہے۔

رماشنکر مجھ سے پوچھ رہے ہیں "یہ کیا کہا تم نے؟"

"میں جارہا ہوں" ــــــ عبداللہ بیگ اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

"کہاں چل دیئے؟"

"دل پر میل سی جم گئی ہے پنڈت۔ یہ احساس نہیں تھا کہ اب آٹھ سال کا کوئی بچہ یہ پوچھنے آئے گا کہ ہندوستان کیا ہوتا ہے؟"

"مجھے افسوس ہے مولوی؟"

رماشنکر نے سر جھکا لیا ہے۔

کس کس شئے پر افسوس کروگے پنڈت۔ وقت سب کچھ چھین رہا ہے۔ اور ہر گزرے ہوئے وقت کے ساتھ ہم غدار ہوتے جارہے ہیں۔

پنڈت چونک گیا ہے۔ مگر اُسے یونہی تنہا چھوڑ کر عبداللہ بیگ دُور نکل آئے ہیں۔ دور اور یہاں گشت جاری ہے۔

جوتے چپل بج رہے ہیں اور جیپ پر پولیس کے سپاہی اونگھ رہے ہیں ---!

گلبن ۱۹۹۶ء

سانپلچھ (ہندی) ◆◆

دہشت کیوں ہے؟

(۱)

وہ بنجر زمینوں میں بوتے رہیں گے
ترقی
اور فصل کاٹنے کے لئے تھما دیں گے
ہمارے کمزور ہاتھوں میں بے اطمینانی کے ہتھیار
لڑ پانا آسان نہیں ہے
اپنے آپ سے ہونے والی اس اندرونی کیفیت کی جنگ میں
ہمیں ہمیشہ ملتی رہی ہے ہار
جو کافی ہے اپنی آتما (روح) پھونکنے کے لئے
اب کوئی اڑچن (رکاوٹ) نہیں رکھنا ہے ہمیں اپنی ذات پر
اور جنگوں سے باہر نکل کر دیکھنا ہے

۲

زمنی قصے اور کہانیوں نے ایکدم سے بچ ہو کر دنیا کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ جب ہر پل ایک خطرہ ایک ڈر انجانے میں بھی ہمارے ساتھ موجود ہوتا۔۔ موجودہ دور نے سائنس میں جو بھی ترقی کی ہو مگر عام انسانوں کے لئے اس کی سب سے بڑی ترقی ہے ——— چاروں جانب

پھیلی ہُوئی دہشت، بے اطمینانی اور ہر پل ڈستا ہُوا انجانا سا خوف ـــــــ جانے کب سے ہاتھوں میں اخبار لئے میں بھی کچھ سوچ رہا ہوں۔ جین تین چار بار مجھے دیکھ چکی ہے اور ہر بار اس نے مجھے اس بات کا احساس دلایا ہے ۔ ۔ ۔ پاپا، کیا سوچ رہے ہو تم؟ آج رات ٹی۔ وی پر کون کون سے اچھے پروگرام ہیں؟ اور دِنوں کی طرح جین سے ٹی۔ وی پروگراموں پر بحث نہیں ہوئی اس بار۔ کچھ بولنے کی خواہش نہیں ہوئی۔ کچھ دیر پہلے ارمیلا کی سُنائی گئی خبر مجھے اُلجھن میں ڈال گئی ہے۔ کبھی سوچتا ہُوں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ پھر سوچتا ہُوں، مگر ایسا ہو بھی تو سکتا ہے۔ آج کے دَور میں کس پر بھروسہ کیا جائے۔ مگر افتخار صاحب کے بارے میں سوچتے ہوئے ایکدم سے کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

"صاحب چائے پئیں گے آپ؟"

آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تو سامنے رام پکار کھڑا تھا۔ گھر کا پُرانا وفادار۔ شاید جب سے آنکھیں کھُلی تھیں تب سے رام پکار کو دیکھ رہا تھا۔ آتے جاتے کتنے ہی موسم بدلے ہوں گے مگر رام پکار پر ایک ہی موسم ہمیشہ سوار رہا۔ وفاداری کا موسم۔ اس وقت بھی وہ ہاتھ میں چائے کا کپ لئے کھڑا تھا۔

"میم صاحب نے بھجوایا ہے صاحب، رکھ دُوں؟"

کچھ ہی دیر بعد ارمیلا بھی ٹہلتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ آنکھوں میں تشویش کی لہر تھی۔

"سامان اُتر گیا؟" چائے کی پیالی کمزور ہاتھوں سے اُٹھاتے ہوئے پوچھتا ہوں۔

"اتر رہا ہے۔ دو۔ دو بیل گاڑی ہے۔ کئی بکسے ہیں۔ کئی کپڑوں کی گٹھریاں۔ ان میں سے ایک میں کارتوسیں بھی ۔ ۔" ارمیلا کو بھی شاید اپنے لہجے کا ڈر محسوس ہو گیا تھا۔ کچھ تھکی تھکی سی آواز میں بولی "جانے کیوں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ شہر کی فضا بھی کچھ دنوں سے بدلی ہوئی ہے۔ مگر افتخار صاحب ۔ ۔ ۔"

"ہاں۔ مجھے بھی یہی شک ہے۔ افتخار صاحب کے یہاں کارتوسیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"صاحب! کل جو ٹی۔ وی پر دکھایا گیا تھا وہ دھروتارا تھا نا۔ ۔؟" دھروتارا اپریل ۱۹۸۹ء کے وسط سے آسمان پر دکھائی دیا تھا۔ اُس زمانے میں ملک کی صورتِ حال کو لے کر

اخبارات تشویش ظاہر کررہے تھے۔) رام پکار پوچھ رہا تھا۔

"ہاں ٹھیک سمجھے۔ دھرو تارا ہی تھا" دماغ بوجھل ہو تو کچھ بھی جواب دیتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔

"یہ دھرو تارا کیا ہوتا ہے صاحب؟"

رام پکار کی آنکھوں میں تجسّس تھا۔ ارمیلا بھی شاید خود کو پچھلی باتوں سے کاٹنے کی کوشش کررہی تھی۔ دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "کہتے ہیں جب دُنیا میں کوئی آفت آنے والی ہوتی ہے یا کوئی بہت بڑا لیڈر مرنے والا ہوتا ہے تو آسمان پر دھرو تارا دکھائی دیتا ہے۔ فرسٹ ورلڈ وار کے دوران بھی یہ دھرو تارا آسمان پر دکھائی دیا تھا۔"

"اچھا ہے صاحب۔ دُنیا ختم ہوجائے۔"

رام پکار زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اور کیا رکھا ہے صاحب دُنیا میں۔ ہمارے وقت میں تو ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ ٹھاٹھ سے کھاتے تھے اور عیش کرتے تھے۔ مگر اب تو سب کچھ بدل گیا صاحب۔ اب یہی تو گھر گھر ٹی۔وی آگئی ہے۔ پہلے بھو بنو کو بولتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ مگر سچ پوچھو تو صاحب اس طرح کی ترقی سے خوشی نہیں ہوئی۔ جین بیٹا جو خبریں سناتی ہیں اور ٹی۔وی پر جو کچھ دیکھتا ہوں اس سے جینے کی آگے خواہش نہیں ہوتی۔ صرف دھماکوں کی بات۔ بم کی بات۔ یہ ملک بم بنا رہا ہے۔ وہ ملک بم بنا رہا ہے۔ اپنے ملک کا ایک ٹکڑا چھین کر مسلمانوں نے اپنا الگ ملک تو بنا لیا پھر بھی چین نہیں پڑا۔ جائیداد سے حصّہ بٹا پایا سو الگ۔ اب گھر توڑ رہے ہیں۔ اچھی سمجھداری ہے ان کی بھی صاحب ۔ ۔ ۔"

"لو دیکھو۔ رام پکار تک یہی سوچتا ہے۔" ارمیلا نے میری طرف دیکھا۔ "مگر افتخار صاحب ۔ ۔ ۔"

"ہاں میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ کل ہی تو اُن کی لڑکی نادرہ آئی تھی ملنے کے لئے۔ جین کی دوست بھی ہے ۔ ۔ ۔"

میری بات کاٹتے ہوئے اُرمیلا بولی۔ "اور خود افتخار صاحب بھی تو برسوں سے ایک بھائی کی طرح اس گھر سے جُڑے رہے ہیں۔"

میں نے پھر شک ظاہر کیا۔ "مگر تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ کارتوس ہی۔۔"

"میں خطرہ بھانپ رہی ہوں" اُرمیلا نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "یہ مسلمان لوگ یکدم سے کائیاں ہوتے ہیں۔ تمہیں پہچان ہو یا نہ ہو لیکن میں پہچان گئی ہوں۔ جمشید پور میں میری بہن کے سسرال کے کافی لوگ مارے گئے تھے اور کن لوگوں نے مارا تھا۔۔۔ یہ تو سب کچھ اوپری دکھاوا بھی ہوں نہیں تو افتخار صاحب۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے"

"تم ہوش میں نہیں ہو۔۔" اُرمیلا بگڑ کر بولی "یہ تمہاری دوستی بول رہی ہے۔ شہر کی فضا خراب ہے اور افتخار صاحب نے اپنی حفاظت کے لئے اور ۔۔۔ تمام انتظامات کر لئے ہیں"

یہ سچ ہے شہر کی فضا دو ایک روز سے بہت خراب چل رہی تھی۔ عام جنتا کے بیچ ایک تناؤ کا ماحول دیکھنے میں آ رہا ہے۔ مگر اس تناؤ کے ماحول میں افتخار صاحب جیسا سنجیدہ اور پڑھا لکھا آدمی بھی اس گھٹیا سطح پر آ کر سوچ سکتا ہے۔ یہ میرے لئے حیرانی کی بات تھی۔ پتہ نہیں ڈر اور خوف کے کیسے ٹوٹے پھوٹے پل پر سوار ہو گئے ہیں ہم جہاں سے شک وشبہات کے علاوہ دوسرا کوئی خیال زور پکڑتا ہی نہیں۔ اُرمیلا نے کتنی بار کہا۔ ان چھوٹے موٹے سامانوں کا جھنجھٹ چھوڑو۔ ضروری سامان آج کے دور میں صرف ہتھیار ہیں۔ ہتھیاروں کی موجودگی میں یہ خیال ہم سے جڑا رہے گا کہ مریں گے تو پانچ کو مار کر۔ تم کیوں نہیں گن (Gun) خریدنے کے لئے پرمیشن لیتے ہو۔ ہمیں اپنی حفاظت کے لئے کچھ نہ کچھ سامان تو گھر میں رکھنے ہی ہوں گے۔۔"

"پہلے سوچا تھا۔ کیوں۔ کس لئے۔۔۔ کس کو مارنے کے لئے؟ محلّے میں ایسا ہے ہی کون جس کے لئے ہتھیار رکھنے کی ضرورت پیش آئے مگر آج پتہ نہیں کیوں۔ ہتھیار کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ جب ایک انجانے سے خوف نے اندر ہی اندر مجھے چھید ڈالا تھا۔ اگر ایسا ہو گیا تو بغیر ہتھیار کے کیسے لڑیں گے؟ ہتھیار تو مجھے پہلے ہی خرید لینے چاہئے تھے۔۔"

چائے کا خالی کپ لے کر رام پکار کمرے سے باہر نکل گیا۔ نگاہ اٹھی تو سامنے جبین نظر آئی جو ٹھیک اسی وقت کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"ارے پاپا۔۔۔ تمہارے اس تھنکنگ موڈ سے بعض دفعہ چڑھ سی ہوتی ہے"

جبین ہلکے سے چلائی۔ ذرا پیپر دیکھوں۔ آج ٹی۔وی پر کون کون سے پروگرام ہیں۔ پتنے

پلٹتے ہوئے اس کا موڈ پھر آفت ہو گیا تھا۔ روز وہی راجیو گاندھی کی بات چیت ۔ امریکہ کا دورہ ۔ رُوس کا دورہ ۔ سارے پروگرام روک کر اب بس یہی دینے لگے ہیں۔ ٹی وی والے آج پھر وہی ۔ ضیاء ، راجیو بات چیت ۔ اور بات چیت میں کیا ہوتا ہے ۔ صرف بم دھماکوں کی باتیں ۔ اب تو یہ سب روز روز سُنتے سُنتے اندر بھی دھماکے ہوتے رہتے ہیں ۔ ایسا کیوں سے ہوتا ہے پاپا ۔ کیا آپ محسوس نہیں کرتے روز روز ان بموں اور دھماکوں کی خبر دیتے ہوئے حکومت ہم سب لوگوں کو سلو پوائزن دے رہی ہے ۔ ۔ ۔"

"سلو پوائزن ؟" مَیں نے جین کی طرف دیکھا ۔

"ہاں پاپا" سلو پوائزن" یہ سائیکولوجیکل ایفکٹ ڈالنے کا کامیاب تجربہ ہے ۔ پُوری آبادی کو بھڑکا دو ۔ ہر طرف ڈر اور خوف کا جال بُن دو ۔ خطرے کا احساس دلاتے ہوئے اسے اندر سے توڑ دو ۔ عام آدمی اس طرح کے ماحول میں زیادہ اُڑنے کی کوشش نہیں کر سکتا ۔ ٹی وی، ریڈیو پیپرس عام آدمیوں کے دماغ خراب کرنے کے لئے کافی ہیں کسی دن کا بھی پیپر اٹھا لیجئے کوئی بھی خبر ان دہشت بھری خبروں سے الگ نہیں ہے ۔ مَیں نہیں سمجھ سکی پاپا ، آخر ایسا کیوں ہے ؟ گورنمنٹ چاہتی کیا ہے ۔ ہے نا کڑوی بات پاپا ۔ ۔ ۔ مگر یہ سچ ہے ۔ ۔ ۔" جین ذرا ٹھہر کے بولی " کل اسی لئے نادرہ سے میری تھوڑی سی لڑائی بھی ہو گئی ۔ بعد میں خیال آیا مَیں بھی کتنی کنزرویٹیو ہو گئی تھی "۔

"نادرہ سے تمھاری لڑائی ہو گئی ؟"

" ہاں پاپا ۔ وہی ہندوستان پاکستان کے ایشو کو لے کر" جین ہنستی ہے " شری لنکا سے میچ چل رہا تھا نا اور پاکستان جیت رہا تھا ۔ مَیں نے نادرہ سے کہا کہ تم تو پاکستان کے جیتنے پر خوش ہو رہی ہو گی اس پر نادرہ بولی ۔ مجھے کیوں خوشی ہو گی تو مَیں نے جھٹ سے اُس پر پاکستانی کی مہر لگا دی ۔ نادرہ بگڑ گئی ۔ اس نے بس اتنا ہی کہا کہ وہ آج کے اس گندے ماحول میں بار بار ۔ اس بات کا احساس دلانے کی ضرورت نہیں محسوس کرتی کہ وہ جس قوم کو بیلونگ کرتی ہے وہ اس ملک کے لئے وفادار ہے ۔ شاید ایسا احساس دلانے سے بھی شک و شبہ کی ایک فضا قائم ہوتی ہے ۔ مجھے لگتا ہے نادرہ ٹھیک کہتی ہے ۔ ساتھ ساتھ جیتے ہوئے

یہ آروپ (الزام) کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں نے سوچ لیا ہے۔ آج ہی جاؤں گی نادرہ سے معافی مانگنے کے لئے۔"

"مگر آج تم نہیں جاؤ گی۔" اُرمیلا جو کافی دیر سے چپ تھی، اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟"

"ہاں بیٹی! آج تم نہیں جاؤ گی۔" میں نے جین کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"کوئی خاص بات ہے؟" جین نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا۔

اُرمیلا پھر ناگواری سے بولی۔ "نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مگر تم نہیں جاؤ گی۔"

"آج یا کبھی نہیں؟"

"یہ وقت بتائے گا۔" اُرمیلا کے لہجے میں تلخی تھی۔ "ویسے تمہیں بتادوں افتخار صاحب اچھے آدمی نہیں ہیں۔۔"

جین ایک دم سے اُچھل پڑی۔ "ممی یہ بات تم کہہ رہی ہو۔ افتخار انکل کے بارے میں۔ یہ بات تم کہہ رہی ہو ممی۔ دُکھ سُکھ کے کتنے ہی موقعوں پر انھوں نے ہماری دل کھول کر مدد کی۔ پھر تم نے ہی تو بتایا تھا کہ میری پیدائش کے وقت بھی۔۔"

"وہ بات کی بات تھی۔ آدمی، آدمی کو سمجھنے میں دیر لگتی ہے۔"

"مگر اچانک یہ سب۔۔"

"بس تم نہیں جاؤ گی اور نادرہ سے بھی نہیں ملو گی۔"

اُرمیلا غصّے میں کھڑی ہوگئی۔ پھر بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ جین کی آنکھیں اب تک حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ رام پکار نے اندر آتے ہوئے دریافت کیا۔۔۔

"میم صاحب کی طبیعت خراب ہے کیا؟"

"نہیں رام پکار۔۔"

"تو پھر۔۔" رام پکار نے کمرے میں پسری ہوئی خاموشی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔۔

"کچھ باتیں ہم سے چھپائی جا رہی ہیں سب۔ جین بیٹا بھی خاموش، میں کچھ گڑبڑ ہے کیا صاحب۔۔ شہر کی حالت بھی ان دنوں اچھی نہیں ہے۔۔"

میں نے جین کی طرف دیکھا۔ کافی دیر بعد، خود کو معمول پر لانے کی کوشش کی۔ پھر ایک ٹھنڈی بوجھل سانس بھرتے ہوئے کہا۔" جین! ہم کس دُنیا میں سفر کر رہے ہیں۔ جانتی ہو اسٹار وارس (Star-war) کے عہد میں کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے بالکل اچانک دوسرے پلانٹ سے کوئی آدمی ہمارے سامنے آ کر ہمیں چونکا دے گا۔ مگر نہیں۔ اب خوف محسوس ہوتا ہے۔۔ جب ترقی اور نیوکلیائی ہتھیاروں کے دَور میں لیسر ریز، نیوٹران پارٹیکل بیم اور اسٹریٹیجک ڈیفنس اینشیٹو (Stretegic Defence Initiative) کی باتیں سُنتا ہوں۔ تم بھی پڑھی لکھی ہو جین۔ کیا تم محسوس کر رہی ہو۔ یہ دہشت کیوں پھیلائی جا رہی ہے۔ ڈیفنس کے ہتھیار کو لے کر توڑ پھوڑ کی یہ کیسی کاروائی چل رہی ہے۔ ہمیں کے نام پر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اور اس طرح کی خبروں کو بار بار پڑھا کر اور سُنا کر ہم سے کیا کہا جا رہا ہے۔ محض اتنی سی بات کہ ہم ترقّی کر رہے ہیں۔ چاند ستاروں سے آگے جا رہے ہیں۔ نہیں جین نہیں۔۔ کم از میرے خیال میں نہیں۔ میں ایسا نہیں سوچتا۔۔۔"

"ہاں پاپا" جین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا" جب اپنے ہی لوگوں کے لئے ایک ڈر ایک خوف، ایک خطرہ جاگتا ہے تو میں بھی کچھ ایسا ہی سوچتی ہوں کہ یہ محض ترقی نہیں ہے، بلکہ یہ کچھ اور بھی ہے۔ ہر آدمی کو کھُلی آزادی کا سلوگن دے کر، خوف اس کی آنکھوں میں بٹھا کر لحنت لحنت اس سے کچھ چھینا جا رہا ہے۔ امریکہ میں یہ وبا عام ہے کہ بچے اپنے ماں باپ کے جھگڑے کی خبر وہاں کی پولس کو دے دیتے ہیں اور پولس انھیں آکر گرفتار کر لیتی ہے۔ انجانے میں کیا ایسا نہیں لگتا کہ ہم پر ہر جگہ ایک انکش لگایا جا رہا ہے۔۔۔ اپنے آپ کو سمجھانے کا۔۔ روکنے کا۔۔۔ ہر قدم پر خود سے سمجھوتے کا۔۔۔ انکش ——"

اس لئے افتخار صاحب والی بات مجھے جچتی نہیں ہے" میں نے غصّہ سے کہا" اب ہی دیکھو محض بے بنیاد خوف کے نام پر تمام دروازے بند کروا دیئے ہیں ارمیلا نے۔ اندر داخل ہونے والا یہ ڈر آیا کہاں سے؟ لگتا ہے کھُلی آزادی دے کر ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے بدن کی پوری عمارت کو توڑے جانے کی ایک بھیانک سازش چل رہی ہے۔۔۔

"ہم اسپیس ایج سے بھی آگے بڑھ رہے ہیں پاپا" جین نے منہ بنایا" ترقی کے بیہودہ

نام پر یہ سب کچھ تو برداشت کرنا ہوگا اور ترقی کو کیا نام دیا ہے . . . اسٹریٹیجک ڈیفنس انیشیٹیو۔ کامن ویلتھ ہیڈس (Common Wealth Heads) کی کانفرنس بھی کوئی مسئلہ نہیں سلجھا سکتی۔ صرف اٹھا سکتی ہے مسئلہ زمین کی جنگ میں اسٹارس کو سمیٹنے کا سلسلہ . . . دو بڑی طاقتوں کی اس اندھی ہوڑ میں بیمار دُنیا کے اپسنے کا سلسلہ . . . اور اسٹار وارس کی اس خوشنما خواب کا نام رکھا اسٹریٹیجک ڈیفنس انیشیٹیو یعنی تجویزی دفاعی اقدام . . . ترقی کے اس کورے فلسفے کا ہی یہ بھیانک نتیجہ ہے . . . ہمارا اس سطح پر سوچنا ——— شک وشبہات کے اس پولیوشن (Pollution) میں بڑے بڑے کھلونے تھما کر ہماری اُڑان کے پروں کو کاٹ دیا گیا ہے اور ایک بند ندے ماحول میں اس گھٹیا سطح سے ہم باہر نہیں اُٹھ سکتے . . . افتخار انکل کے بارے میں کم از کم میں تو ایسا سوچ نہیں سکتی . . .“

”میں بھی ایسا نہیں سوچتا۔ مگر اُرمیلا نے افتخار صاحب کے سامانوں میں کارتوس . . .“

”کارتوس . . .“ جین چونک گئی . . . ”ممّی نے کارتوس دیکھا ہے . . .؟

”دیکھو جین میں خود ایسا نہیں سوچتا۔ مگر . . .“ اپنے لہجے کو کمزور محسوس کرتے ہوئے میں بولا . . . مگر یہ تو سوچو کہ دہشت کی شروعات کہاں سے ہوتی ہے۔ اندر، اندر یہ اپنی جڑیں کیسے مضبوط کر جاتا ہے۔ ہمیں کھوکھلا کرتے ہوئے یہیں پر ایک سوال اٹھتا ہے۔ اُرمیلا نے سچ مچ کارتوس دیکھا ہے یا اس کا شک ہے۔ دراصل یہ بھی ہمارے نکھے ہونے کا احساس ہے۔ نتیجہ ہے۔ اُرمیلا نے یہ کیسے سوچ لیا میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر کچھ تو احساس رہا ہوگا۔ جو برسوں سے تھوڑا تھوڑا کرکے اس کے اندر جمع ہوتا رہا ہوگا . . . بات اگر غلط بھی ہے تو لگتا ہے انجانے میں ہی اپنی ناسمجھی کے بل پر بے بنیاد شک وشبہات کے دائرے میں کچھ خوفناک ہتھیار جمع کر لئے ہیں ہم نے ”دوسروں کے لئے۔ اور اپنی دفاع کے لئے الفاظ تو ہیں ہی ہمارے پاس۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں ڈیفنس کے نام پر کیا کچھ کارروائی چلتی رہی ہے دُنیا میں۔ امن کے نام پر اسپیس میں ہونے والے نیوکلیائی اور ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال کیا پُوری انسانی برادری کو ایک خوفناک تباہی کی طرف نہیں ڈھکیل رہا ہے“۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”خبروں نے جو خوف کا ماحول بنایا ہے جین ہم اس سے باہر نہیں دیکھ سکتے“۔

"اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ممی نے افتخار انکل کو ۔ ۔ " اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹکڑے ٹکڑے یہ تمام باتیں اس ایک انجانے سے خوف سے ضرور جا ملتی ہیں۔ سوال ہے یہ دہشت اندر کیسے اُگ آئی یا پایا۔ انجانے پن اندر سے سوالات اُٹھتے ہیں جن کا اپنے پاس کوئی حل نہیں ہوتا ۔ ۔ "

"یا ہم ڈھونڈھنے کی ۔ ۔ "

اس کے ساتھ ہیں کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا تھا۔ جین بھی چونک گئی تھی ۔ دروازے پر دستک گونجی تھی۔ میں نے حیرت سے جین کو دیکھا۔ ابھی ہونے والے سارے مکالمے پل میں سو گئے۔ ۔ ۔ ۔ اندر سے اُٹھ کر اُرمیلا بھی دستک سن کر چلی آئی تھی۔ رام پکار دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ اُرمیلا بولی۔

"دروازہ نہیں کھلے گا۔

دستک برابر ہو رہی تھی۔

میں نے ناگواری سے کہا" یہ کیا نادانی ہے۔"

جین نے غصّے سے ممی کو دیکھا "کیوں نہیں کھلے گا؟"

"دروازہ نہیں کھلے گا" اُرمیلا نے فیصلہ سنا دیا تھا۔

دروازے پر پھر آواز گونجی "بھائی بھتیجا صاحب ۔ دروازہ کیوں نہیں کھل رہا ہے میں ہوں ۔ ۔ ۔ میں ہوں افتخار"

افتخار کے نام پر اُرمیلا کچھ گھبرا سی گئی۔ جین نے اُٹھنا چاہا۔ رام پکار نے آگے بڑھ کر میرے اشارے پر دروازہ کھول دیا۔ بوجھل قدموں سے افتخار اندر آگئے۔ چہرہ کچھ زرد زرد دکھ رہا تھا۔ بال پریشانی سے اُلجھے تھے۔ کمرے کی پُراسراریت شاید افتخار نے بھی بھانپ لی تھی۔

"کیا بات ہے بھابی۔ بھتیجا کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"نہیں۔ بس یونہی۔ شہر کی فضا کچھ خراب ہے نا آجکل"

"اوہ" افتخار کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ آج میں بہت تھکا ہوا ہوں بھتیجا۔ شاید ٹوٹا ہوا کہنا چاہیئے مجھے۔ گاؤں سے آج واپسی ہوئی تو محسوس ہوا کسی نے اپنا آدھا بازو ہی کاٹ دیا ہو"

"بات کیا ہے افتخار؟" میں چونک پڑا تھا۔

"میں نے گاؤں کا اپنا پشتینی مکان بیچ دیا ہے۔" افتخار رُندھے گلے سے بولے۔ "بیل گاڑی پر اٹھوا کر آج پورا سامان یہاں آگیا۔ کیوں تم نے سامان اُترنے کی آواز نہیں سُنی۔ اُرمیلا تو ایک دو بار باہر آئی بھی تھی۔ اور میں نے اُرمیلا کو پکارنا بھی چاہا تھا۔"

اُرمیلا کے ساتھ ساتھ سب چونک گئے تھے۔

اور افتخار کہہ رہے تھے . . . پشتینی مکان کا اپنا ایک الگ درد ہوتا ہے تینجا . . . باپ داداؤں کی یادیں جو جُڑی ہوتی ہیں اُن سے . . ." اچانک افتخار نے جیسے کچھ بھانپ لیا۔ مگر تم سب اتنے چُپ کیوں ہو . . . ؟"

"چُپ . . . نہیں تو . . ."

جین نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر ایک زوردار قہقہہ لگاتی ہوئی بولی . . .

"افتخار انکل۔ دراصل بات یہ ہے کہ ممّی کا کارتوس ہی خراب نکل گیا . . ."

۳

رنگ کوئی بھی ہو دوبارہ لوٹ ہی آتا ہے۔ محفل ایک بار پھر زعفران زار بن چکی ہے۔ انجانا سا وہ خوف ایک بار پھر سب کے اندر سو گیا ہے اور افتخار کے ساتھ سب کے سب زندہ دل قہقہوں میں شریک ہو گئے ہیں . . . مگر میں پتہ نہیں کیوں پوری طرح ان سے نہیں جُڑ سکا ہوں . . . اُرمیلا چائے بنانے چلی گئی ہے۔ اور جین اپنے افتخار انکل کو چھیڑ رہی ہے۔ سوچتا ہوں . . . یہ سب رسم کب تک نبھے گی . . . یہ جنگ ابھی تو رُک گئی مگر بعد میں کبھی بھی تو اُبھر سکتی ہے . . . اچانک ہم تبدیلیوں کا لباس کیسے اوڑھ لیتے ہیں . . ." اور تبدیلی کے باہر کیا ہے . . . تشدّد کی ایک معمولی سی طاقت بے اطمینانی کے علاوہ . . ."

۴

اپنے آپ سے ہونے والی اس اندرونی کیفیت کی جنگ ہیں۔

ہمیں ہمیشہ سے ملتی رہی ہے ہار!
جو کافی ہے اپنی آتما پھونکنے کے لئے
اب کوئی انکش نہیں رکھنا ہے ہمیں اپنی ذات پر
اور جنگوں سے باہر نکل کر دیکھنا ہے !!

گلبن ۱۹۸۰ء ◆◆

کتنا وِش

اُس کی آنکھ کھلی تو سُورج کی شعاعیں سیدھے اس کی آنکھوں پر پڑی رہی تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"وہ کہاں ہے۔ یہ کون سی جگہ ہے؟"

اُس نے آنکھیں ملیں۔ آس پاس سے بدبو ہی اُٹھ رہی تھی۔ ہوا ذرا تیز ہوئی اور بدبو کا زوردار جھونکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا تو اس نے دیکھا کہ جہاں وہ کھڑا ہے وہ ایک میدان ہے، جہاں چاروں طرف گھاس پُوس اُگے ہوئے ہیں۔ جنگلی بے حیا پَودوں کی لمبی قطار دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک طرف ٹیوب ویل چل رہا ہے۔ آڑی ترچھی پگڈنڈیاں کھیتوں میں اُتر گئی ہیں، جہاں دھان کے پَودے مسکرا رہے ہیں اور جس جگہ وہ کھڑا ہے وہاں ہری ہری گھاس اُگی ہے اور کچھ دُوری پر ایک قطار میں ہاتھ میں لوٹا لئے لوگ شوچ کے لئے بیٹھے ہیں جسے گاؤں کی زبان میں میدان کے لئے بیٹھے ہیں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اس نے جمائی لی۔ ناک کو بند کیا۔ تین چار نوجوان تھے ایک دو بوڑھے اور کچھ بچّے بھی جو ذرا ذرا سے فاصلے پر چکّو مُکّو بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ بدبو سے اس کی ناک پھٹی جا رہی تھی۔ مگر وہ کیسے آ گیا۔۔۔

اس جگہ یہ ... یہ تو کوئی گاؤں معلوم ہوتا ہے۔ تو دوڑتا دوڑتا راتوں رات وہ اس گاؤں میں نکل آیا تھا۔ مگر رات میں وہ کہاں تھا؟ کہاں؟ ... اور اچانک اس کے دماغ میں بندوقیں گرجنے لگیں۔ دھماکے ہونے لگے۔ چہرہ لال سُرخ ہو گیا۔ اُسے لگا اب وہ چیخ پڑے گا۔ دماغ کی نسیں اتنی کھینچ جائیں گی کہ ٹوٹ جائیں گی۔ نہیں اسے اپنا دھیان بٹانے کی ضرورت ہے۔

... ہاں دھیان بٹانے کی ـــــ

اس نے ایک بار پھر دیکھا۔ لوگ شور کر رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ کپڑے جھاڑتا ہوا وہ اُٹھا۔ جس جگہ وہ پڑا تھا وہاں بڑی بڑی نوکیلی گھانسیں اُگی ہوئی ہیں، جس نے تھوڑا بہت اسے لہولہان کر دیا تھا مگر گھانسیں اتنی بڑی بڑی تھیں کہ اس کا پورا جسم گھاسوں کے درمیان چھپ گیا تھا، مگر اب وہ سب کو دیکھ سکتا تھا۔ چلتے ہوئے ٹیوب ویل کو ... آڑی ترچھی پگڈنڈیوں کو ... کھیتوں کو ... اور شور کرتے ہوئے لوگوں کو ـــ

وہ مسکرا بھی رہے تھے اور آرام سے پاخانہ بھی پھر رہے تھے۔

چھی ... چھی ... اس نے پھر ناک بند کی ... گندے ... سارے کے سارے گندے ہو گئے ہیں ... مگر اس رات ...“

اس کے پیر اینٹھ گئے تھے۔ سارے جسم میں وہ تیز درد محسوس کر رہا تھا۔ اس نے غور کیا ... وہ زیادہ دیر تک ان شور کرتے لوگوں کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ اسے گھن آتی ہے ان لوگوں سے ... یہاں کے ماحول سے ... اسے نفرت ہو رہی تھی ... نفرت .... ذرا دیر کے لئے وہ ٹھہرا۔ مگر یہ لوگ کتنے خوش نظر آ رہے ہیں جیسے ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ غم کی پرچھائیاں بھی نہیں پڑی ہوں ... وہ زیادہ سے زیادہ ان کے بارے میں سوچنا چاہ رہا تھا مگر پھر بھی پچھلی رات کے واقعات سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کر پا رہا تھا۔ اس رات ... دماغ میں پھر ہتھوڑے بجے ... ایک بار پھر تیزی سے دھماکے ہونے لگے۔ بندوقیں چھوٹنے لگیں ... اس رات ...

رہ رہ کر اسے پچھلی رات کا لرزہ خیز منظر یاد آرہا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ اس منظر سے فرار حاصل کرتے میں ناکام تھا۔ اُسے بھوک لگی ہے ... اس نے سوچا ... کل دوپہر سے اس نے کچھ نہیں کھایا ... اس کے پیٹ میں کل سے روٹی کا ایک ٹکڑا تک نہیں گیا ہے ... اس نے جب ایسا سوچا تو اُسے نقاہت محسوس ہوئی جب کہ سچ تو یہ تھا کہ کل دوپہر کو اس نے خود بھی کھایا تھا فاطمہ کو بھی کِھلایا تھا۔ ہاں دروازہ بند کر رکھا تھا اس نے کمرے میں موت جیسی خاموشی پھیلی تھی۔ فاطمہ نے کہا ... "بھوک لگی ہے۔"

"چُپ حرامزادی" وہ غصّے میں بولا۔ "بھوک ... مُنہ سے ایک لفظ مت نکالنا۔"

اور دونوں کی طرح فاطمہ اس سے لڑنے نہیں بیٹھی بلکہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"بہت زور کی بھوک لگی ہے۔"

"ابے فاطمہ کی بچّی تھوڑی دیر تک بھوک کو داب نہیں سکتی۔"

باہر ہنگامے کی تیز آواز تھی۔ چیخ و پکار تھی۔ جیسے جنگل کے دس شیر مل کر گرج رہے ہوں۔ پُورا آسمان سر پر اُٹھا رہے ہوں۔

"شی۔"

فاطمہ کی آنکھوں میں بے بسی تھی ... بھوک ...

"خود بنا نہیں سکتی۔ ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں۔"

"ہاں ٹوٹ گئے ہیں۔ بڑا آیا کہنے والا۔"

فاطمہ اس بار بگڑی تھی۔ کافی دیر کے بعد اور اس خطرے بھرے ماحول میں کافی دیر کے بعد اس کے ہونٹوں پر تبسّم نمودار ہوا تھا۔

"یہ ہوئی نا بات۔ اب بناتا ہوں تیرے لئے کھانا۔"

اور پھر اس نے خالی خالی ڈبے ٹٹولنے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دال ملی ... تھوڑا چاول ... دو پیاز مل گئے ... تین آلو ... بچے کھچے کچھ مصالحے بھی ہاتھ لگ گئے۔ چیچے سے کھودنے پر تھوڑی دھنیا، ہلدی، نمک، گرم مصالحے بھی نکل آئے۔

وہ بڑ بڑا رہا تھا۔ "سالی کو جتی نہیں ہے۔ ضد کرتی ہے ... بھوک لگی ہے۔ جیسے یہاں اس کا باپ بیٹھا ہے کھلانے کے لئے ... باہر آگ لگی ہوئی ہے اور حرامزادی کہتی ہے کھانا بناؤ۔"

"چلاتے کیوں ہو؟"

"کیوں نہیں چلاؤں۔ تیرے ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں جو میں بناؤں۔

"دیکھو۔ ڈانٹو مت" فاطمہ نے بے بسی سے کہا۔

"کیوں نہیں ڈانٹوں۔ تو کوئی میری دادی امّاں ہے۔

پھر اس نے چاول دال سب ایک برتن میں ڈال دیا۔ تھوڑا سا تیل بھی مل گیا۔ اللہ اللہ خیر صلّیٰ۔ اس نے اسٹوو جلا دیا۔ مصالحہ بھونا، پھر آلو سمیت چاول دال سب دیگچی میں اُلٹ دیا۔ بند کمرے میں اسٹو آہستہ آہستہ چیخ رہا تھا اور باہر بلوائی۔

"ہمیں کچھ ہوگا تو نہیں نا ..." فاطمہ کی آنکھوں میں ڈر چھپا تھا۔

چُپ رہ ... بڑ بڑ کرتی ہے۔ کیا ہوگا تجھے؟ اس نے دلاسہ دیا۔ "یہ اپنا محلہ ہے"

"مگر میں مسل ... ما ..."

دیگچی کا ایندھن کھول رہا تھا۔ بھاپ سے ڈھکن بار بار ہٹ رہا تھا اور پہلی بار کالو نے غور سے فاطمہ کا چہرہ دیکھا۔ "یاں تو تو ... یہ ہندوؤں کا محلّہ ہے ... اور یہاں سب جانتے ہیں ... پورے دس سال ہوگئے جب میں تجھے اُٹھا کر لایا تھا۔ اِتّی سی تھی تو۔ پورے تین سال کی ... اور اب تیرہ سال کی ہوگئی۔ سارا محلّہ جانتا ہے کہ تو مسلمان لڑکی ہے مگر میں نے بھی تو تیری جات نہیں بدلی ..."

کالو کے چہرے پر پہلی بار ایندھن کا بھاپ اپنی نشانی چھوڑ گیا۔ اُس نے غور سے فاطمہ کا چہرہ دیکھا۔ پریشان چہرہ ...

"کالو ..."

یہ نام بھی تو فاطمہ کا ہی دیا ہوا تھا۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اُس نے خود کو سمجھایا۔ اب

محلے والے ایسے ظالم نہیں کہ فاطمہ کا کچھ بگاڑ سکیں۔ وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ جس چھوٹی سی بچی کو سڑک پر مارے مارے پھرتے دیکھ کر وہ اپنے گھر اٹھا لایا تھا وہ نہ ہندو تھی نہ مسلمان۔ اسے گھر کی تلاش تھی۔ پناہ کی تلاش تھی۔ وہ خود بھی اکیلا تھا اور صرف دس سال کا۔ اسے یہ لڑکی غموں کی ماری نظر آئی اور وہ اسے گھر لے آیا تھا۔

اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ اس تین سال کی چھوٹی سی بچی کا باپ بن گیا تھا۔

اس نے فاطمہ کو غور سے دیکھا۔ پھر کسی بزرگ کی طرح سمجھایا۔ تو گھبرانا بالکل مت۔ سمجھی۔ بالکل مت گھبرانا"

بدبو کافی ہے اور بھوک بھی لگی ہے۔ اس کے پیٹ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ جب بھی دھیان بٹاتا ننھی منی فاطمہ اس کی نظروں میں آکر ہلچل مچانے لگتی۔ کالو... بھینس ... اور پھر اس کے دماغ میں بندوقیں گرجنے لگیں۔ اس نے پھر خود کو سمجھایا۔ پیٹ میں آگ لگی ہے۔ اسے پیٹ کی دوزخ شانت کرنے کے لئے بھی کچھ سوچنا ہوگا۔ شور کرتے لوگوں سے نگاہ ہٹا کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ سورج کا گولہ آگ برسا رہا تھا۔ داہنی طرف کچی مٹی کی سڑک چلی گئی تھی، تو اس راستے پر وہ بھی ہولے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا جیب خالی جیب نے ایک بار پھر اس کا منہ چڑھا دیا۔ کالو کو کوئی غم نہیں ہوا۔ پیسے نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ اس بہانے اس کا دھیان تو بٹا رہے گا۔

شور کرتے لوگوں کو آپس میں بات کرتا چھوڑ کر وہ واپس کچی مٹی کی سڑک پر آگیا۔ دونوں طرف قطار میں آدم قد درخت سینہ تانے کھڑے تھے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ پیر چلنے سے جواب دے رہے تھے۔ مگر کالو آہستہ آہستہ اپنے پیروں کو گھسیٹنے لگا۔ کچھ لوگ آجا رہے تھے۔ بدن کھولے ہوئے۔ دھوتی، لنگی پہنے ہاتھوں میں داتون لئے۔ اس نے اندازہ لگایا۔ سات بج گئے ہوں گے۔ دھوپ کتنی تیز ہے مگر پھر اس نے محسوس کیا۔ وہ لاکھ چاہے گذری یادوں سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کر سکتا۔ جینے کے لئے ضروری ہے کہ اب وہ خود کو کوئی مضبوطی اوڑھے جب بھی اس کا ذہن خالی ہوگا پچھلی یادیں اس پر حاوی ہو جائیں گی۔ اور...

اس نے جاتے ہوئے اجنبی سے پوچھا ۔۔" یہ راستہ کہاں جاتا ہے بھائی ؟"

اجنبی نے اُسے غور سے دیکھا۔

"کہاں جانا ہے ؟"

"جانا کہیں نہیں ہے۔یہاں کوئی ہوٹل وغیرہ۔۔۔"

"آگے بھکنا پل ہے۔اس سے ٹھیک سٹے ۔۔۔" اجنبی نے اسے غور سے دیکھا۔"کہاں سے آئے ہو؟"

"بھوک لگی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔یہاں کے لوگ بے وجہ بات کرنا چاہتے ہیں۔کالو نے محسوس کیا گاؤں کے لوگوں کے پاس پتہ نہیں کہاں سے بات چیت کے لئے اتنا وقت مل جاتا ہے۔ ایک اس کی طرف کے لوگ ہیں جن کے پاس وقت ہی نہیں ہے اور یہاں تو ایک سوال پوچھا نہیں کہ سوالوں کی طومار شروع ہوگئی۔وہ ذرا آگے بڑھا۔اچانک وہ چونک گیا۔پھٹے کپڑوں میں ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آرہی تھی ۔۔۔اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جو اسے دوڑا رہا تھا۔

"نیما۔"

"نہیں چنو بھاگ جا۔"

"پہلے اِملی دے دے ۔۔۔دے دے املی ۔۔۔"

"بھاگ جا نہیں دیتی میں ۔۔۔"

لڑکی دونوں ہاتھوں میں املی بھرے ہوئے تھی۔دوڑتے ہوئے اچانک وہ اس سے ٹکرائی۔مٹھیاں کھل گئیں اور ساری املی زمین پر۔

"نہیں چنو ۔۔۔ نہیں ۔۔۔" لڑکی چلائی۔

اور وہ لڑکا تیزی سے گدھ کی طرح املیوں پر جھپٹ پڑا تھا۔"بڑی آئی ۔۔۔میں نے پتھر مار کر توڑے اور اس نے اچک لیا۔

"نیما رو رہی تھی۔"

"لے تو بھی کھا۔" چنو نے املی بڑھائی۔نیما نے آنسو پونچھے اور اب دونوں ساتھ

جا رہے تھے۔ ہنستے کھیلتے ... کالو نے غور سے دیکھا۔ یہ نیما تو ... اب وہ خود کو اس واقعے کی یاد سے الگ نہ کر سکا۔ سب کچھ آنکھوں میں صاف صاف تھا۔ پورا منظر ایک ہی بار آنکھوں میں اُتر پڑنے کو تیار۔

کیا تھا دُنیا میں اس کا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ سوائے اس مٹی کے گھر کے۔ بابو تو کب کا ساتھ چھوڑ گئے۔ تب وہ پانچ سال کا تھا۔ اس ننھی سی عمر میں ہی وہ پوری دُنیا کو جان چکا تھا۔ محنت کش تھا۔ بوجھ ڈھوتا۔ کچھ دنوں تک قلی کا کام بھی کیا۔ وقت ملتا تو کوئلے کی دکان پر بھی چلا جاتا۔ ہر جگہ کچھ نہ کچھ پیسے اسے مل جاتے۔ مگر اس کے نصیب میں قبائیلیوں سی زندگی لکھی تھی۔ پھر ایک کپڑے کی دُکان پر اسے مستقل نوکری مل گئی۔ لیگار تین سو روپے۔ یہ روپے بہت نہیں تھے تو کم بھی نہیں تھے اور اس کی ذات پر خرچ ہی کتنا تھا۔ دوپہر میں دو گھنٹے کی چھٹی۔ اتوار کو پورا دن دُکان بند رہتی۔ کبھی کبھی وہ سوچتا باپ نے پڑھایا لکھایا ہوتا تو غم بھی ہوتا کہ وہ بھی کیسا بدقسمت ہے کہ زمانے کے دھکے کھاتا پھر رہا ہے۔ اتنا ٹھیک ہے۔ جو مل رہا ہے بھگوان کی دیا ہے۔ ہاں اپنی عمر کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اسکول جاتے دیکھ کر کبھی کبھی اسے عجیب ضرور لگتا۔ کبھی کبھی پڑھنے کی خواہش زور پکڑتی۔ مگر وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔ بہت پیچھے چھوٹا ہوا ایک منظر یاد آتا۔ اس کا باپ چت لیٹا ہے پھر پاؤں کو موڑ کر اسے گھگھوا گھو کھلا رہا ہے۔ "آ بیٹا! پہاڑ پر چڑھ" وہ دوڑ کر باپ کے پیروں میں جھول جاتا۔ ایک بیٹھا کون کھائے۔ ایک پیٹھا کون کھائے۔ ایک پیٹھا راجہ کھائے ایک پیٹھا رانی۔ ایک پیٹھا میرا اسکول میں پڑھنے والا رجیہ بیٹا کھائے۔ ڈھلکیاں کھاتا ہوا خوش ہو جاتا۔ باپ کی آنکھوں میں مسکراہٹوں کے کتنے ہی کنول کھل جاتے ہیں۔ مگر پڑھانے کی آرزو وہ دل میں ہی لئے اس دُنیا سے روانہ ہو گیا۔

کالو کو سب یاد تھا۔ یہ بھی کہ اس دن اتوار کی چھٹی تھی۔ چھٹی کے روز وہ زیادہ تر اسٹیشن چلا جاتا جہاں اس کا دوست چھوٹکو چینا بادام بیچا کرتا تھا۔ باقی وقت میں مسافر لڑکیوں کو للچائی نظروں سے دیکھتا۔ پھر چھوٹکو بتایا کرتا کہ "ٹیشن پر چینا بادام بیچنے کا الگ ہی مزہ ہے۔ زور سے آواز لگاؤ بھی ... نیا ... با ... دام ... اور مہرارو لوگن کو

دیکھتے رہو۔ کھوب مجا ہے ۔۔۔" اتوار کے روز چھوٹکو ایک سے ایک کہانیاں سنایا کرتا۔ اسٹیشن پر کیا ہوا۔ کیسے ایک لڑکی نے چلتی ٹرین سے کود کر جان دے دی۔ کسی کے پیٹ میں بچہ تھا، رات کو پٹری پر سوگئی۔ جیب کترا پکڑا گیا۔ ایک نوجوان لڑکا لڑکی ویٹنگ روم میں پکڑے گئے۔ وہ شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔

تو تو کہانیوں کے بیچ رہتا ہے رے"

" ہاں مجا ہے۔ میں تو کہتا ہوں تو بھی آجا" چھوٹکو اسے چڑھاتا مگر وہ وہیں سیٹھ کے یہاں خوش تھا۔ جب مانگو چھٹی مل جاتی ہے۔

اس دن وہ کافی دیر سے اسٹیشن کے اِرد گرد چکر لگا رہا تھا۔ ابھی تک چھوٹکو نہیں آیا تھا۔ دوپہر کے بارہ بج رہے ہوں گے۔ اگست کا مہینہ تھا۔ سورج آگ اگل رہا تھا۔ گرمی سے بُرا حال تھا۔ وہ ایک چائے کی دُکان پر آکر بیٹھ گیا۔ تبھی اس نے دیکھا ایک چھوٹی سی بچّی زار و قطار روتی پھر رہی ہے۔ پھر وہ اس کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ ہاتھ بھیک مانگنے کے انداز میں کھلے ہوئے۔ عمر اتنی کم کہ اسے اپنے ملک پر غصّہ آیا۔" سالے کیا مولوگ ہے یہ اتّی سی بچّی بھیک مانگتی ہے" عمر تین چار سال کی رہی ہوگی۔ بچّی کی آنکھیں روتے روتے پھول گئی تھیں۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

" بھوک لگی ہے؟ اس نے پوچھا۔

" آں ۔۔۔ ں ۔۔۔"

" کچھ کھائے گی؟"

" آں ۔۔۔ ں ۔۔۔ ں ۔۔۔"

" چل ۔۔۔ میرے ساتھ چل ۔۔۔"

اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا ۔۔۔ پیر میں چپّل بھی نہیں تھی۔ لڑکی کے پیر تپتی زمین پر پڑتے تو بلبلا اُٹھتی ۔۔۔

" پیر جل رہا ہے؟"

" آں ۔۔۔ ں ۔۔۔ ں "

"ٹھیک ہے۔"

لڑکی اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے چل رہی تھی۔ شاید کچھ دکھانا چاہتی تھی۔ تھوڑی دُور پر، ہی اسٹیشن سے سٹے غریب مزدوروں کی بستی تھی۔ وہاں ایک جھونپڑی کی طرف لڑکی اشارہ کر رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"وہ کیا ہے۔"

"آں... ں...ں۔"

بوڑھا آدمی اُسے دیکھ کر جھونپڑی سے نکل کر آیا ... اور غصّے سے بولا "بچا تمہ کہاں چلی گئی تھی رے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔

"یہ جھونپڑی ــ؟" بوڑھے کی طرف کالو نے غور سے دیکھا۔

"تو کون ہے رے۔" بوڑھے کے چہرے پر غصّے کے آثار تھے۔ وہ چہرے سے کوئی بھکاری لگ رہا تھا۔ اگر وہ اس لڑکی کا کوئی تھا بھی تو یہ طے تھا کہ وہ اس عمر میں اسے بھیک مانگنے کی عادت ڈلوانا چاہتا ہے۔

"پہلے یہ بتاؤ یہ لڑکی کون ہے۔" کالو غصّے میں آستین چڑھاتا ہوا بولا "سالے گھر پر جا۔ ٹیشن کے سارے دادا میرے جان پہچان کے ہیں۔"

اب بوڑھا خوفزدہ تھا۔ پھر اس نے خوفزدہ لہجے میں بتایا۔ یہ جھونپڑی اس کی ماں کی تھی۔ اس کی ماں بھکارن تھی۔ کل مر گئی ــ اب اکیلی ہے۔ یہ بھی کہ اس نے ہی بھیک مانگنے کے لئے ٹیشن بھیجا تھا۔

"اب میرے ساتھ جا رہی ہے ... کالو نے اچانک فیصلہ کر لیا تھا۔

بوڑھے کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

"تو چاہے تو اس کی جھونپڑی پر قبضہ کر لے۔" اس نے بوڑھے کو تجویز پیش کی، جس کو وہ فوراً ہی مان گیا۔ اب فاطمہ اس کے ساتھ تھی۔ اس کا رونا بند ہو گیا تھا۔ وہ خوش تھی۔ اُسے بھی بولنے بتیانے کے لئے ایک ساتھی مل گئی تھی۔ ایک دلچسپ کھلونا۔ پھر فاطمہ بڑی ہونے لگی تو اسے لڑنے کے لئے ایک دوست بھی مل گیا۔ جی بھر اس سے لڑائی

کرتا : سالی پوری چینی پھاک گئی۔ اب کون لائے گا اسے تیرا باپ ... فاطمہ کی بچی۔ اس دن میں تجھے نہیں لاتا تو وہ بوڑھا تجھ سے سڑکوں پر بھیک منگواتا اور مہارانی آئی ہیں حکم چلانے !"

"کالو بھینس ... کالو بھینس ..." مسکراتے ہوئے فاطمہ کہتی۔

اس کالو کے نام سے اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ۔ وہ اسے مارنے کو دوڑتا۔ فاطمہ بڑی ہو رہی تھی۔ محلّے والے اُسے پہچاننے لگے تھے۔ سودا لانے وہی جاتی تھی۔ آس پاس والے بھی کالو سے واقف تھے۔ محلّے کے کچھ مسلمان لوگوں نے اس بات کا بُرا ضرور مانا تھا کہ ایک مسلمان لڑکی ہندو کے گھر پل رہی ہے۔ وہ بھی پالنے والا ایک لڑکا ہے اور لڑکی کا کیا ہے۔ عمر کا فرق تو اتنا کم ہے کہ کچھ دنوں میں رشتے کو گہن بھی لگ سکتا ہے۔

اس دن سلمان بھائی کالو کے گھر آئے تھے۔ سلمان بھائی پڑھنے پڑھانے کے معاملے میں کافی مشہور تھے۔ کالو ان کی قدر کرتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ کالو نے فاطمہ کو چائے بنانے کے لئے کہا۔ فاطمہ جب چائے لے کر آئی تو کالو کو بڑے غور سے سلمان بھائی نے دیکھا۔

"یہ اتنی بڑی ہوگئی !" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

کالو نے محسوس کیا۔ سلمان بھائی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ کچھ ایسی بات جو اسے بُری لگ سکتی ہے۔ سلمان بھائی کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کرتے رہے پھر اپنے منشا پر آگئے۔

"تو جانتا ہے کالو ... تیرے بارے میں محلّے میں کیسی کیسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہم مانتے ہیں تو نے فاطمہ کو اس وقت لیا تھا جب وہ بہت چھوٹی تھی اور تو بھی صرف دس سال کا تھا۔ اب بات بدل گئی ہے۔ تو بھی سیانا ہو گیا ہے اور فاطمہ بھی ..."

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں" کالو بھڑک اُٹھا تھا۔

"ایک انگریزی ناول میں پڑھا تھا، ایک شادی شدہ جس کی بیوی مر چکی تھی، ایک چھوٹی سی بچی کو گھر لاتا ہے اور پالنے لگتا ہے۔ لڑکی جب بڑی ہو جاتی ہے تو ایک دن اس کے ساتھ ..."

"سالے" کالو اوقات پر اتر آیا تھا۔" ہمدردی جتانے اور اُپدیش دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے سالے۔ مسلمان کی لڑکی۔ پھٹا جب بھیک مانگ رہی تھی۔ سالے کہاں تھا تیرا دھرم اس وقت ... کیوں نہیں لایا اپنے پاس اُسے۔ آج بڑا دھرم کی بات کر رہا ہے۔"

سلمان بھائی غصّے سے کانپتے ہوئے اُٹھ گئے تھے۔" یہ ٹھیک نہیں ہوگا کالو مسلمان کی لڑکی کو ... اپنے گھر میں ..."

"سالے بھاگتے ہو کہ نہیں ..."

کمرے میں واپس لوٹتے ہوئے فاطمہ نے پوچھا۔" کیا کہہ رہا تھا؟"

"سالا کہہ رہا تھا تیرے بارے میں کہ تجھے مسلمان کے گھر پہنچا دوں۔"

"سالا ... حرامجادہ ..." فاطمہ نے گالی دی۔

"ابے فاطمہ کی بچی۔ بہت جبان چلتی ہے تیری۔"

"حرامجادہ۔ بڑا آیا مجھے مانگنے والا۔"

"دیکھ لے سچا تمہ۔"

اس دن پہلی بار اس نے گمبھیرتا سے غور کیا۔ آخر فاطمہ سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ کیسا رشتہ ہے یہ۔ اس نے پالا ہے۔ اس کے سامنے بڑی ہوئی ہے فاطمہ۔ وہ فاطمہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ وہ فاطمہ کو الگ نہیں ہونے دے گا۔ اور ان محلّے والوں کا کیا ہے۔ گندگی پھیلانے سے زیادہ جانتے ہی کیا ہیں۔ پھر وہ سب کچھ بھول گیا۔ روزانہ کے معمول سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ اِدھر اُدھر کی باتوں پر غور کر سکتا۔

اور اچانک شہر کی فضا خراب ہوگئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے چلتے دوڑتے ہوئے لوگ بلوائیوں میں شامل ہوگئے تھے۔ چہروں میں فرق کے جراثیم دَوڑ گئے تھے۔ اور یہ آگ پھیلتے پھیلتے پورے شہر کو کھا گئی تھی۔ اور اس دن۔

"بھوک لگی ہے۔" فاطمہ رو رہی تھی۔ اور اس نے کھانا بنانا شروع ہی کیا تھا کہ اچانک خطرے کا سائرن دروازے پر کتنی ہی تھاپ اور بلی بلی

آواز کے ساتھ گونج اُٹھا۔

"کالو۔ دروازہ کھول دے"

"کھول دے دروازہ کالو۔ ہم کو وہ صرف مسلمان کی اولاد چاہیئے اور کچھ نہیں چاہیئے کالو..."

"تو کھولتا ہے یا..."

"نہیں..."

کالو کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ کالو دروازے سے لگ کر کھڑا تھا۔ دروازہ ڈول رہا تھا۔ زور زور سے لوگ دروازہ پیٹ رہے تھے اور پھر پُرانا دروازہ بھڑ بھڑا کر جھول گیا۔

ق... صا... ب... ہاں اس کے سامنے قصاب کھڑے تھے۔ سالوں نے فاطمہ کی ثابت ہڈیاں تک نہیں چھوڑی تھیں۔ نہ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو۔ سُننے میں آیا محلّے میں ایک بھی مسلمان کا گھر نہیں ثابت بچا۔ سب مارے گئے۔ سلمان بھائی بھی۔ مانک پُورہ محلّہ میں ہندوؤں پر ہونے والے ظلم کا بدلہ لیا گیا ہے یہ۔ لُٹا پِٹا بدحال سادہ رات کے سنّاٹے میں کھڑا ہے۔ قصاب واپس لَوٹ گئے۔

اور ___ وہ سرپٹ بھاگ رہا ہے۔ وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہ رہا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ قصاب آئے تے۔ یہ بھی نہیں کہ فاطمہ کون تھی۔ یہ بھی نہیں کہ قصاب نے فاطمہ کی بوٹیاں کر ڈالیں۔ کچھ بھی نہیں۔ بس وہ بھاگ رہا ہے۔ رات کے ایک بج گئے ہیں۔ باہر گشت کرتی پولیس نے اسے کئی جگہ روکنے کی کوشش کی۔ شہر میں کرفیو لگا ہے اور اس کرفیو میں... اس کی آنکھیں ہر جگہ جل تھل ہوئیں۔ صاحب جانے دو... میری ماں بیمار ہے صاحب..."

"کہاں جائے گا..."

"ہسپتال صاحب"

"جانے دو"

راستے میں اسے تین جگہ پولس والے ملے۔ اور اب وہ ... دوڑتا ہوا سڑک پر تھا۔ پھر گاڑی پر ... چوتھے جنکشن پر ہی وہ اتر گیا۔ شہر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے اعضاء ڈھیلے پڑے تھے۔ اندر آگ لگی تھی۔ سونے سے شاید اسے راحت نصیب ہو... پھر اسے کچھ نہیں معلوم... کیا ہوا... وہ کتنا چلا... کہاں سویا... اور اب... سورج کی شعاعوں نے اسے دن کے نکلنے کا احساس بھی کرا دیا اور جب اسے ہوش آیا بدبو کے مارے اس کی ناک پھٹی جا رہی تھی۔ اس نے سوچا وہ کہاں ہے۔ پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ رات کا دل دہلا دینے والا واقعہ۔ اس کے دماغ میں برابر گولیاں چل رہی تھیں۔ دھماکے ہو رہے تھے۔ پٹاخے پھوٹ رہے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اجنبی نے ہوٹل کا راستہ تو بتا دیا مگر وہ کھائے گا کیا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ قدموں میں اضمحلال آ گیا۔ لاوے اب بھی پھوٹ رہے تھے۔ بیس برس کا گبرو نوجوان ہے وہ ... مگر مقابلہ نہیں کر پایا... فاطمہ کا... اس نے اوپر نیچے کے دانتوں کو ایک دوسرے میں ملا کر کڑکڑایا... وہ فاطمہ کو نہیں جانتا... کون فاطمہ... کون قصاب... وہ کسی کو نہیں جانتا... پیچھے گذری داستان اسے بالکل یاد نہیں۔

اور یہ محض اتفاق تھا کہ اب وہ قصاب کی دکان پر کھڑا تھا۔ ہاں قصاب کی دکان پر... جہاں ایک لگاتار سے جلاد جیسے چہروں والے قصاب بکروں کا گوشت کے بیٹھے تھے اور ہاتھوں میں ہسلی چمک رہی تھی۔

پھر اسے کچھ یاد نہیں کب کیسے وہ اس موٹے ناٹے قد کے، ٹخنے تک لنگی پہنے ہوئے سلامو قصاب کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنا منشا ظاہر کیا اور سلامو استاد نے سر ہلا دیا۔

"ہاں مجھے آدمی کی ضرورت ہے۔ نام کیا ہے تیرا۔"

"نام۔ اس کی آنکھیں خمار میں ڈوبی تھیں... نام... ذہن میں دھماکے ہوئے وہ بکرے کی بوٹی کھڑ کھ رہا ہے اور فاطمہ کی بوٹیاں...

"نام ـــ عبدالسلام"
"ٹھیک ہے" قصاب اب مطمئن تھا" ذبح کرنا جانتا ہے؟"
"نہیں"
"کیسا مسلمان ہے تو۔ آج تک بکرا ذبح نہیں کیا"
"کبھی نہیں"
"کوئی بات نہیں۔ کاٹتے وقت ہاتھ تو درد نہیں کریں گے تیرے..."
"بالکل نہیں..."
"پھر ٹھیک ہے..."
سلامو قصاب اسے گوشت کے ٹکڑے کرنا سکھا رہا تھا۔
"یہ چھرا پکڑ۔ اور یہ پیر کی بوٹی کاٹ... چھوٹے... چھوٹے... چھوٹے... چھوٹے..."

اس نے چھرا اٹھایا ہے۔ گوشت کو لکڑی کے ٹھیہا پر رکھ کر وہ ران اور پیر کی بوٹیوں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ اور اب وہ جھٹکے سے کاٹ رہا ہے۔ کٹّی... کٹّی... کٹّی... کٹّی... اس کی آنکھوں میں پاگل پن سوار ہے... کٹ کٹ... اس کے اندر کوئی جلّاد سوار ہے۔

"نہیں اتنا چھوٹا نہیں..." سلامو اس کا ہاتھ روک رہا ہے۔

قصاب باڑے میں خون کی بو دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر اب یہ بو اسے محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ وہ ایک طرف جھولا بچھائے گوشت کے ٹکڑوں کو لئے بیٹھا ہے اور دیر سے کٹّی کٹّی کئے جا رہا ہے۔

سہیل، زبان وادب، بابو
ہندی دینک ہندوستان ۱۹۸۹ء ◆◆

سُورَ بَاڑی

لٹے ہوئے سامان
حقارت سے دیکھتی ہوئی آنکھیں
ہم نے اب جینے کا عہد کر لیا ہے
ان بیڑیوں کو کاٹ کر
بیڑیاں جو نامرد بناتی رہی ہیں
کاٹ ڈالتی ہیں تنے ہوئے اُن بازوؤں کو
جن میں روانی سے دوڑتے ہوئے خون
ہر پل احساس دلاتے ہیں آزادی کا۔
اور سو جاتی ہے کٹے ہوئے بازوؤں کے
سوکھے ہوئے گوشت کے لوتھڑوں میں
آزادی ....
ناپاک منصوبوں کا آدمی
کٹے ہوئے بازو کے سوکھے ہوئے گوشت کے لوتھڑوں سے
جوجھنے والے ہر آدمی کو
آسانی سے کہہ دیتا ہے غدار

ناپاک منصوبوں کے آدمی کا قتل اتنا ہی ضروری ہے۔
جتنا سُوکھے ہوئے گوشت کے لوتھڑوں میں پھر سے آزادی بھرنے کا احساس
بیڑیاں کاٹتے ہوئے مرد بننا ہے ہمیں ...
اور جو بچ جانا ہے بچی ہوئی آخری سانس تک
ہمارے خلاف چلتی ہوئی جھوٹی اچھوت کارروائی کے لئے ...
اور لڑتے رہنے کا بھرم قایم رکھنا ہے
فتح ہر حالت میں ہماری ہے "

۲

باڑی سے نکل کر سور کبھی کبھی اِدھر بھی آجاتے ہیں، جہاں بڑے بڑے مکانات ہیں، دفاتر ہیں، گورنمنٹ کوارٹر ہیں... آوارہ گھومتے رہتے ہیں سور... بے سُری آواز نکالتے ہوئے ... کیچڑ میں منہ دیئے پتہ نہیں کیا ٹٹولتے رہتے ہیں ... سور باڑی کہیں دُور نہیں ہے ... جس جگہ میری آفس ہے اور بھی کئی دفاتر ہیں جیسے کچہری، ٹریزری آفس، ڈی۔ ایس۔ ای سپرنٹنڈنٹ ایجوکیشن، مجسٹریٹ ... ان سے ذرا ہٹ کر میدانوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے اور میدانوں کے دونوں جانب خالی جگہوں کی اسی باڑی کو ڈوموں کی سور باڑی کا نام دے دیا گیا ہے۔ آفس کھلنے کا وقت دس بجے ہے۔ دس بجے تک یہ پوری باڑی گلزار رہتی ہے۔ گندے کپڑوں میں سینہ کھول کر دُودھ پلاتی ہوئی ڈومنیں، لکڑی کی کانتی سے سوپ ٹوکریاں بنتی ہوئی ... بیڑی سلگاتا ہوا ڈوم، اپنی گھروالی اور بچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا... قمیص پھٹے ... ننگ دھڑنگ ... میونسپلٹی کل کے پاس بیلچا، کنستر لئے شور مچاتے بچے ... جھونپڑیوں کے باہر اور اندر بچھے پلنگ پر لیٹے ہوئے بوڑھے بوڑھیاں، نالیوں کے درمیان پڑی ہوئی لاوارث خالی چارپائیاں، اِدھر اُدھر رکھے ہوئے مٹی، تامچینی کے چٹ اُکھڑے ہوئے برتن ... اُپلے سنی ہوئی باڑی سے شور مچاتے ہوئے ... کوئی کوئی بچہ بڑے آرام سے سور کی پیٹھ پر گھومتا ہوا نظر آتا۔ آدھ کھلی ہوئی گھٹ ساڑیوں میں اِدھر سے اُدھر

پھاندتی ہوئی ڈوم عورتیں بھی نظر آئیں جن کے بارے میں ونود بتایا کرتا تھا۔ ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنیوں میں جسم کا کاروبار بھی کرتی ہیں یہ۔ میرے حیرت سے دیکھنے پر کہا تھا ونود نے "سب چلتا ہے یار، آخر کو لڑکیاں ہی ٹھہری ... بھرے بھرے جسم والی۔ ڈوموں کی اس سور باڑی کی اپنی الگ کہانی ہے۔ اڑتی اڑتی خبروں سے اتنا ضرور اندازہ ہوا تھا کہ یہ ساری پراپرٹی گورنمنٹ کی ہے جس پر ناجائز ڈھنگ سے یہ کب سے آکر بس گئے۔ اس کی معلومات نہیں ہے۔ سرکار آئے دن یہاں سے جنگی جھونپڑیاں ہٹانے کی بات کرتی رہتی ہے۔ مگر شاید ایسا موقع نہیں آیا۔ اور آیا بھی تو سور باڑی چھوڑ کر نہیں جاسکے۔ اب تو سڑک کے دونوں طرف کتنی ہی جنگی جھونپڑیاں آباد تھیں اور بیچ کی سڑک جنسے سے گاڑیاں، رکشے، ٹرم ٹم وغیرہ گزرا کرتے ان کے لئے آنگن کی طرح تھے۔ کتنی ہی عورتیں کنارے کنارے بیٹھی ہوئیں، دودھ پلاتی ہوئی ملتیں۔ ادھر پھر یہ ہنگامہ شروع تھا۔ سور باڑی ٹوٹ جائے گی ... اس پوری طرح بسی ہوئی باڑی کو دیکھنے کے بعد احساس ہوتا تھا۔ گورنمنٹ کو شروع میں ہی چاہیئے تھا، اس طرف کوئی قدم اٹھائے۔ مگر بن جائے تو توڑنے اور چھوڑ کر جانے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ گھر کے تحفظ کی ذمہ داری بھی تو ہم پر ہی عاید ہوتی ہے۔

"تو ٹھہرا شاعر آدمی" میری اس بات پر ونود بگڑ کے بولا تھا "دیکھتا نہیں، آتے جاتے کیسی گندگیاں اُڑاتے رہتے ہیں سالے، جینا حرام کر دیا ہے۔ آتے جاتے ناک بند کر کے گزرنا پڑتا ہے۔"

"اور اسی لئے تم سور باڑی توڑ دیئے جانے کے حق میں ہو اتنی سی بات پر" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ونود خاموش ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ سور باڑی توڑے جانے کا کوئی دوسرا جواز اس کے پاس نہیں تھا۔ ذرا ٹھہر کر ونود پھر بولا۔

"خیر چھوڑو بھی، تم نے آج کا اخبار پڑھا؟"

"نہیں، کوئی خاص بات؟"

ساؤتھ افریقہ میں سیاہ فام حبشیوں پر گورنمنٹ کا ظلم پھر شروع ہو گیا ہے۔ کل ٹی۔ وی پر پونے نو بجے کی نیوز تم نے دیکھی یا نہیں؟" اس کے لہجے میں افسردگی آگئی تھی۔

"نہیں"

"پتہ نہیں یہ سب کب سے چل رہا ہے۔ تمھیں یاد ہوگا کہ گاندھی جی نے بھی اس سطح پر ایک ایجی ٹیشن چلایا تھا۔"

ونود کہہ رہا تھا "انھیں جینے کی آزادی ملنی چاہیئے تھی۔ آج جب کہ دُنیا مرّیخ پر جارہی ہے۔ ہم فضائیہ عہد میں جی رہے ہیں۔ لبریشن کے نام اس طرح کے واقعات چوٹ پہنچاتے ہیں۔ آدمی آدمی سب برابر ہیں۔ پتہ نہیں کیسے آگئے ہیں، فرق کے یہ تانجھ کیڑے ہمارے اندر۔"

دوسرے دن آفس کے لئے تیّار ہوتے ہوئے تنویر کو میں نے ونود کی بات بتائی تو وہ زور زور سے ہنس پڑی۔ "تو ونود نے ایک طرف یہ کہا اور دوسری طرف ۔۔۔"

"مجھے لگتا ہے کہ دوسروں کی طرح ونود بھی بہت معصوم ہے جو صرف اپنی آسانی کے لئے ایک اندازہ بُن لیتے ہیں۔"

"ایک اندازہ تو ہر آدمی اپنی آسانی کے لئے بُن لیتا ہے مگر مجھے تمھاری بات سے اختلاف ہے۔ دو الگ الگ مسائل پر تمھاری ایک نظر مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔ کہاں ساؤتھ افریقہ میں اپارتھیڈ ڈسمنٹلنگ اور نسلی منافرت کا مسئلہ اور کہاں ۔۔۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔ میرا کمنٹ تو اچھوت جیسے بیمار احساس پر ہے۔ یہ احساس جہاں بھی ہے جس سے بھی جُڑا ہے۔ مجھے ہر ایسے آدمی سے شکایت ہے۔ کیا تمھیں نہیں لگتا۔ بڑی بڑی باتیں کرنے کے باوجود ذہن کی ایک خاص سطح پر کسی نہ کسی طرح سے یہ احساس تم سے جُڑا ہے۔ سوال صرف اس کا ہے کہ اس احساس سے کیسے الگ ہو سکتے ہیں آپ کسی بھی پیشے کے نام پر اختلاف اور فاصلے سے الگ، ایک دم سے کیسے مل سکتے ہیں ہم؟"

شاید ترقی یہ موقع نہیں دے گی۔ وہ صرف سوال کھڑا کرے گی اور تمھارے جیسے لوگوں کو بوجھنے کے لئے اور دوسری طرف کسے لوگوں کو سوال بننے کے لئے چھوڑ دے گی۔ ترقّی ہوتی رہے گی۔ مار دگولی ان باتوں کو ۔۔۔ یہ باتیں ہماری نجی زندگی سے کہیں بھی نہیں جڑی ہیں۔ بیکار کے ہیں یہ احساسات۔ اس طرح کی سوچ، بے سر پیر کے سوالات۔" تنویر تے اتنا کہہ کر

چُپ کر دیا تھا مجھے۔ مگر لگا تھا جیسے ہم اس بیمار احساس سے کہیں نہ کہیں سے ضرور جُڑے ہیں اور تنویر نے صرف ہار مان لی ہے۔

اور اسی دن آفس جاتے ہوئے دیکھا کہ باڑی میں بھیڑ اکٹھا ہے۔ کچھ شور ہنگامے بھی ہیں۔ ساڑھے دس بج گئے تھے۔ آج آفس جانے میں مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ڈی ایم صاحب کی گاڑی سے ایک ڈوم کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈوم کو اسپتال لے جایا گیا ہے۔ مگر ڈی ایم صاحب کافی غصّہ میں تھے۔ کچھ لوگ آپس میں بات چیت کر رہے تھے جس سے اندازہ ہوا کہ غلطی ڈوموں کی ہی تھی۔ آنکھیں موندے اِدھر اُدھر گھومتے رہیں گے تو ایسا ہی ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ دھکّا لگا بھی تو ڈی۔ ایم صاحب کی گاڑی سے۔

اُس دن آفس میں ہر جگہ اسی بات کا چرچا تھا۔ ونود لہک لہک کر کہہ رہا تھا "اب موقع مل گیا ہے کہ یہ پُوری سوباڑی توڑ دی جائے گی۔ ڈی۔ ایم صاحب کو بھی کہنے کا اچھا موقع مل گیا ہے۔ آنگن سمجھ لیا ہے سالوں نے۔"

کانوں میں اُنگلیاں ڈالے سب کچھ سُننا پڑ رہا تھا۔ ونود نے ہی کبھی کہا تھا کہ اس جات کے لوگوں میں احساس نہیں ہوتا، پیشہ کرتی ہیں ان کی عورتیں۔ کارل مارکس اور اینجل کے نظریے کے آنے کے بعد چھوٹے موٹے اتنے انقلابات جنم لیتے رہے ہیں کہ اب اس بات پر دل نہیں مانتا کہ پیشے کے نام پر کوئی ذات ایسی بھی ہو سکتی ہے جو احساس نہ رکھے، ہاں سوباڑی میں دوپہر کے وقت ایک عجیب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ ہاؤں ہاؤں کرتے ہوئے پچاس ڈوم ڈومنیوں کی قطاریں، بچّے، جوان، بوڑھے، عورتیں ہاتھ میں بیلچا لئے، کینسٹر اور کوڑا اٹھانے والی گاڑیوں کے ساتھ ڈی۔ ایم کے خلاف مظاہرہ کر رہی تھیں۔

شام کو گھر لوٹنے پر میں نے تنو کو بتایا کہ "آج ڈوموں نے کیا کارروائی کی؟"

تنو آج کچھ غصّے میں تھی۔ جلے ہوئے انداز میں بولی "تو تمھیں پھر ایک کہانی مل گئی۔ ایسی ہی کہانی جیسی تم چاہتے ہو۔ درد پالنے کا صرف شوق ہے تمھیں۔ کچھ کر تو سکتے نہیں۔"

یہ دُہرا رُخ تھا تنو کا۔ پھر بھی بولا۔ تنو غلط کو غلط سمجھنے کا احساس کم ہے کیا؟ اور اس احساس کا مظاہرہ کیا اپنی اوقات، اپنی پہچان نہیں ہے؟"

"اب تم ان پر ایک نظم لکھ مارو گے، یہی نا۔ اور تسلی ہو جائے گی تمھاری۔ تمھاری لڑائی بس ان کھوکھلے لفظوں تک ہے، اس سے آگے نہیں۔ ورنہ آگے بڑھ کر تم بھی ایک مورچہ سنبھالتے ایک لڑائی لڑتے۔۔۔ نظموں سے الگ ۔۔۔ اپنی طرف سے، جو تم سے نہیں ہو سکتا۔ میں جانتی ہوں کہ تم سے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

کچھ دیر کے لئے احساس ہوا تھا کہ 'سغلط کو غلط کہہ کر پہچان کرا دینے کا احساس بھی بھرم ہے شاید۔ لفظوں سے جوجھتے ہوئے جب جیت ہار کے فیصلے کے بغیر کہانی ختم ہو جاتی ہے تو دھکا پہنچتا ہے۔ شاید اپنی طرف سے ہونے والی کاروائی اس طرح کے معاملوں میں لفظوں سے کبھی آگے نہیں بڑھی۔ تو یہ کھوکھلا اور نپنسک (نامرد) ہوا نا؟"

اور تنو کہہ رہی تھی "اپنی فرمائشوں کو نظر انداز کر کے جب تم سوچتے ہو تو بُرا لگتا ہے۔ اس لئے کہ تمھاری بھی ایک باڑی ہے اور اس میں بچے ہیں، بیوی ہے۔ اکثر محسوس کرتی ہوں کہ دوسروں کے جذبوں اور احساس سے لفظوں کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہوئے ایک جھوٹی کارروائی چلتی رہتی ہے تمھارے اندر۔ بے نام ہتھیاروں کی، کھوکھلے لفظوں کی۔"

۴

دوسرے دن یہ خبر پھیل چکی تھی کہ سور باڑی خالی کرنے کا سرکاری حکم ہو چکا ہے۔ تمام جھگی جھونپڑیاں توڑ دی جائیں گی۔ تین دنوں کا وقت ملا ہے اپنی اپنی جھگی جھونپڑیاں ہٹانے کے لئے۔ آفس جاتے ہوئے دیکھا کہ ڈوموں کے بیچ اس خبر سے عجیب سی دہشت پھیل گئی ہے۔ ایک طرف باڑی کے سور الاپ رہے تھے تو دوسری طرف ڈومنیں آپس میں گالی گلوچ کر رہی تھیں۔ کنارے کنارے کچھ ڈوم اُٹھی ہوئی لنگی اور میلے کچیلے کپڑوں میں ایک دوسرے سے کچھ بات چیت کر رہے تھے۔ ایک آدمی نے اشارہ کیا، وہی بھیکو ہے جو ڈی۔ ایم کی گاڑی سے کچلا گیا تھا۔ بھیکو کے پیروں میں اب بھی ایک دو جگہ پٹی چڑھی ہوئی تھی۔ سڑیل سا دکھنے والا بھیکو بڑے آرام سے جھگی کے بانس کا سہارا لئے ہوئے بیڑی پھونک رہا تھا۔ لوگ آجا رہے تھے۔ خود کو ٹٹول پاتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ بات چیت کی جا سکتی ہے بھیکو سے۔

اس لئے آگے بڑھ کر میں نے پوچھا:

"تم ہی بھیکو ہو؟"

"ہاں ساب"

"کل تمھارا ہی ۔ ۔ ۔ ؟"

"ہاں ساب" بیڑی کا کش لیتے ہوئے بڑے اطمینان سے وہ بولا۔

"کیا سچ مچ یہ باڑی اُجڑ جائے گی؟"

"نہیں ساب۔ ہم اُجڑنے نہیں دیں گے۔ باپ داداؤں کے وقت سے رہتے آئے ہیں یہاں۔"

"مگر اگر پولیس اُجاڑنے پر تُل ہی گئی تو؟"

"ہم ایسا ہونے نہیں دیں گے" بھیکو کو دوسرا کوئی جواب نہیں سُوجھا تھا۔

"تو ہنگامہ کروگے تم لوگ؟"

"وہ تو ہم کریں گے ہی ساب۔ اِس سے پہلے بھی یہ آرڈر ہوا تھا تو اپنی عورتوں کو باڑی میں لِٹا دیا تھا ہم نے کہ لاش پر سے گزر کر جاؤ تو توڑ دو باڑی، سمجھا ساب۔ باڑی توڑنا کھیل نہیں ہے۔"

اگر انھوں نے تمھاری عورتوں کی بھی پرواہ نہیں کی تو؟" اس بار میں نے بھیکو کی آنکھوں میں جھانکا۔

اور بھیکو بڑبڑا رہا تھا "تب بہت بُرا ہوگا ساب، بہت بُرا۔

اُس دن میں نے تنّو سے پھر پوچھا "تنّو کیا سچ مچ یہ لڑپائیں گے؟"

"میں نہیں سمجھتی۔ شاید تمھارا بھیکو ہی کچھ کرے تو کرے۔"

"مگر اکیلے بھیکو کے لڑنے سے۔"

"لڑائی کبھی پوری نہیں ہو گی۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ ہار کا بدلہ لینے کے لئے بھیکو کوئی دوسرا قدم اُٹھائے۔"

وہ قدم کون سا ہوگا تب سے میں یہی سوچ رہا تھا۔ اس درمیان سرکاری اعلان بھی

گونج گیا تھا۔ نالی پر بنی ہوئی دکانیں اور فٹ پاتھ توڑ دیئے جائیں گے۔ اب صرف ایک دن کا وقت رہ گیا ہے۔ گھروں کی جو سیڑھیاں ناجائز ڈھنگ پر نالیوں نکلتی ہیں وہ بھی توڑ دی جائیں گی۔ اس سرکاری اعلان کا ہونا کا ہونا تھا کہ نالیوں پر بنی ہوئی گمٹیاں اور فٹ پاتھی دُکانیں ٹوٹنے لگیں۔ بازار میں عجیب سی گہما گہمی تھی۔ لوگ اپنے یا مزدوروں کے ساتھ نالیوں پر نکلی ہوئی سیڑھیاں اور دُکانیں توڑ رہے تھے۔ سرکاری اعلان اب بھی جیپوں اور رکشے سے برابر گونج رہا تھا۔ کہیں اس پردے میں ... شاید میرا ایسا سوچا جانا صحیح نہیں تھا مگر شام ہوتے ہی یہ خبر سامنے آگئی تھی کہ کل سور باڑی توڑ دی جائے گی، پولیس کے رولر چلیں گے وہاں۔ سور باڑی کے ڈوموں نے ہٹنے سے انکار کر دیا ہے اور ڈوموں کو سور باڑی چھوڑنے کی وَربَل نوٹس بھی مل چکی ہے۔

شام ہوتے ہی سور باڑی میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ پولیس کے کتنے ہی سپاہی آکر وارننگ دے چکے ہیں کہ کل تک پوری باڑی خالی ہو جانی چاہیئے۔ ڈومنیں قصاب ٹولے میں ذبح ہونے والے جانوروں کی طرح چلّا رہی تھیں۔ کچھ لوگ کھڑے تھے۔ سوروں کے شور بھی اس ہنگامے میں شامل تھے اور ان سے الگ دیکھا ——— ایک طرف دو جھونپڑیوں کے بیچ بنے نالے کے اُوپر رکھی چارپائی پر بیٹھا ہوا بھیکو بیڑی پھونک رہا ہے۔ سب سے الگ تھلگ۔ آج ہاتھ پیروں کی پٹیاں اُتر گئی تھیں۔ مگر بھیکو شانت نہیں تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ سرکار کی اس زبردستی کی کارروائی کے ایک کارروائی اُس کے اندر بھی چل رہی ہے۔

گھر لوٹتے ہوئے ایک عجیب سا احساس مجھ پر حاوی تھا۔ کچھ دیر کے لئے اپنے بارے میں سوچ کر محسوس ہوا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ سب کیوں کر رہا ہوں، یہاں کیوں آتا ہوں۔ یہ خیال بھی بچوں کی طرح احمقانہ ہوگا کہ ڈوم قبیل کے لوگ بھی تہذیب یافتہ ہو جائیں۔ شاید نہیں۔ میں ایسا نہیں سوچ رہا تھا۔ اس لئے کہ مجھے یقین تھا کہ کسی لحاظ سے بھی یہ اپنے پیشے کو غلط سمجھنے کی بھول نہیں کر سکتے اور انسانی برابری کے توازن کے لئے یہ ضروری ہے کہ پیشے کو ویسا ہی رہنے دیا جائے اور ان پیشوں سے جُڑے کچھ لوگ جب چاہیں اس پیشے سے باہر جا سکتے ہیں۔ ان پر رہنے، نہیں رہنے میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ مگر کسی پیشے کو غلط مان کر یا نظروں سے گرا کر اس پر کی جانے والی کارروائی غلط ہے۔ اور یہ اسی کا ردِ عمل تھا جس نے میرے قدموں کو بار بار

اس باڑی میں کھینچا تھا۔ شاید یہ بھاونا اس خیال سے بھی کہیں بڑی تھی جو رنگوں اور نسلوں کا فرق کھڑا کر کے ایک دراڑ بن جاتے ہیں دو قوموں کے بیچ، ایک ہی طرح کے جسم والے دو آدمیوں کے بیچ [اس دن ونود نے خبر سنائی کہ ساؤتھ افریقہ کے انقلابی شاعر بنجامن کو پھانسی پڑ گئی۔ کامن ویلتھ ہیڈس کی بات بھی نہیں مانی افریقین گورنمنٹ نے وہی کیا جس کی اس نے ضرورت محسوس کی، سپاہی کو مارنے کا جھوٹا الزام لگا کر پھانسی دے دی۔ لبریشن کے نام پر ہر شخص فائٹ کرتا ہے اور کیا ملتا ہے فائٹ کرنے والوں کو۔ کہیں غدار، کہیں وفادار۔ ایک ہی ملک میں مقبول بھٹ کی طرح کہیں غدار اور کہیں شہید۔ دراصل مریخ پر جانے کی تیاری کے باوجود آزادی کا مفہوم سمجھنے میں کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہوئی ہے۔ کچھ دیر کے لئے لگا تھا کہ ہم کہیں نہ کہیں سے جھوٹ کے احساس سے ضرور جڑے ہیں۔ شاید سارے کے سارے ہی، سارے کے سارے ملک بھی۔ یہ احساس پتہ نہیں کب کیسے زور پکڑ گیا۔ بنجامن کی غلطی کیا تھی ؛ بھیکو کی غلطی کیا تھی ؟ وہی بیمار سا احساس، بنجامن کا شاعر باہر آ گیا تھا۔ بھیکو جاہل تھا اس کی گونگی انقلابی شاعری اس حادثے کے بعد اندر ہی اندر چنگاری بن رہی ہو گی۔ کسی نہ کسی سطح پر ہم برتری کے جھوٹے احساس سے چمٹے ہوئے ضرور ہیں اور یہ احساس خوفناک جانوروں کی طرح دو کمزور نام چھوٹوں کے کمزور وجود کو نگل جاتا ہے۔ اس سطح پر ایسی ایک جنگ ضرور ہونی چاہیئے۔ اس سطح پر ایسی ایک جنگ کی ضرورت بھی ہے۔ بنجامن بھی ہار گیا تھا، مگر شاید نہیں۔ اس نے اندھیرے میں اپنے ہی جیسے ہزاروں لاکھوں سیاہ فام حبشیوں کی جلتی آنکھوں میں ڈال دیا ہے مستقبل میں پیدا ہونے والے بھیانک خوابوں کے جراثیم اور جراثیم کے خاتمے کے لئے، انجانے میں ہی، انقلاب کے نام پر ایک مشعل۔

کیا بھیکو لڑ پائے گا۔

میں سوچتا ہوں، بھیکو کو ضرور اپنی طرف سے کوئی نہ کوئی کارروائی کرنی ہی چاہیئے۔

کارروائی کچھ اور آگے بڑھی۔

صبح آفس جاتے ہوئے دیکھا کہ سور باڑی میں گرد اُڑ رہی ہے۔ جھونپڑیاں، پھوس اور لکڑی کے ڈھیر کے رُوپ میں بیچ سڑک پر بچھی ہیں۔ پولیس کے آدمی اپنا کام کر چکے ہیں سامان

ڈھویا جارہا ہے۔ اب بھی دو جیپ کھڑی ہیں اور پولیس کرمچاری اِدھر اُدھر چھترائے ہوئے تھے۔ ڈی۔ ایم اور ایس پی کی گاڑی بھی کتنی ہی بار گشت کر چکی تھی۔ فٹ پاتھ اور نالیوں پر بنی دُکانوں پر رولر چل گئے تھے۔ پورے شہر کا نقشہ عجیب ہو رہا تھا اور اس سے بھی عجیب ہو رہا تھا سورباڑی کا نقشہ۔

پتہ نہیں آگے کا سفر کون سا ہے؟
اور نئی باڑی کہاں بنے گی؟

کتنے ہی سوالوں سے بہ یک وقت جوجھنا پڑ رہا تھا۔ شاید پھر یہ ہار گئے تھے۔ میری آنکھیں بھیکو کو کھوج رہی تھیں۔ مگر بھیکو کہیں نہیں تھا۔ کیا بھیکو ڈر کر بھاگ گیا؟ نہیں تو کہاں گیا۔ بھیکو شانت بھی نہیں تھا۔ اُس دن نالی کے بیچ رکھے پلنگ پر بیڑی کا کش کھینچتے ہوئے دیکھ کر صاف لگا تھا کہ اُس کے اندر بھی ایک کارروائی چل رہی ہے۔ مگر تنو نے کہا تھا کہ بھیکو اکیلے نہیں لڑ سکتا اور اس لڑائی میں بھیکو کا کوئی شریک کار نہیں تھا۔ اُجڑتی ہوئی سورباڑی میں ایسا کچھ ضرور تھا جو اندر ہی اندر مجھے ڈس رہا تھا۔ پوری انسانی برادری کے ساتھ ہونے والے کھلواڑ کو اس فضائیہ عہد میں چھوت جیسی بیمار شے کے احساس کو لبریشن کا عوامی سطح پر یہ کتنا کچا رشتہ تھا اور اسی کے ساتھ کارروائی ختم ہو گئی تھی۔ مگر شاید نہیں —— ابھی باقی تھی کارروائی۔ یہ میں بھول گیا تھا اور باقی بچی کارروائی بھیکو کی طرف سے تھی۔ دوسرے دن مجھے اس کی رپورٹ مل گئی تھی۔

ڈی۔ ایم کوارٹر میں داخل ہونے پر جب گارڈ نے اسے روکنے کی کوشش کی تو پتھر مار کر اس نے گارڈ کو زخمی کر دیا اور فرار ہو گیا۔ یہ آدمی بھیکو تھا۔ پولیس کو بھیکو کی تلاش تھی۔

۶

بہت سی کہانیاں انجانے میں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ مگر سوال تھا کہ بھیکو گیا کہاں؟ اس کارروائی کے بعد بھیکو کے اندر کا گونگا شاعر اب ضرور سامنے آگیا تھا۔ بنجامن کی طرح اس نے کسی پولیس کو گولی تو نہیں ماری، کوئی انقلابی نظم تو نہیں لکھی مگر اپنی اوقات پر،

اپنی طرف سے کمزور ہوتے ہوئے بھی ایک لڑائی لڑی ہے۔

۷

مَیں اکثر جو جھتا ہوں
اپنے اپاہج احساس سے
جو مجھے سو جانے کے لئے کہتا ہے
اپنے گرد و پیش میں چھائے ہوئے کہرے سے بے خبر ہو کر سو جانے کے لئے
اور میں بھی سو بھی جاتا تھا مگر پہلے
اب مَیں نے جاگتے رہنے کا عہد کر لیا ہے
اور اگر اس جاگتے رہنے میں میری مَوت بھی ہو گئی تو یقین ہے
جاگے ہوئے لوگ
میرے بعد بھی
غلط کو غلط سمجھ کر لڑتے رہنے کا یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔"

عصری ادب ۱۹۸۶ء ◆◆

تناؤ

اس تناؤ سے کب مکتی ملے گی۔ شاید کبھی نہیں ... کبھی نہیں ... درد کا احساس لمحہ لمحہ مختلف صورتوں میں اندر جاگتا ہے ۔ پھر زخم بن جاتا ہے ... اور پھٹ جاتا ہے۔ آج کالج بند ہے۔ اس لئے کہ رمیش نے خودکشی کر لی۔ اس لئے کہ مانگڈ سر کا قتل ہو گیا۔ مگر مانکڈ سر کا قتل نہیں ہوا۔ ہاں رمیش نے خودکشی نہیں کی بلکہ اس کا قتل ہوا ہے۔ مگر اس بات کو کتنے لوگ جانتے ہیں۔

صبح ہی صبح درشن نے میرے روم میں آکر دستک دی۔ رات ٹھیک سے کہاں سو سکا تھا۔ بس لے دے کر رمیش کی باتیں زندہ تھیں۔ اس کی گفتگو سے نکلا ہوا زہر ساری رات مجھے ڈستا رہا۔ "یہ سارے لوگ میری جان لے رہے ہیں۔ یہ پروفیسر، یہاں جنم لینے والی سیاست، کالج کیمپس کی اینٹ اینٹ سے سرانڈ اٹھتی ہے۔ کم از کم اس بدبو کا سامنا میں نہیں کر سکتا۔ تم سمجھ رہے ہو میرے دوست۔ میں نہیں کر سکتا۔

کب کہی تھی یہ بات رمیش نے مجھے۔ سب بھول جاتا ہوں۔ حافظے میں اب کچھ محفوظ نہیں۔ ... کبھی کہی ہو گی۔ مگر اس کا چہرہ یاد آ رہا ہے۔ غصے سے لال پیلا، بھینچی ہوئی مٹھیاں، چہرے پر پڑی ہوئی لکیریں ... مار ڈالوں گا سب کو ... ایک ایک کو نہیں چھوڑوں گا۔ فیوچر کے نام پر اندھیرے میں مجھے روشنی کی ایک کرن تک نظر نہیں

آئی۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ ایسی صورت میں میرے جیسا کوئی آدمی جی سکتا ہے"
"یہ احساس میرے اندر بھی تو ہے۔ مگر میں خاموش کیوں ہو جاتا ہوں رمیش۔
تم نے کبھی سوچا ہے"
رمیش نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ہاں اس لئے کہ تم اپنے بارے میں نہیں سوچتے۔ ہم میں سے کوئی اپنے بارے میں نہیں سوچتا۔ اپنی پیڑا (تکلیف) نگلنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ تمہارے گھر میں لے دے کر ایک بوڑھی ماں، ایک بوڑھا باپ اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔ میرے گھر میں دو دو بہن سمیت ایک بڑا پریوار ہے اور بڑا ہونے کے ناطے پورا خاندان منہ بائے میرے فیوچر کو دیکھ رہا ہے کہ آؤ... روٹی ڈالو... روٹی ڈالو... ان بھوکے پیٹوں میں... سوکھی انتڑیوں میں...
شاید رمیش نے سچ کہا تھا۔ میری خاموشی کے پیچھے اس تلخ حقیقت کے سوا اور کیا تھا۔ اس دن کمرے میں آکر میں نے بے سدھ سوئے سوئے اپنے روم میٹ کو دیکھا۔ پھر بوڑھی ماں کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔
... عرصہ پہلے تمہارا خط ملا تھا... جواب اس لئے نہیں دے سکا کہ جواب کیا دوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم نے پوچھا ہے۔ امتحان کب ہوگا، تو جواب ہے امتحان کی منزل سے ہم دور آچکے ہیں۔ تم نے پوچھا ہے۔ آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ تو آگے کا ارادہ ہی گھر سے اتنی دور... یونیورسٹی میں پروفیسروں کے تلوے چاٹنے پر مجبور کر رہا ہے... شاید آپ لوگ تھیس جیسی کسی چڑیا کے بارے میں نہیں جانتے۔ یہ بڑی خوفناک چڑیا ہوتی ہے۔ جلد پکڑ میں نہیں آتی یہ پروفیسر کے پاس کتا نہیں ہے اور میں جانور کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ میری تھیس کا کیا ہوگا۔ تھوڑا تھوڑا بھونکنا تو آیا ہے مگر اب شاید کاٹ کھانے کا فن بھی مجھے اسٹریٹ ڈاگ یعنی گلی کوچوں کے کتوں سے سیکھنا ہوگا"
یہ کیا لکھا میں نے۔ میں خود نہیں جانتا۔ بس جو لکھا وہ ڈراپ کر دیا۔ ماں کے

نام۔ کتنی بے صبر ہوتی ہے ماں میرے پتروں کے لئے۔ پتر آئے گا تو جھپٹا مار کر کھولے گی۔ پڑھنے کو بیتاب ہو جائے گی۔ پھر کیا پڑھ پائے گی۔ کتوں کے بھونکنے اور کاٹنے کے پیچھے جو راز پوشیدہ ہے اس کی تہہ تک کیسے جا پائے گی۔ آفس سے لوٹتے ہی بوڑھا باپ، دمّے سے کھانستا ہوا ماں سے دریافت کرے گا کہ کیا لکھا ہے پُتّر نے۔ تو کیا جواب دے گی ماں۔ ماں کو یہ سب نہیں لکھنا چاہیئے تھا۔ شاید میرے اندر بھی رمیش ہے اور اس رمیش کو پہچاننے میں، مَیں نے بہت دیر کر دی۔

درشن اس دن بے سدھ سویا پڑا تھا کہ رمیش نے آکر جھنجھوڑ دیا۔ مَیں کچھ لکھ رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سُن کر چونک پڑا۔ آنے والا رمیش ہی تھا۔ عجیب حُلیہ ہو رہا تھا اس کا۔ بال اجھڑائے ہوئے ہاتھ میں ایک گندہ سا جھولا۔ جینس کی پینٹ اور کھادی کا کرتا پہنے۔

" چل بے پڑھاکو۔۔۔ ختم بھی کر۔۔۔ اوبے۔۔۔ اُٹھ۔۔۔ اُٹھ۔۔۔"

رمیش نے آتے ہی حیوانی حرکت شروع کر دی۔

درشن آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

" کیا ہے ؟"

وہسکی۔ بیور وہسکی بھی لایا ہوں۔ چل بے۔ تو بھی میرے ساتھ شریک ہو جا۔

رمیش نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" نہیں"

" آ۔۔۔ نا۔ اچھا پارٹنر ہو تو وہسکی کا سرور ہی کچھ اور ہے۔ پسند کرے تو اسکاچ کی چند بوتلیں بھی۔۔۔"

" رہنے بھی دے"

" جانتا ہے یہ بوتل اگر مانکڈ سر کے یہاں پہنچا دیتا تو کیا ہوتا"

" کیا ہوتا ؟"

" تھیس کے جس پہلے ہی چیپٹر کو دیکھ کر انھوں نے ری رائٹنگ کا مشورہ دیا تھا۔ وہ ایسا نہیں کہتے۔ محنت سے لکھی گئی تھیس پر سرسری نظر نہیں ڈالتے"

رمیش کا چہرہ اچانک ہی لال ہوگیا تھا ، "تو جانتا ہے کتنی محنت کی تھی میں نے ۔ کتنی کتابوں کا سہارا لیا تھا ۔ اس کے لئے دن رات لائبریریز کے چکر کاٹتا رہا تھا ، تب جاکر کئی مہینے بعد یہ ایک چیپٹر پورا ہوا تھا اور رماکانت سرنے سرسری نظر ڈال کر ساری محنت پر شیمپئن الٹ دی ۔ اور تو جانتا ہے میں شیمپئن نہیں پیتا ، وسکی پیتا ہوں ۔"

"تو وسکی پی ۔ تب تک میں باہر رہتا ہوں ۔"

یہ شراب کباب کی محفلیں مجھے کبھی راس نہیں آئیں ۔ ہاں رمیش ہر دم ان میں ڈوبا رہتا ۔ پہلے نہیں پیتا تھا مگر اب آہستہ آہستہ اس کی عادت بن گئی تھی ۔ پوچھا تھا ایک بار کیوں پیتا ہے تو ۔ اپنا دل جلاتا ہے ۔ بے وجہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے ۔"

"ہاں ! نقصان تو اپنا ہی ہوتا ہے ۔" رمیش نے ٹھنڈی سانس بھری تھی ۔ "مگر کسی طرح یہ اندر کے زہر کو مار دیتا ہے ۔ اور نہیں پیوں تو جانتا ہے کیا ہوگا ، ایکدم سے نکسلائٹ بن جاؤں گا ۔"

"کیا ؟"

"ڈر گیا ۔" جتنے پروفیسر ہمارے تمہارے فیوچر سے کھیلتے نظر آتے ہیں سب ایک ایک کر کے بھگوان کو پیارے ہو جاتے ۔ اسی لئے تو پیتا ہوں کہ وہ گھر چلائے رکھیں ۔"

رمیش نے وہسکی کی چھوٹی سی بوتل کھول لی تھی ۔ درشن پلتھیا مار کر چوکی بیٹھ گیا تھا ۔ کمرے سے باہر نکل کر دیکھا ۔ ہاسٹل کے قریباً تمام دروازے بند تھے ۔ دو ایک لڑکے ریلنگ پر گپ شپ کر رہے تھے ۔ چپ چاپ آسمان کا نظارہ کرتا رہا ۔ شاید رمیش نے ٹھیک کہا تھا ۔ اپنے بارے میں زیادہ بیربس میں کبھی نہیں ہوا ۔ شاید اس لئے بھی کہ بوڑھے باپ نے بہت زیادہ فکرمند نہیں تھا ۔ چھوٹا سا خاندان ، اتنا تو پنشن کے بعد بھی ضرور مل جائے گا کہ تین آدمیوں کا پیٹ بھرا جا سکے ۔ مگر میرا کیا ہوگا ؟ اس بارے بہت زیادہ نہیں سوچا ۔ شاید اس لئے کہ ایم ۔ اے پاس کرنے کے بعد میری پیٹھ ٹھوکنے والوں نے پتہ نہیں کیسے میرے اندر اچھے فیوچر کے آدمی کو پڑھ لیا تھا ۔ اب پی ۔ ایچ ۔ ڈی کر، تھیسس لکھ اور پروفیسر بن جا ۔ حکومت کے بدلتے ہوئے رنگوں نے "پلٹیا" کھاتی ہوئی

سیاسی فضا نے میٹرک سے لے کر ہر امتحان میں اتنی دیر کی کہ ریزلٹ نکلتے نکلتے اچھی سروس کا بخار کم ہوتا گیا۔ رمیش سے اس موضوع پر بات کرو تو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ پیچھے کی یادمت دلاؤ فرینڈ۔ جی چاہتا ہے پورے ایجوکیشنل سسٹم کو جلا کر راکھ کر ڈالوں۔ سالے پڑھائی کے نام زندگی برباد کر دیتے ہیں۔ پورا جیون پڑھتے رہو۔ اور پھر کیا ملتا ہے کیا ملتا ہے؟ اکثر جب اس کے گھر سے کوئی خط آتا تو وہ ضرور دکھاتا۔ دیکھو کیا لکھتے ہیں یہ لوگ۔ جُگ جُگ جیو۔ ترقی کرو۔ اور یہاں کیا کر رہے ہیں ہم۔ بھاڑ جھونک رہے ہیں۔ کسی دن اگر زیادہ فریسٹریٹیڈ ہوا نا تو سالی تھیسس جلا دوں گا۔ اور مائنڈ سر کا . . .“

”صرف مائنڈ سر ہی کیوں؟“

مَیں نے بہت آہستہ سے کہا ”جو ہو رہا ہے اس میں صرف مائنڈ سر ہی تو شامل نہیں ہیں۔“

”مگر میرے کیس میں تو مائنڈ سر ہی ہیں۔ میرا واسطہ مائنڈ سر سے ہے۔ فیوچر سے کھیلنے والے کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔“

”مجھے تو اس گھناؤنی سیاست کا مائنڈ سر ایک چھوٹا سا مہرہ نظر آتا ہے۔ پورے سسٹم کو چیلنج کر پائے گا تو بڑے بڑے منسٹرس کے فون۔ بڑے لوگوں کی جی حضوری وی۔ آئی۔ پیز کے لڑکوں پر نگاہ کرم۔ تیرے پر دھیان دے کر انھیں کیا ملے گا۔ کبھی سوچا ہے؟“

”جب تک ہالو قسم کے لوگ یہاں ہیں نا۔ تب تک یہ سسٹم ایسا ہی رہے گا۔ اور اس تناؤ کے ماحول سے کبھی مکتی نہیں ملے گی۔“

مَیں نے دیکھا۔ رمیش کچھ سوچ رہا ہے۔ آنکھیں تن گئی ہیں۔ گہری سوچ میں ڈوب گیا ہے رمیش۔ اس کے دو ایک روز یونیورسٹی میں ہڑتال تھی۔ لڑکوں نے پانی، بجلی کی سپلائی ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے پروسیشن نکالنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس وقت ہم تینوں، درشن، مَیں اور رمیش یونیورسٹی کینٹین میں چائے پی رہے تھے۔ تبھی ایک دُبلا پتلا نیتا دھاری لڑکا تیز قدموں سے اندر آیا۔ ہمیں چائے پیتا ہوا دیکھ کر

غصّے میں آگ بگولا ہو گیا۔

"بھائی! آپ لوگ چائے پی رہے ہیں اور وہاں جلوس کی پوری تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ زیادہ لوگ ہوں گے تو آواز بھی زیادہ ہوگی"۔

"کہاں تک پہنچاؤ گے اپنی آواز" رمیش نے غصّے بھرے لہجے میں اس لڑکے کو گھورا۔

"کیا، اب؟"

"فیوچر کو کھٹارے میں ڈال کر گلہ سکھاتے رہو۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ تمھاری اُونچی بہت اُونچی آواز کا کسی کو اثر ہونے والا نہیں۔ ٹوٹ جائیں گے۔ ڈی۔ ایم کے آفس کی دیواروں سے ٹکرا کر یہ آوازیں۔ نیتاؤں کو بھی کہہ دو۔ ان جلوسوں سے کوئی فائدہ نہیں ہونے والا"۔

"تو آپ نہیں جائیں گے"

"ہم میں سے کوئی نہیں جائے گا" رمیش نے گلاس زور سے ٹیبل پر پٹکا۔

اس دن رمیش اور ہم لوگوں کے جلوس میں شامل نہ ہونے پر اسٹوڈنٹس نے کافی اعتراض کئے۔ مگر رمیش کا کہنا تھا چائے خانے اور چند ڈھابے کے بہروپیوں سے اسے کچھ نہیں لینا دینا ہے۔۔۔

کمرے میں آکر بھی اس پر غصّے کا بھوت سوار تھا سالے جلوس نکالتے ہیں۔ نیتا بنتے ہیں۔ ہنگامے کرتے ہیں۔ اسکول، کالج، یونیورسٹی۔ گھناؤنی سیاست کا بازار یہاں بھی گرم ہے۔ تو پوچھتا ہے میں کیوں نہیں حصّہ لیتا اس سیاست میں۔ کیوں حصّہ لوں میں؟ یہ اپنا تناؤ کچھ کم ہے جو جھیل رہا ہوں۔ ہر روز ایک ان دیکھی موت مجھے نگل جاتی ہے۔ ہر رات بے سدھ اپنا قتل ہوتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں۔ چھ مہینے میں ایک پیپر کمپلیٹ نہیں کر پایا۔ تو اس سیاست میں کودنے سے مجھے کیا ملے گا؟ دراصل اپنے مسئلے کچھ اتنے زیادہ اُلجھے ہوئے ہیں فرینڈ کہ میں اخبار نہیں پڑھتا۔ ٹی۔ وی نہیں دیکھتا۔ الگ رہتا ہوں پولیٹکس سے۔ ان نیتاؤں سے ۔۔۔ اور اگر کبھی بھول سے ان سے جڑ گیا نا۔۔۔ تو ان سب کا کباڑا

کر کے ہی دَم لوں گا۔۔۔"

رمیش ہانپ رہا تھا۔" ہندوستان کو اکیسویں صدی میں لے جانے والے پروگرام کے باوجود بھی چھوٹے چھوٹے شہروں میں بجلی پانی کا مسئلہ حل نہیں ہونے والا ہے۔ تو ٹھیک کہتا ہے۔ پورا سسٹم نہیں بدلا جا سکتا۔ مگر ہم سے ہر آدمی اُٹھ جائے تو؟ اپنے طور پر لڑ جائے تو؟ مگر ہم تو بزدل بن جاتے ہیں اپنے معاملے میں۔۔۔ اور ہار جاتے ہیں۔۔۔"

"ہار جاتے ہیں؟"

پتہ نہیں ہار جانے کی صداقت کا علم مجھے اس وقت کیوں نہیں ہوا۔ اس دن کیوں ہوا جب کوشلیا کے سوسائیڈ کرنے کی خبر سنی۔ کوشلیا ورماسر کے زیرِ نگرانی اپنی بوٹانی کی تھیسس کمپلیٹ کر رہی تھی۔ اُڑتے اُڑتے صرف اتنی خبر سننے میں آئی تھی۔ ورماسر اسے رات میں بلا رہے تھے۔ ان کی بیوی بچوں سمیت مائیکے گئی ہوئی تھیں۔ کوشلیا نہیں گئی۔ صرف اتنی سی بات پر ورماسر خفا تھے اور کوشلیا جان رہی تھی۔ اب یہ تھیسس کبھی مکمل نہیں ہو گی۔

ورماسر کے خلاف اسٹوڈنٹس نے پھر زبردست مظاہرہ کیا۔ تقریباً ایک ہفتہ تک ورماسر یونیورسٹی نہیں آئے۔ رمیش اس درمیان کھولتے ہوئے پانی جیسا ہو رہا تھا۔ اُبل رہا تھا۔ کوشلیا میری دوست نہیں تھی مگر کوشلیا کو اپنے اندر جھانک کر میں بھی دیکھ سکتا ہوں۔ کم ہمتی، ہار گئی۔ سوسائیڈ کرنے سے پہلے اگر اس نے ورما کا پول کھول دیا ہوتا تو آج کالج میں ورماسر کہیں نظر نہیں آتے۔

شاید اس جنگ میں ہم سب ہارنے لگے ہیں۔ میں خاموش ہو کر رہ جاتا ہوں۔ اور رمیش بول کر رہ جاتا ہے۔ زندگی کے اور کتنے سال ایسے ہی گزر جائیں گے۔ عمر کی بڑھتی ہوئی لکیریں ایک دن زمانے بھر کا مقروض بنا دیں گی۔ مگر میرا کیا ہے۔۔۔؟

نہیں۔ اب اس سوال [illegible]ٹ رہا ہوں۔ میرا بھی کچھ ہے۔ خود پر اپنا بھی بہت حق ہوتا ہے۔ مگر اس حق کے لئے [illegible]بسر کو ناراض تو نہیں کیا جا سکتا۔

"پھر کیا کروں میں؟"

رمیش اس دن سر جھکائے بیٹھا تھا۔ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا۔۔ کیا کروں میں ۔۔۔ بابو جی کی چٹھی پر چٹھی آ رہی ہے۔۔۔ گھر آجاؤ ۔۔۔ کچھ دنوں کے لئے گھر آجاؤ ۔۔۔ تنوی کی شادی کی بات چل رہی ہے۔ لینے دینے کا جگر تمھیں ہی مل کر طے کرنا ہو گا ۔۔۔

تم جانتے ہو فرینڈ، میری اپنی کیا اوقات ہے۔ میرے گھر والے مجھ سے کچھ نہیں مانگتے۔ یہ ان کا بڑپن ہے، مگر عمر کی اتنی دہلیز پار کرنے کے بعد بھی ہم انھیں کیا دے سکے ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ یہ بات کچوٹتی ہے۔ تکلیف پہنچاتی ہے۔ تنوی کی شادی کے وقت بھی کیا میں خالی ہاتھ رہوں گا ۔۔۔ گھر کیا منہ لے کر جاؤں؟

میں نے سر جھکا دیا۔

شاید یہ قصہ مجھ سے بھی جڑا تھا۔ ایک بار بابو جی نے دبے دبے لفظوں میں خط کے ذریعہ مجھ سے کچھ پیسے طلب کئے تھے۔ ٹیوشن سے کتنا نکال پاتا ہوں۔ کچھ دیا تو کبھی نہیں۔ ہاں ضرورت بلاضرورت کبھی کبھی لیتا ضرور رہا ہوں۔ اپنے آپ میں کیسی کھینچاتانی چلتی ہے ایسے موقعوں پر۔

"تب تو کیا سوچ رہا ہے؟"

"کچھ سوچ رہا ہوں ۔۔۔ مگر ۔۔۔" کہتے کہتے ٹھہر گیا تھا رمیش۔

"مگر کیا؟"

"پتہ نہیں کیوں۔ اتنی ہمت رکھنے کے باوجود اپنے اندر کہیں نہ کہیں کو شیلیا دکھائی دے جاتی ہے۔"

"پاگل ہو گیا ہے تو۔"

"شاید ۔۔۔"

رمیش چپ چاپ اُٹھ کر چلا گیا تھا۔

"مگر رمیش کہاں گیا۔"

اس دن کمپاؤنڈ کا چپہ چپہ چھان مارا۔ رمیش نظر نہیں آیا۔ درشن سے بھی دریافت

کیا۔ شاید گھر چلا گیا ہو۔ مگر مجھے یقین تھا رمیش گھر نہیں جا سکتا۔ ہاں آخری وقت میں۔ مجھے یاد آیا رمیش نے اتنا ضرور کہا تھا۔ جاتے جاتے میں ایک سسٹم ضرور ٹھیک کر جاؤں گا ۔۔۔ تم دیکھ لینا ۔۔۔"

ساری رات انگیٹھی پر تپتا رہا تھا۔ اس تناؤ سے کب مکتی ملے گی، شاید کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ درد کا احساس لمحہ لمحہ مختلف صورتوں میں جاگتا ہے۔ پھر زخم بن جاتا ہے۔ اور پھوٹ جاتا ہے۔ صبح ہی صبح درشن نے جب میرے روم میں آکر دستک دی ۔۔۔ تو میں پہلے سے جان رہا تھا۔ درشن کیا کہنے والا ہے ۔۔۔ پھر بھی رمیش کی یادوں کو تازہ کرتا ہوا اتنا ضرور پوچھا۔

"کیا بات ہے درشن ؟"

"یونیورسٹی میں کافی ہنگامہ ہے۔ مانکڈ سر کی یاد میں شوک سبھا ہونے والی ہے۔ اور ادھر لڑکوں میں کافی جوش ہے۔ وہ مانکڈ سر کی موت پر خوشی منا رہے ہیں۔ کافی ہنگامہ ہے یار ۔۔۔"

سوچتا ہوں بستر سے اٹھوں یا نہیں۔ سچ کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ کیا سچ مچ رمیش نے اپنی طرف سے سسٹم میں کوئی مضبوطی لائی ہے یا سسٹم ویسا کا ویسا ہی رہے گا۔ کسی ایک کو مار کر پورے سسٹم کی تبدیلی کی بات سوچنا احمقانہ پن ہے۔ مگر شاید مانکڈ سر کو مار کر رمیش نے غلطی نہیں کی ہے۔ ہاں یہ احساس مجھے ضرور ہے۔

کہ رمیش نے خودکشی نہیں کی ہے۔

بلکہ اس کا قتل کر دیا گیا ہے ــــــ

سہیل، قلم ۱۹۹۱ء

ورتمان ساہتیہ

◆◆

موسمِ بہار ـــــــ خوش آمدید
محبت اور وفا سے لبریز۔ موسمِ بہار
خوش آمدید
مجھے کیسے اُداس کر دیتا ہے . . .
کیسے ......؟

ایوگینی اورنیگن ـــــ
ـــــ رُوسی شاعر

◆◆

کمرہ بولتا ہے

آپ نے بھی غور کیا ہوگا اور میں نے بھی غور کیا ہے کہ آدمی جس مکان میں رہتا ہے وہ مکان اُسے بے حد عزیز ہوتا ہے۔ مکان کا وہ کمرہ جس میں وہ لیٹتا ہے، سوتا ہے، فرصت کے زیادہ تر لمحات گذارتا ہے، اس سے زیادہ اچھا کمرہ اُسے پورے گھر میں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ یہ ممکن ہے کہ آپ کو اپنے کمرے سے اس شدت سے پیار نہ ہو جس شدت کے ساتھ مجھے ہے۔ جب بھی میں کسی دوسرے شہر کا دورہ کرتا ہوں اور دو چار روز وہاں ٹھہرنا مقصود ہوتا ہے اپنے کمرے کی یاد مجھے توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ کتنی ہی بار دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ دورہ منسوخ کر دوں اور بھاگ کر اپنے کمرے میں لوٹ جاؤں ۔ ۔ ۔ وہاں سب کچھ تو موجود ہوگا ۔ ۔ ۔ میری بکھری گرد و غبار میں ڈوبی ہوئی کتابیں ۔ ۔ ۔ میرے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی یادیں ۔ ۔ ۔ یادیں جن سے زندگی کا اتنا گہرا جڑاؤ ہے کہ میں کبھی سنبھلتا ہی نہیں۔ اگر میرے مونس و غم خوار کمرے نے مجھے سہارا نہیں دیا ہوتا، ان دنوں اچانک جب پورے مکان میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا ۔ ۔ ۔ اور مکان چار بزرگوں کی رونق سے محروم ہو گیا تھا تو یہی کمرہ تھا جس میں گھنٹوں بیٹھ کر ان کی بھولی بسری پرچھائیوں سے دل بہلایا کرتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے ۔ ۔ ۔ پاگل کر دینے والی ہسٹریائی چیخیں بلند ہو جاتیں تو ہاتھوں میں منجن تھام لیتا اور گھنٹوں دانت رگڑتا رہتا۔ منجن کرنے سے کچھ سکون سا ملتا ۔ ۔ ۔ یادوں

کے بیچ ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہو جاتا۔ ۔ ۔ پھر آہستہ آہستہ میں یادوں کے گھنے جنگل سے دُور نکل آتا۔ ۔ ۔ یہ زندگی کے شب و روز تھے جہاں کوئی ٹھہراؤ نہ تھا۔ ٹھہراؤ نہ تھا تو زندگی نہ تھی ۔ ۔ ۔ اور زندگی اس لئے نہ تھی کہ پا بہ زنجیر نہ تھا ۔ ۔ ۔ بس ایک لمبی تھکان تھی، جو بائیس بہاروں کے یوُں ہی گذر جانے کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ کبھی وہی کمرہ اکیلے پن ڈسا کرتا۔ مجھ سے پوچھا کرتا۔ زندگی کی بے رونقی سے یوں کب تک کھیلتے رہو گے؟ اپنے بارے میں کچھ سوچا ہے۔ افسانہ اور غزلیں تمھیں کچھ نہیں دے سکتیں سوائے رُوحانی آسودگی کے۔ سوائے اُس نجات کے جو تمھیں کرب و غم کی کیفیات سے دُور نکال لاتے ہیں۔ سن رہے ہو عالم۔ افسانہ اور غزلیں تمھارے لئے ایک پوری زندگی نہیں بن سکتے ۔ ۔ ۔ اور تم بس اِنھی کے اندر لگتے ہو۔ یہی ہے تمھاری کائنات ۔ ۔ ۔ تو اچانک کمرے سے سوال کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ کہ یہ پاگل کر دینے والا سنّاٹا جو مجھے کاٹ کھا رہا ہے، اس سے باہر نکلنے کا جواز کونسا ہے ۔ ۔ ۔ جس نے معصومیت سے نکلے ہوئے بزرگ قہقہوں کو اپنے اندر پیوست کیا ہو اور وہ قہقہے اچانک ساتھ چھوڑ گئے ہوں تو کیا اکیلے پن کا گماں ممکن نہیں ۔ ۔ ۔ میرے لئے تو یہی پناہ گاہ ہیں کہ اب خود کو جوڑتے ہوئے افسانہ اور غزل کی دُنیا سے دُور نہیں جا سکتا۔ ان میں اپنی کیفیت پیوست کرتا ہوں تو سکون ملتا ہے ۔ ۔ ۔ ہاتھوں میں پھر سے منجن تھام لیتا ہوں۔ گھنگھروُں کے رقص گرد و نواح سے دھیرے دھیرے زور پکڑتے ہیں ۔ ۔ ۔ پہلے نغمی آتی ہے اور پھر زیبا ۔ ۔ ۔ دونوں میرے ہاتھوں میں منجن دیکھ کر خاموشی سے واپس لَوٹ جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ اور کمرہ مجھے اشارےسے بتا رہا ہے کہ ۔ ۔ ۔ عالم! تمھارے وجود کو اب دیمک کھانے لگے ہیں ۔ ۔ ۔ اور دیمک جب ایک دن تمھارے پوُرے وجود کو چاٹ جائیں گی تو پھر کچھ بھی نہ بچے گا ۔ ۔ ۔ دیمک زدہ کتابیں چھونے کی اور پڑھنے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا ۔ ۔ ۔ زیبا ہو نغمی ۔ ۔ ۔ دونوں نے تمھارے اندر کی دیمک کو اپنے اپنے فلسفوں کی عینک سے پہچان لیا ہے اور اوجھل ہوتی جا رہی ہیں ۔ ۔ ۔

"سب اوجھل ہو گئے یا کوئی باقی ہے؟"

کمرے میں لَوٹتے ہوُئے وہی پاگل کیفیت پھر میرے وجود پر مسلّط ہو جاتی ہے۔

پر سچ ٹوٹ رہا ہوں۔۔۔ ٹوٹتا جا رہا ہوں (خدا کبھی کسی کو محسوسات کا ایاز نہ بنائے۔)
محسوسات کے صحرا میں جب جب پاگل کر دینے والے بم کے دھماکوں کو محسوس کیا ہے میرے
کمرے نے اس کی شہادت پیش کی ہے۔۔۔ کمرے میں آئے ہوئے طوفانوں کی صورت میں۔
۔۔۔ بچھے ہوئے ڈھیروں کاغذات کی صورت میں۔۔۔ ہم سوتے رہتے ہیں مگر کمرہ جاگتا
رہتا ہے۔ میں ایک بار پھر سے پائل کی اس جھنکار کو اپنے ذہن کے پردے پر قید کر رہا ہوں۔
۔۔۔ جہاں بتو چپ چاپ چلتی ہوئی میرے برابر آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ کتنے دبلے ہو گئے
ہو تم۔۔۔ اپنا خیال ہی نہیں رہتا۔۔۔ تمہارے پاس جتنی بھی سوچیں ہیں وہ سب کی سب
مجھے دے دو۔۔۔ اور میرے پاس سے وہ سوچیں لے لو جو صرف تمہارے بارے میں ہے
عالم۔۔۔ جس کا تعلق زندگی کی اس خوشنما جنت سے ہے جہاں ہم دونوں مل کر اس
پاگل کر دینے والی کیفیات سے دور ایک نئی خوبصورت زندگی کا خواب بن سکتے ہیں۔۔۔
بتو کی نظریں جھکی ہیں۔۔۔ میں غور سے بتو کو دیکھ رہا ہوں۔۔۔ کمرہ اچانک کتنا روشن
ہو گیا ہے۔ یہی کمرہ جو کل تک لمبی لمبی سسکیاں لیا کرتا تھا، اداسی کی رَو میں سوگوار نظر آیا
کرتا تھا۔۔۔ اچانک جگمگا اٹھا ہے۔۔۔ اس لئے کہ ایک بے چین کہانی کو آرام مل گیا ہے۔
ایک نئی کہانی کی شروعات ہو گئی ہے۔۔۔ اور جب ایک نئی کہانی کی شروعات ہو جاتی ہے
تو خوبصورت سلسلوں کا ایک لامتناہی سفر بھی شروع ہو جاتا ہے۔ انہی دنوں مجھے دلی میں
سروس مل گئی۔ اور شادی کے چار مہینے بعد میں بتو کو لے کر اجنبی شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔
بیچ میں بھیا کا خط آیا تھا۔۔۔ مکان بن رہا ہے۔۔۔ ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ بھیا کو لکھ
دیا تھا۔۔۔ بھیا پلیز اس وقت جب تک میں نہ آؤں۔۔۔ میرے کمرے میں کچھ بھی تبدیلی
مت لائیے گا۔۔۔ کوئی چونا گردانی نہیں۔ کوئی صفائی نہیں۔۔۔ ایسا کیوں ہے۔۔۔
اس کمرے سے میری خواہش کا کونسا لگاؤ ہے، شاید ٹھیک طرح سے میں اُسے الفاظ کا لبادہ
نہیں پہنا پاؤں۔۔۔ مگر بھیا پلیز۔۔۔ اس کمرے کو ویسا ہی رہنے دیجئے گا جیسا کہ ہم اور
بتو اسے چھوڑ کر گئے تھے۔۔۔"

تو کہانی شروع ہو گئی ہے۔۔۔ ایک نئی کہانی شروع ہو گئی ہے اور مکان مجھے

آواز دے رہا ہے۔

۲

پتہ نہیں کس نے کہا تھا دنیا میں جتنے بھی ملک ہیں، سب سے اچھا ملک میرا ہے۔ ملک میں جتنے بھی شہر ہیں سب سے اچھا شہر میرا ہے، شہر میں جتنے بھی مکان ہیں سب سے اچھا مکان میرا ہے۔ اور مکان میں جتنے بھی کمرے ہیں سب سے اچھا کمرہ میرا ہے ... میں اکثر بتو کو بتایا کرتا ہوں ... زندگی کے شب و روز کی اتنی ساری گتھیوں کو اُس کمرے میں سلجھاتا رہا ہوں کہ اب روز ہی اس کمرے کو دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ پتہ نہیں کیوں لگتا ہے کہ بچیا اگر نئے سرے سے وہ مکان بنائیں گے تو وہ کمرہ بھی بدل جائے گا ... کمرے کے ساتھ ساتھ کتنا کچھ بدل جائے گا ... پورے گھر کا ڈھانچہ ... اور میرے جسم میں پھیلتی جائے گی ایک تیز سنسناہٹ۔ جانے کیوں میں اس کمرے میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھنا چاہتا۔ سوچتے سوچتے آنکھیں پتہ نہیں کیا ڈھونڈنے لگتی ہیں ... کیسی کیسی ہستیاں آنکھوں میں تھرانے لگتی ہیں ... امی کی ... بڑی اماں کی ... نانی اماں کی ... تمام آوازیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ ... میں پرانی آوازوں کے پرانے شہر میں لوٹ آیا ہوں ... جہاں سب زندہ ہیں اور آنکھوں کے سامنے متحرک رہے ہیں۔ ان میں ہر شخص مجھے عزیز ہے ... سب کے سب محبت سے، معصومیت سے مجھے دیکھے جا رہے ہیں ... مجھے بلا رہے ہیں ... مجھے آواز دے رہے ہیں ... میں اچانک کچھ بولنے کے لئے اپنا منہ کھولتا ہوں اور طلسم ایک جھٹکے میں ٹوٹ جاتا ہے۔ آوازیں وداع کی پہاڑیوں میں گم ہو جاتی ہیں ... چہرے آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں ... میں پسینے پسینے اس اجنبی شہر میں بتو کی بے چین سانسوں کے درمیان اس کی بانہوں میں پڑا لمبی لمبی سانسیں بھر رہا ہوتا ہوں ... بتو! پرانے مناظر مجھے زندہ دفن کر دیں گے ... مجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے ... اپنا کمرہ یاد آ رہا ہے ... تب بتو آہستہ سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے ... تو لوٹ جاؤ نا ... تم تو ہر روز ہی مجھے آرہ میں نظر آتے ہو ... جب صبح میں سو کے

اُٹھتے ہو اور جس انداز سے چائے طلب کرتے ہو تو یہ انداز بھی آرہ سے قطعی الگ نہیں معلوم ہوتا ہے جبکہ دوسرے شہروں میں انداز بدل جایا کرتے ہیں عالم... تمہاری کھوئی ہوئی آنکھیں اور تمہارے اپنے لہجے کی تھکن تمہیں کبھی بھی آرہ سے جُدا نہیں کرتیں۔ ... تم اب بھی آرہ میں ہی ہو عالم... فرق اتنا ہے کہ اس اجنبی شہر میں ہم تصوّر تو کر سکتے ہیں مگر تمہارا مکان تمہارا کمرہ نہیں لا سکتے... میں بھی تمہارے ساتھ تمہارے اسی کمرے میں تمہاری عجیب و غریب باتوں سے لُطف اندوز ہو رہی ہوں... وہ چُپ ہوتی ہے... پتہ نہیں کیا سوچ کر نظریں جھکا لیتی ہے... مَیں بہت غور سے اُس کے سانولے سانولے چہرے کو دیکھتا ہوا اُنگلیوں سے لکیریں بناتا ہوا سوچنے لگتا ہوں میرا انتخاب غلط تو نہیں رہا... غلط تو نہیں رہا... آہستہ اس کے پیٹ میں گدگدی ڈالتا ہوں... تو کھلکھلا اٹھتی ہے... قہقہہ لگاتا ہوا مزید گدگدیاں اس کے پیٹ میں لگاتا ہوا کہتا ہوں... تو... ابھی اپنا ندیم نہیں آیا... مگر مجھے کہانیاں سُنانے کی بچپن سے عادت رہی ہے۔ اپنے سے چھوٹے عمر کے بچّوں کو لے کر بیٹھ جاتا اور انھیں گھنٹوں کہانیاں سنایا کرتا... تم مجھ سے ایک کہانی سنو گی۔ ایک پاگل کی کہانی... ایک بہت ہی عجیب شخص کی کہانی... جو ایک لمبی مدّت تک بچپن کے بے معنی قہقہوں میں زندگی تلاش کرتا رہا جو ہر بات بہت دیر میں سمجھنے کا عادی تھا اور جب سمجھتا تو بات یا تو بہت آگے بڑھ چکی ہوتی یا بہت پیچھے چُھوٹ چکی ہوتی۔ جو قہقہوں میں جیتے جیتے اچانک زندگی کا راستہ بھول گیا۔ قہقہے گم ہو گئے پھر وقت نے ایک دن وہ قہقہے اس کے سامنے زندہ کر دیئے... تم اس پاگل کی کہانی سنو گی تو جو روتے روتے ہنستا تھا اور ہنستے ہنستے رونے لگتا تھا۔ یعنی ایک لمبی مدّت تک وہ خود کو نہ سمجھنے کے جُرم کا شکار رہا... تو تو ہنستی ہے... زور زور سے ہنستی ہے... اور میں ذرا پیچھے لوٹتا ہوں... ذرا پیچھے... جہاں ایک ٹوٹا پھوٹا برسوں پرانا مکان مجھے صدا دے رہا ہے... اور اُسی مکان کے ایک چھوٹے سے صندوق نما کمرے میں چوکی پر ایک شخص لیٹا ہوا سوچ رہا ہے... شاید اتنی عمر میں آئی ہوئی بائیس خزاؤں کا حساب لے رہا ہے۔ گذرے ہوئے بائیس برسوں نے اسے کیا دیا ہے... لمبی تھکن کے سوا... کھوئے ہوئے قہقہوں نے اُسے کیا عطا کیا ہے

. . . زندگی کا وہ مفہوم جب انسان سنبھلتے ہوئے یہ سوچتا ہے . . . زندگی بغیر مضبوط سہارے کے نہیں کٹ سکتی۔ گھر کے بزرگ تو چند روزہ جنت ہوتے ہیں۔ زندگی گذارنے کا سلیقہ سکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں اور یہ سلیقہ رہ جاتا ہے جیسے ساری زندگی نبا ہنا پڑتا ہے اور اسے آنے والی نسلوں کے لئے بھی محفوظ کر لینا پڑتا ہے . . . اور بس یہی فلسفہ مجھے بنّو کے قریب لے گیا تھا . . .

۳

جب آنکھیں کھلتی ہیں تو مکان کچھ کہانیاں سُنایا کرتا ہے۔ یہ وہ کہانیاں ہوتی ہیں جو باپ داداؤں کے کارنامے کو بیان کرتی ہیں . . . اور تب مکان ایک مبلغ ہو جاتا ہے . . . کہ سُن رہے ہو یہ کہانیاں . . . وہ جو گذر گئے . . . اُنہی کے نقشِ پا کے پیچھے پیچھے چل کر تمہیں بھی تہذیب و تمدّن کے اِس پرانے مکان کو آباد رکھنا ہے۔ بچپن کے ننھے منے قدم آنگن میں دوڑے تو اقبالؔ و غالبؔ کی غزلیں سُنائی گئیں۔ یہ غزلیں اتنی بار سُنائی گئیں کہ زبانی یاد ہو گئیں . . . اُٹھتے بیٹھتے صبح شام ادب کی ہی آغوشِ نرم و نازک تھی اور امّی کی وہ معصوم جھڑکیاں تھیں کہ اپنے ساتھ ساتھ بچّوں کو بھی خراب کر دو گے . . . ابّا حضور بس مسکرا کر رہ جاتے . . . یہ مسکراہٹ اتنی گہری ہوتی کہ سمجھنا آسان نہ ہوتا۔ ابّا پھر مسکراتے ہوئے مجھ سے کہتے . . . یہ سلسلہ کوئی نیا نہیں بلکہ گھر کی پُرانی تہذیب سے جڑا ہوا ہے۔ . . . یہ غزلیں اور کام کی باتیں جو میں تمہیں سُناتا رہتا ہوں . . . بتاتا رہتا ہوں . . . پردادا نے دادا کو بتائیں . . . دادا نے ابّا کو . . . ابّا نے مجھے . . . اور میں تمہیں . . . اور یقین ہے تمہارے بعد بھی یہ سلسلہ قائم رہے گا . . . ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ اس گھر کی اینٹیں پرانی ضرور ہو جاتی ہیں مگر ٹوٹتی نہیں ہیں . . . مگر ابّا تے شاید کہنے میں کچھ غلطی کر دی تھی . . . پرانی اینٹیں جب مٹّی کے تودے میں بدل جاتی ہیں تو بھر بھرا جاتی ہیں . . . ابّا زیادہ تر باہر رہتے . . . . . اور بچپن کے مست قدم گھر میں دوڑا کرتے، لٹّو نچایا کرتے . . . آنگن کے بغل میں دادی امّاں کا کمرہ تھا اوسارے کے پاس نانی اماں سوتی تھیں . . . ان دونوں

کی ڈانٹ کا بھتّر ہر وقت مجھ پر برستا رہتا۔ گھر کے سامنے بڑے ابا کا گھر تھا۔ دوپہر میں بڑی اماں بھی آجاتیں ۔ ۔ ۔ باجیاں امّی اور بڑی اماں کو گھیر کر بیٹھ جاتیں ۔ ۔ ۔ بیچ بیچ میں دادی اماں تانی اماں کی بوجھل آواز بن گفتگو میں روک لگا دیتیں ۔ ۔ ۔ یہ سارے منظر مجھے یاد ہیں ۔ ۔ ۔ یہ سارے منظر جواب جُدا ہو گئے' اور بظاہر کہانی نہیں لگتے ۔ ۔ ۔ مگر یہ سارے کے سارے منظر اُسی لڑکے کی زندگی کی کہانی سے جُڑے ہیں جس نے بے معنی قہقہوں میں کبھی اس طرح سے بزرگوں کی ڈانٹ کی اُس تمازت کو محسوس نہیں کیا تھا ۔ ۔ مگر اچانک ۔ ۔ ۔ وہ سارے کے سارے لمحے کہانی بن گئے ۔ ۔ ۔ کمرے سُنسان ہو گئے ۔ ۔ ۔ آنگن سے لٹّو اور گیند کا کھیل ختم ہو گیا ۔ ۔ ۔ امّی کی شفقتیں نیلگوں آسمان میں کھو گئیں ۔ ۔ ۔ اور ابّی کی غزلیں سُناتے ہوئے معصوم ہونٹوں پر برف کی سِل پڑ گئی ۔ ۔ ۔ چہرے پر جھولتی ہوئی داڑھی معنویت سے پرے زندگی کی نئی تنگ و تاریک سُرنگ میں داخل ہو گئی ۔ ۔ ۔ تو اچانک اپنا محاسبہ کرنے کو دل چاہنے لگا ۔ ۔ ۔ پھر وہی کمرہ تھا جہاں سے شستہ قہقہے بلند ہوا کرتے تھے ۔ ۔ ۔ اور اب وہی کمرہ سُرمئی شام کے پھیلتے ہی دن بھر باہر آوارہ گھومتے ہوئے میرے تھکے ہارے وجود سے دریافت کر رہا ہوتا ۔ ۔ ۔ آگئے تم ۔ ۔ ۔ اتنی دیر کہاں لگا دی ۔ ۔ ۔ اتنی اتنی دیر تک کہاں گھومتے رہتے ہو ۔ ۔ ۔ کچھ دیر قبل بھابی تمہارے کمرے میں آئی تھیں ۔ ۔ ۔ دیکھ رہے ہو ۔ ۔ ۔ کتابیں سج گئی ہیں ۔ ۔ ۔ ٹیبل بھی صاف لگ رہا ہے ۔ ۔ ۔ آئینہ کی گرد پوچھ دی گئی ہے ۔ ۔ ۔ اور شاید نغمی بھی آئی تھی ۔ ۔ ۔ تمہاری ایک دو میگزین لے گئی ہے ۔ ۔ ۔"

نغمی کون ہے؟ آپ نہیں جانتے۔ نغمی میری چچیری بہن ہے۔ ہمارا بچپن ایک ساتھ گذرا ہے ۔ ۔ ۔ نغمی سے میری ہمیشہ لڑائی رہی اور آج بھی لڑائی ہے۔ وہ میری کسی بات کو نہیں مانتی اور میں اس کی کسی بات کو نہیں مانتا۔ گذرے ہوئے شب و روز میں نغمی کے ساتھ میری کتنی ہی یادیں وابستہ ہیں۔ یادیں! جواب لمحہ لمحہ سو رہی ہیں اور مکان جاگ رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میرا کمرہ جاگ رہا ہے ۔ ۔ ۔ کمرے سے باہر نکل کر دالان تک کا سفر کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ لمبی گہری خاموشی ۔ ۔ ۔ دوپہر ہو گئی ہے ۔ ۔ ۔ گھر میں ہیں ہی کتنے لوگ ۔ ۔ ۔ ابّی کے کمرے سے قرآن پاک کی تلاوت جاری ہے ۔ ۔ ۔ ابّی زیادہ تر عبادت میں ہی مشغول رہتے ہیں ۔ امّی جب سے

گئی ہیں، امی نے خود کو عبادت کی دُنیا میں قید کر لیا ہے ۔ ۔ ۔ ہاں کبھی کبھی جب امی کے کمرے سے ہو کر گذرتا ہوں تو ایک مخصوص آواز اچانک میرا راستہ روک لیتی ہے ۔ ۔ ۔ منا بیٹے ۔ ۔ ۔ ایک دَم سے چونک پڑتا ہوں ۔ امی کو اب یاد نہیں کرنے کا عہدہ کر چکا ہوں ۔ یادوں سے اشکوں کا جو تعلق ہے وہ مجھے پیچھے لَوٹنے نہیں دیتا ۔ ۔ ۔ بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں آجاتا ہوں ۔ ۔ ۔ کل تک یہ کمرہ ایسا بے ترتیب اور گرد و غبار میں ڈوبا ہوا نہ تھا ۔ امی تو پورے گھر میں ناچتی پھرتیں ۔ ایک جگہ ٹھہرنا انھوں نے جانا ہی نہ تھا ۔ ہر چیز قرینے سے رکھی جاتی ۔ ۔ ۔ میرے گندے کپڑے گٹھری میں باندھ دیئے جاتے ۔ ۔ ۔ صاف کپڑے الگنی پر ٹانگ دیئے جاتے ۔ امی بولتی بھی جاتیں اور کام بھی کرتی جاتیں ۔ ہاں اُس وقت ایسا احساس ضرور ہوتا کہ امی کے ساتھ ساتھ پورا گھر بول رہا ہے ۔ ۔ ۔ دروازے ، کھڑکیاں سب کے سب بول رہے ہیں ۔ ۔ ۔ آتش دان بول رہا ہے ۔ ۔ ۔ باورچی خانہ بول رہا ہے ۔ چمکتی ہوئی قلفیاں طشتریاں سب کی سب بول رہی ہیں ۔ ۔ ۔ صفائی کے بعد والا گھر چیخ چیخ کر امی حضور کے قصیدے بیان کر رہا ہے ۔ ۔ ۔ مگر اچانک ۔ ۔ ۔ دروازے کھڑکیاں سب خاموش ہو گئے ۔ سب کے ہونٹوں پر قفل پڑ گیا ۔ ۔ ۔ دیواروں پر بے رونقی کے جالے تن گئے ۔ ۔ ۔ اور سب نے مل کر درد و غم کا گیت چھیڑ دیا ۔ ۔ ۔ اور سارا سُونا ہو گیا ۔ ۔ ۔ آنگن ویران ۔ ۔ ۔ دادی اماں کے کمرے میں لوبان کی خوشبو پھیل گئی ۔ ۔ ۔ پرانے گیت نئے گیت میں ڈھل گئے ۔ ۔ ۔ اور میں آزردہ آزردہ سا اپنے کمرے کی پُراسرار ویرانی کو تک رہا ہوں جو مجھ سے امی کا پتہ پُوچھ رہے ہیں کہ وہ ہاتھ کیا ہوئے جو مجھے زندگی دیا کرتے تھے تو آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے قطرے میری سُوکھی ہتھیلی پر جذب ہو جاتے ہیں تنمی چپکے سے میرے سرہانے آکر بیٹھ جاتی ہے ۔ ۔ ۔ تم پھر رو رہے ہو ۔ شاید دوسروں کے اندر رُخصت ہوئے بزرگ اس انداز سے نہ ہوں جیسے تمھارے اندر ہیں ۔ ۔ ۔ زندگی میں صرف پیچھے نہیں دیکھنا پڑتا بلکہ آگے ۔ ۔ ۔ اور آگے کا لمبا سفر طے کرنا پڑتا ہے ۔ ۔ ۔ شاید تنمی سچ کہتی ہے ۔ ۔ ۔ مگر اب دیر ہو چکی ہے ۔ مَیں اپنے اندر اندر اس طرح اُتر چکا ہوں کہ اب ایکدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ آگے بڑھنے کی صورت میں وہی مخصوص آواز امی کے کمرے سے نکل کر میرا راستہ روک لیتی ہے ۔ تم مُجھے

بھولتے جا رہے ہو بیٹا... ماں کی شفقت اتنی کمزور تو نہیں ہوتی کہ دو ہی سال میں اُسے بھلا دیا جائے...

امّی ... امّی ... میں پاگلوں کی طرح اس صدا کے پیچھے دوڑتا ہوں ... مگر نہیں ... کوئی نہیں ... ہاں کمرے بول رہے ہیں ... دروازے بول رہے ہیں ... اور مکان بول رہا ہے... کہ اب اس گھر کا طلسم ختم ہو گیا... رونقِ بازار اٹھ گئی ... سدا بہار قہقہے رخصت ہو گئے... ابی حضور کی شاعری گونگی ہو گئی ... ابا حضور کے ہاتھوں میں جھرّیاں پڑ گئی ہیں ... سو سال پُرانی کہانیاں سُنانے والے ہونٹ اب کمزور ہو گئے ہیں۔ پُرانی داستاں کی کڑیاں جوڑنے والی آنکھیں اب دُھند میں اُتر گئی ہیں... اس لئے کہ ابا خود بھی ایک کہانی بن چکے ہیں ... اور یہ کہانی ہمارے سامنے آنگن، اُسارے میں چلتی پھرتی رہتی ہے ... اور مکان کے کہنہ ہوتے ہوئے نقوش بولتے رہتے ہیں کہ عزیزم! جو کچھ ہو چکا ہے یا جو کچھ ہو رہا ہے ... اُسے نوٹ کرتے جاؤ ... نوٹ کرتے جاؤ... کہ سب ایک تاریخ بن چکے ہیں ... جو باقی ہیں وہ بھی تاریخ بن رہے ہیں ... عزیزم! نوٹ کرتے جاؤ... کہ تمہیں بھی ایک نئی کہانی شروع کرنے سے پہلے، گذری ہوئی پُرانی کہانی سے استفادہ کرنا ضروری ہے ... اس لئے عزیزم جو کچھ ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے اُسے نوٹ کرتے جاؤ... نوٹ کرتے جاؤ...

۵

زندگی کو ایک ٹھہراؤ مل جائے تو نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے ... بتو کے آنے سے ایک نئی شروعات ہو گئی ہے... جہاں مجھے سروس ملی ہے وہ میرے لئے ایک اجنبی شہر ہے۔ ... پہلی بار اس پشتینی مکان کو چھوڑ کر اس اجنبی شہر کے لئے روانہ ہو رہا ہوں ... تبدیلی در تبدیلی ... شروعات در شروعات زندگی تغیر کا نام ہے۔ ٹھہراؤ کا نام نہیں... زندگی کی نئی شروعات مجھ سے ہونے ہولے کہہ رہی ہے... اُن آنے والے لمحوں کے بارے میں... جو ابھی آئے تو نہیں مگر جن کا اندازہ قبل سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔

تو کہانیاں شروع ہوتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں مگر مکان جاگتا رہتا ہے۔ بولتا رہتا ہے۔ نئے آنے والوں کو پرانے آنے والوں کی کہانیاں بتاتا رہتا ہے۔۔۔ اب یہ مکان بوڑھا ہو گیا ہے۔۔۔ اور ابّا حضور گرتی ہوئی دیواروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔۔۔ کہ بیٹو! اب تم خود ایک مکان بن چکے ہو۔۔۔ اس لئے کہ لڑکا جب بڑا ہو جائے اور شادی ہو جائے تو وہ ایک پورا مکان بن جاتا ہے۔۔۔ اس لئے کہ وہ مکان میں ایک خاندان کو آباد کرتا ہے۔۔۔ اور آباد خاندان مکانوں کو آباد رکھتا ہے۔۔۔ ابّا خاموش ہو گئے ہیں۔۔۔ آنکھیں گیلی ہو گئی ہیں۔۔۔ پہلی بار ایک دَم سے نئی پہچان کے نئے سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔ بتّو کی آنکھیں بھری بھری ہیں۔۔۔ باہر رکشا کھڑا ہے۔۔۔ سامان لاد دیا گیا ہے۔۔۔ نم آنکھوں سے اُس مکان کو دیکھ رہا ہوں جہاں بچپن نے کبھی قہقہے لگائے تھے اور جوانی کے کتنے ہی خوبصورت لمحوں کو اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا۔ وقت کے ساتھ زیبا اور نغمی سب ایک کہانی بن گئے۔۔۔ بھیّا بھابھی دروازے کے باہر سامانوں کی گنتی کر رہے ہیں۔۔۔ بھیّا کی تین سالہ لڑکی لبنیٰ مچل رہی ہے۔ بتّو کی گود سے اُترنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ بھابھی زبردستی لبنیٰ کو کھینچ رہی ہیں۔ بتّو بھی لبنیٰ کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ سسکیاں کچھ اور تیز ہو گئی ہیں۔ بتّو بھابھی کے گلے لگ کر رو پڑی ہے۔۔۔ آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔۔۔ ابّا کہہ رہے ہیں۔۔۔ بیٹے وہاں جا کر خط لکھ دینا۔۔۔ مشرف تو بڑی ہو جائیں گے مگر تم یاد کر کے خط بھیج دینا۔۔۔ میں خود خط لکھوں گا ابّا۔۔۔ آواز تھرّا گئی ہے۔۔۔ جاتے ہی خط لکھوں گا۔۔۔ بلکہ روز ہی خط لکھا کروں گا۔ یہ الگ بات ہے کہ روز چھوڑ نہیں پاؤں گا۔۔۔ مگر لکھوں گا ضرور۔۔۔ اب اشکوں سے یاری ہو گئی ہے ابّا۔۔۔ جب جب آپ لوگوں کی یاد آئے گی اس مکان کی یاد آئے گی۔۔۔ اور مکان کے ساتھ جب جب پرانی یادوں کے سفر پر نکلوں گا تو جذبات مجھے چین سے رہنے نہیں دیں گے۔۔۔ گلا بھر آیا ہے۔۔۔ پہلی جُدائی کا منظر شاید ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔۔۔ رکشہ پر بیٹھے ہوئے بتّو کی سسکیاں کچھ تھم گئی ہیں۔۔۔ آہستہ سے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتا ہوں۔۔۔ رکشہ آگے بڑھ رہا ہے۔۔۔ وہ پیچھے مُڑ مُڑ کر ہلتے ہوئے گرم جوشی

ہاتھوں کو آنسوؤں کی پرورش میں دیکھتی ہے ۔۔۔ منظر آہستہ آہستہ دھندلا پڑ رہا ہے ۔۔۔ اور اب نیا شہر ہے اور کرائے کا مکان ۔۔۔ بتو نے گھر کی خانہ داری سنبھال لی ہے۔ شام میں تھکا ہارا گھر آتا ہوں تو آنکھیں پرانے مناظر کو تلاش کرتی پھرتی ہیں تو ایسے میں چائے کا کپ ہاتھوں میں لئے ہوئے بتو مجسم سوال بنی میرے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے ۔۔۔ کہ عالم! ایک بات پوچھوں ۔۔۔ تمہاری آنکھیں ہر وقت کسے ڈھونڈتی رہتی ہیں ۔۔۔ تلاش کرتی رہتی ہیں ۔۔۔ یہ سچ ہے بتو کہ اب میں نئے امکانات کی فضا میں داخل ہو گیا ہوں ۔۔ مگر سچ بولوں تو مکان کی بڑی یاد آتی ہے ۔۔۔ اور اس کمرے کی جس کی ویرانی تم نے چرالی تھی ۔۔۔ وہ حیرت سے میری آنکھوں میں جھانکتی ہے تو اس کے رسیلے ہونٹوں پر، دن بھر کی تھکان رکھ کے کہتا ہوں ۔۔۔ تم سمجھی نہیں بتو ۔۔۔ زندگی میں ایک وہ بھی جنّت ہوتی ہے جب آدمی کچھ بھی نہیں ہوتا اور سب کچھ اس کا کمرہ بن جاتا ہے ۔۔۔ دوست، رفیق، سب کچھ ۔۔۔ کبھی زیبا اور نغمی بن کر تسلّی دیتا ہے ۔۔۔ کبھی بزرگ بن کر سہارا ۔۔۔ اور کبھی "تم" بن کر محبت کے ایک نئے باب میں داخل ہو جاتا ہے ۔۔۔ سچ تو یہ ہے بتو کہ اس کمرے کی یاد بے پناہ ستاتی ہے ۔۔۔

بتو کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے ۔۔ "تمہارے فلسفے" ۔۔۔

یہ فلسفہ ہمیشہ زندہ رہیں گے بتو کہ اب میں نئے سرے سے ایک مکان بن چکا ہوں ۔۔۔ ایک پختہ مکان ۔۔۔ اور محسوس کر رہا ہوں کہ یہاں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر جو میرا مکان ہے وہ اب بھی مجھے صدائیں دے رہا ہے بلا رہا ہے ۔۔۔ کہ تم میرے ہی آنگن میں کھیلتے کھیلتے بڑے ہوئے ہو ۔۔۔ اور اس بے لوث رفاقت کا تقاضہ ہے کہ تمہیں اپنے لئے اُسی کے خمیر کو پسند کرتا ہے ۔۔۔"

بتو اچانک میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دیتی ہے ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ آگے کچھ مت کہنا ۔۔۔ اس کی آنکھیں نم ہیں ۔۔۔ پتہ نہیں کیوں میری موت کی بات وہ برداشت نہیں کر پاتی ہے ۔۔۔ کچھ دیر کے لئے میں بھی چپ ہو گیا ہوں۔

... کہوں تو کیا کہوں... کہانیاں شروع ہوتی ہیں اور ختم ہوجاتی ہیں ... مگر مکان جاگتا رہتا ہے ... اور میری خود خواہش ہے کہ جب بتو نئے اجنبی کی آمد کی خوش خبری سُنائے تو اُس سے اتنا ضرور کہوں... کہ میرا کمرہ تمہیں آواز دے رہا ہے بتو... پتہ نہیں کیوں ایک عجیب سی خواہش ہے کہ جس کمرے میں میری خوشیاں جوان ہوئی تھیں اور میری سوچوں کو ایک نیا رُخ دیا تھا موڑ دیا تھا اور آج مجھے ایک مقام سے نوازا ہے ... وہی شوخیاں اُس کمرے میں آنے والے اجنبی کے اندر بھی داخل ہوجائیں .... اس لئے چلو بتو ... اپنا مکان مجھے آواز دے رہا ہے... چلو ... چلو... چلو ...''

گلبن ۱۹۸۷ء ◆◆

پینتالیس سال کا سفرنامہ

رات کیسے کٹ گئی؟ ایک دن کیسے تمام ہوگیا؟ . . . چاہوں تو کتنے ہی سوال میں خود سے کر سکتا ہوں. مگر نہیں کرتا۔ اب خود احتسابی کا کوئی جرم نہیں کرنا چاہتا۔ آفس اور آفس سے گھر۔ دماغ تو ایسے ہی پریشان رہتا ہے اور اس پر ذہن سے پورے دن کا حساب طلب کروں تو اکتاہٹ کا جان لیوا احساس مجھے تو پریشان کرے گا ہی ساتھ ہی ساتھ تبو کو بھی بے چین کر دے گا. پھر کتنے ہی سوال ہوں گے جو وہ ایکدم سے لے کر بیٹھ جائے گی۔

"کیا بات ہے عالم؟ پریشان کیوں ہو؟ کیا حالت بنا رکھی ہے . . . شیو بھی نہیں کی . . . !"

تبو آج بھی اتنا ہی مانتی ہے جتنا کل۔ آج بھی ویسی ہی دکھتی ہے جیسا کل. شاید آپ یقین نہ کریں، مگر ہر اس شوہر سے پوچھ لیجئے جو عمر کی اس پینتالیس پائدان پر کھڑا ہوا اسی طرح سے اپنی بیوی کو چاہتا آیا ہو۔ چہرے کا رنگ، بڑھتی عمر کی پرچھائیاں جسمانی تبدیلی دوسرے تو محسوس کر لیتے ہیں۔ مگر ساتھ ساتھ جیتے ہوئے کبھی کسی نئی تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا۔ ہاں پہلی بار۔ ندیم کی پیدائش کے ایک سال بعد ایک دن تبو کو ٹوکا تھا . . .

"تم کچھ بدل سی رہی ہو . . ."

"ہاں" بتو ہنسی تھی "خود کو دیکھا ہے آئینے میں . . . تم بھی بدل رہے ہو"
"یعنی ہم دونوں ہی بدل رہے ہیں" میں نے عجیب سے انداز میں اپنے چہرے کو سکوڑا اور بتو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"آج بھی تم ویسے ہی ہو، جیسا شادی کے پہلے تھے"
میں پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا "یہ بات ندیم کے سامنے مت کہنا۔ بڑا ہو گیا ہے۔ سوچے گا ممی ڈیڈی نے کورٹ میرج کی تھی"

اس عمر میں بتو کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی چھا گئی۔ نظریں جھک گئیں۔ چہرے کے رنگ میں فرق آگیا اور پتہ نہیں کتنے ہی سال پیچھے لوٹ گئی۔

میں اسے غور سے دیکھتا ہوا ایک دم سے سنجیدہ بن گیا "تم بیس سال پیچھے لوٹ گئی ہو بتو" بتو کے کانپتے لب پتہ نہیں کس احساس کے تحت بول پڑے تھے " ایک بات کہوں عالم! پتہ نہیں کیوں عمر کے بڑھتے احساس کو میں نے تمہارے اندر کبھی نہیں پایا۔ اسے تم میری کمزوری کہہ لو یا وہ جذبہ جو اچانک شادی سے پہلے میرے دل میں تم کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ عام لوگوں سے اتنے الگ لگتے تھے کہ تم ضدی بچے کی طرح میں آج کی تعبیر کا کل ہی خواب بن گئی تھی۔ تم بدلے ضرور ہو عالم! مگر تمہارے چہرے پر وہ معصومیت آج بھی برقرار ہے جو کل تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ساتھ ساتھ رہتے ہوئے کبھی بھی تم میں بڑھتی عمر کے تیور کو محسوس نہ کر سکی"

محسوس تو میں بھی نہ کر سکا۔ مگر ہر بار . . . ہر چھلاوہ لمحے کے ساتھ یہ احساس ہوتا رہا کہ میں یعنی مشرف عالم ذوقی کی پوری شخصیت مسخ ہوتی جا رہی ہے۔ میں ایک شوہر بنتا جا رہا ہوں، ایک باپ بنتا جا رہا ہوں، ایک آفیسر بنتا جا رہا ہوں اور میری محسوسات کے سارے کے سارے لمحے میری تربیت کے انھیں تینوں جانوروں نے خرید لئے ہوں۔ . . . میرے مشاہدے اب انہی خیموں میں رہ گئے ہوں اور میرے جذبوں پر میری اپنی مہر نہیں رہی . . . بلکہ گھر باہر اور آفس . . . میں ہر جگہ تھوڑا تھوڑا کر کے بٹتا رہا ہوں . . . اکثر جب اپنے آپ کو پورا پورا دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے تو اس طرح سوال

کرتا ہوں۔

"میں کون ہوں؟"

"مشرف عالم ذوقی ۔۔۔"

"مشرف عالم ذوقی کون ۔۔۔؟"

"ندیم کا باپ ۔۔۔"

"ندیم کون ۔۔۔؟"

ندیم کے ساتھ جیسے ہی تبو کا نام ذہن میں آتا ہے میری شناخت مکمل ہو جاتی ہے۔ خود کو ڈھونڈنے کے لئے اب اکیلا نہیں رہ گیا تھا میں بلکہ مختلف حصے ہو گئے تھے جو مل کر میری شناخت کو مکمل کرتے ۔۔۔ یہ خلش ضرور تھی مگر نئے سرے سے جینے کی تیاری زندگی پر اتنا اثر تو ضرور ڈالتی ہے۔ آفس میں بھی یہی ہوتا ۔۔۔ اپنے اسسٹنٹ یا دیگر اسٹاف کے منہ سے بار بار صاحب کے تذکرے پر پھر یہ سوال زور پکڑتا۔

"صاحب کون؟"

ذہن پر تناؤ پیدا ہو جائے تو تناؤ ختم کرنے کے لئے کچھ پیچھے لوٹنے کی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ میز پر دونوں ٹانگیں پھیلا دیتا ہوں۔ سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر بندھی ٹکی زندگی کے معمول سے دور نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر جاؤں تو کہاں جاؤں۔ آنکھیں بند کرتا ہوں ۔۔۔ سوچنا چاہتا ہوں تو چپراسی موٹی موٹی فائلوں کی جانب توجہ دلا دیتا ہے ۔۔۔ فائلیں دیکھتا ہوں تو آگے بھاگتی ہوئی گھڑی کی سوئیاں تبو کی بے چینیوں کی یاد دلا دیتی ہیں ۔۔۔ گھر جاتا ہوں تو تبو ندیم کی شکایتیں لے کر بیٹھ جاتی ہے اور تب دھیرے سے کہتا ہوں "تبو! تم نے ندیم کو نہیں سمجھا۔ ندیم میں پورا پورا میرا عکس ہے ۔۔۔ ایسا ہی میں تھا ۔۔۔ گھمکڑ ۔۔۔ شرارتی ۔۔۔ دن بھر دوستوں کے جھرمٹ، میں گھرا رہتا ۔۔۔ مگر گھر کے لوگوں اور امی نے کبھی مجھے غلط تصور نہیں کیا ۔۔۔ باہر رہ کر بھی دوستوں کے ہجوم میں کبھی غلط نہیں ہوا ۔۔۔ اس لئے کہ سب جانتے تھے میں اس خاندان کے کھونٹے سے بندھا ہوں، جہاں کبھی سرکشی کی دیواریں بلند ہونا نہیں جانتیں۔ ندیم کو تم سے زیادہ میں پہچانتا

ہوں . . . دیکھنا وہ لوٹ آئے گا . . . لوٹ آئے گا ٹھیک میری طرح . . . پھر اپنے ہی زندہ دل قہقہوں میں سنجیدگی کی تلاش شروع ہو جائے گی۔"

نبو! چپ ہو جاتی ہے۔ مسکراتی ہوئی میری طرف دیکھتی ہے "اب ندیم کافی بڑا ہو گیا ہے . . . بالکل تمھاری طرح لگتا ہے . . . تم بھی ایسے ہی تھے . . . ایسے ہی شرارتی . . . پتہ نہیں کیسے کیسے فلسفے بگھارا کرتے تھے۔" کچھ یاد آتا ہے تو ہنسنے لگتی ہے۔ "تمھارے فلسفے عجیب ہوتے تھے . . . عجیب و غریب . . . تم ہمیشہ دوسروں سے بالکل الگ لگے . . . الگ تھلگ . . . تمھاری باتیں . . . تمھارے انداز . . . اور تمھارے لیٹرز . . . !"

"لیٹرز . . . !"

وہ ہنس پڑتی ہے "ایسا خط شاید ہی کسی نے اپنی محبوبہ کو لکھا ہو، جیسا کہ تم لکھتے تھے۔ ایسا خط شاید ہی کسی شوہر نے اپنی بیوی کو لکھا کہ جیسا کہ تم لکھتے تھے . . . اور لکھتے ہو جب بھی باہر رہتے ہو۔"

میں سنجیدہ بننے کی کوشش کرتا ہوں "تم نے ایکدم سے مجھے چڑیا گھر میں عجوبے کے طور پر رکھ دینے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

نبو ہنس پڑتی ہے۔ پھر اس کی ہنسی تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ ہنستے ہنستے اس کا ہاتھ میرے کاندھے پر آ جاتا ہے . . . چپ ہو گیا ہوں۔ نبو بھی چپ ہو گئی ہے . . . اس نے ہاتھ میں بیٹا لیا ہے . . . "جانتی ہو نبو . . . بیس سالوں کا کیا ہے، کبھی بھی پیچھے لوٹ سکتے ہیں . . . کبھی بھی آگے بڑھ سکتے ہیں . . . آگے بڑھ سکتے ہیں . . . پیچھے لوٹ سکتے ہیں . . . کبھی بیٹا اس تاریخ کو یاد کرے گا، کبھی ہم یاد کرتے تھے . . . کبھی ہم نہیں ہوں گے اور وقت یاد کرے گا . . . پورے بیس بیس — چالیس . . . چالیس بیس — ساٹھ — شاید اب انسانی عمر سمٹ کر اسی ساٹھ کے اندر رہ گئی ہے۔ ساٹھ کے اندر ہی کتنے ہی ہنٹے کٹے . . . اچھے خاصے لوگ رخصت ہو جاتے ہیں۔ دوست احباب سب کے سب وقت اور عمر کے تقاضے کے تحت بوڑھے

ہوتے جارہے ہیں . . . اور کچھ تو رخصت ہوگئے۔ عمر بڑھتی جاتی ہے ۔ کوئی عمر کے بارے میں نہیں سوچتا۔ اس لئے کہ بڑھتی عمر کے ساتھ موت کا احساس سلگتا ہے اور موت کے ساتھ وہ خوفناک سا احساس پورے جسم کو زلزلے کی طرح ہلاکر رکھ دیتا ہے آنکھیں بند ہونے کے بعد کچھ نظر نہیں آتا . . . کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وجود ختم . . . زندگی ختم . . . . رشتے ختم، ناطے ختم، درد ختم، احساس ختم، اب ساٹھ کے سفر میں صرف پندرہ سال بچ رہے ہیں . . . ."

پورا جسم پسینے سے بھیگ گیا ہے۔ تبو حیران سی مجھے دیکھ رہی ہے۔ کیا کہوں کہ تبو مجھے روک لو۔ پاگل کر دینے والا احساس مجھے توڑ رہا ہے کہ دیکھو تبو . . . اس ہاتھ میں جو زخم ہے، وہ درد دیتا ہے ٹیس دیتا ہے . . . مگر موت کے بعد کیا یہ احساس ہوگا؟ "مگر . . . میں یہ احساس چاہتا ہوں تبو . . . کہ اس احساس سے جڑا تمہارا وجود بھی ہے ۔

ندیم کا وجود بھی ہے ـــــ

اور تم دونوں کے وجود سے میرا اپنا وجود بھی ہے "

"عالم! تبو مجھ پر جھک گئی ہے ۔ پورا بدن پسینے سے تر بتر ہے۔ کانپ رہا ہوں . . . لرز رہا ہوں . . . سکرات کا عالم ہے . . . دھیرے دھیرے حال قال کی کیفیت سے لوٹتا ہوں۔ تبو مجھے دیکھتی ہوئی سنجیدہ ہوگئی ہے اور فرشتے جیسی معصومیت اوڑھے ہوئے کہہ رہی ہے ۔

"عالم! زندگی کے جوہر میں سب نہیں اُترتے . . . ہاں جوہر میں سب نہیں اُترتے . . . مگر تم اُتر گئے ہو۔ موت سب دیکھتے ہیں۔ عزیزوں کی موت، اقربا کی موت۔ مگر موت سب نہیں جیتے . . . ہاں موت نہیں جیتے . . . مگر پہلی بار کسی کو موت بھی جیتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم میں . . . تمہارے اندر . . . یہ بڑی بات ہے عالم اور ٹھیک بیس سال پیچھے کی طرح . . . اور بیس سال بعد بھی۔ مجھے آج بھی تم پر فخر ہے کہ میں . . . زندگی اور موت کے اس فاتح کو قید کر لائی ہوں جو ابھی بھی

تصوّرِ جرم سے آشنا نہیں ۔ ۔ ۔ جو ایک شوہر اور باپ ہوتے ہوئے زندگی بھی ہے اور موت بھی ـــــ"

تبو کے لب کانپ رہے ہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم نے کائنات کی آنکھیں دیکھی ہیں ۔ ۔ ۔ تو جواب دوں گی کہ ہاں دیکھی ہے اور اب بھی دیکھ رہی ہوں ۔ ۔ ۔ اِمروز نہ شاعرِ حکیم ۔ ۔ ۔ دانندۂ حادث و قدیم ـــــ"

تبو چپ ہو گئی ہے۔ اتنا کچھ بول جانے کے بعد اب نظر اٹھانے کی ہمّت نہیں رہی اس میں ۔ ۔ ۔ شادی سے پہلے اس کا یہ جملہ مجھے اب تک یاد ہے "تم نہیں جانتے میں تمھارے بارے میں کیا رائے رکھتی ہوں۔ لفظ و معنی، جذبہ و احساس کی زبان نہیں بنا کرتے ۔ ۔ ۔ ہاں! اپنے معصوم جذبوں کو لفظ و معنی کا ہار پہناتے ہوئے پورا جسم ہی کوہِ ندا بن جاتا ہے ۔ ۔ ۔ اور چیخ چیخ کر پوری کیفیت کی تفصیل سُنا دیتا ہے"

تبو ـــــ میری تبو ـــــ مجھے تم پر فخر رہا ہے کہ آگے بڑھتے ہوئے جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے ۔ ۔ ۔ ہم پیچھے بھی لوٹے ہیں ۔ ۔ ۔ مگر زندگی کو صحیح طور پر جینے کا حق ادا کرتے رہے ہیں ۔ ۔ ۔ آواز بھینگ گئی ہے ۔ ۔ ۔ ندیم ڈرائنگ روم میں دوستوں کے ساتھ شاعری کر رہا ہے ۔ ۔ ۔ گپّیں لڑا رہا ہے ۔ ۔ ۔ بال جھاڑ رہا ہے ۔ ۔ ۔ پھر باہر نکل گیا ہے ۔ ۔ ۔ یادوں کے تعاقب میں خود کو تبو کے گھر میں محسوس کر رہا ہوں۔ بڑھی ہوئی داڑھی ۔ ۔ ۔ بے ترتیب اُلجھے ہوئے بال ۔ ۔ ۔ گندہ شرٹ اور پینٹ ۔ ۔ ۔ اور تبو مجھ پر برس رہی ہے ـــــ "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے ۔ ۔ ۔ یہ کیا ہوتا جا رہا ہے تمھیں ـــــ"

"اب تمھاری ضرورت ہے تبو!" آہستہ سے کہتا ہوں۔ نظریں جُھک گئی ہیں اور عمر اچانک بیس سال آگے بڑھ گئی ہے ۔ ۔ ۔ ندیم میں داخل ہو گئی ہے۔

ندیم میں میری واپسی اچانک ہو گئی ہے جو تبو کی جھڑکیوں سے گھبرا کر میری طرف دیکھ رہا ہے ۔ ۔ ۔ آج اس کی آنکھوں میں ویسا کچھ بھی نہیں ہے جن کے لئے کل کی فکر کو لے کر تبو کی آنکھوں میں شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ تبو بھی حیران اور میں بھی۔

کہ آج میرا ندیم ٹھیک میری طرح بیس سال پُرانے فلسفے کی یاد یازہ کر رہا ہے۔
ڈیڈی! آج پہلی بار خود کے بارے میں سوچا تو بڑا عجیب لگا۔ مَیں اب تک محسوس کرتا تھا کہ مَیں اچھا ہُوں۔ آج پہلی بار سوچا کہ زندگی کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ زندگی اور موت ــــ اسی طرح ہر بات کے دو رُخ ہوتے ہیں۔۔۔ اچھی بات اور بُری بات۔ جب جب اپنے اندر اچھی بات تلاش کرنی چاہی تب تب میری بُرائیوں نے مجھے گھیرنا شروع کر دیا۔۔۔ مَیں پشیمان ہُوں ڈیڈی کہ مَیں آج تک آپ کا دل دُکھانے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکا۔۔۔"
ویسے ہی بول رہا ہے ندیم جیسے کہ مَیں اپنے شباب کے زمانے میں بولا کرتا تھا۔ ویسے ہی طنطنے دار۔۔۔ خوبصورت آواز۔۔۔ ویسا ہی مترنّم لہجہ کہ محفل میں ایکدم سے خاموشی پسر جائے۔ ویسا ہی فلسفہ۔۔۔ ویسی ہی شکن آلود پیشانی۔۔۔ اور آنکھوں میں جذبات کے تحت مچلتے ہوئے آنسو۔
"مَیں لوٹ رہا ہُوں ڈیڈی! زندگی بے مقصدیت کا سفر کبھی نہیں رہی۔۔۔ سفر مجھے خود بننا ہے۔۔۔ اپنا ہمسفر آپ، اپنی منزل آپ ۔۔۔ اپنی زندگی آپ۔۔"
وہ چُپ ہو گیا ہے اور تبوّ ہکّا بکّا ہے۔
"ندیم" تبوّ کی آواز کسی گہرے کنویں سے اُٹھتی ہے "ندیم بیٹے"
"جی ممّی!"
تبوّ آہستہ آہستہ ندیم کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے "تو کتنا بڑا ہو گیا ہے ندیم"
مَیں کہہ رہا ہُوں "آج تُو نے اُفق کی صدیوں کی تکان دُور کر دی بیٹے ــــ صرف ایک لمحے کی بے زبانی میں۔۔۔ جو کچھ تُو نے کہا وہ میرے لئے برسوں کے ارمان سے بھی زیادہ ہے بیٹے۔ زندگی خود جینی پڑتی ہے بیٹے اور کچھ بننا پڑتا ہے۔۔۔ یہ وہ باتیں ہیں جو میرے ابّی نے کبھی مجھے بتائی تھی اور آج فلسفے کا یہ دروازہ مَیں تیرے لئے کھول رہا ہُوں"
عمر کے بیس سال مجھے اچانک مل گئے ہیں۔ ندیم کہیں باہر نکل گیا ہے۔ تبوّ میری

طرف پلٹتی ہے۔ مَیں تبّو کی طرف۔

"تبّو۔۔۔ تم نے کچھ محسوس کیا۔"

"ہاں! لگا کہ تم پھر ندیم بن گئے ہو۔"

"یہ کیوں نہیں لگا کہ ندیم مَیں ہوگیا ہُوں۔۔۔"

"اس لئے کہ ندیم نے ابھی ایک مسافت طے کی ہے۔ "تم" بننے کے لئے تجربوں کی ایک لمبی مدّت سے گذرنا ابھی باقی ہے۔"

وہ ہنس پڑتی ہے ـــــــ پتہ نہیں کیوں محسوس کرتا ہُوں کہ زندگی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ عمر پر کبھی بڑھاپا نہیں آتا۔ اگر سوچنے سمجھنے میں یکسانیت ہو تو بڑھتی عمر کا فرق نہیں جاگتا تو بڑھاپا بھی نہیں آتا۔ اور وقت کی بنائی گئی مشغولیت کی پٹری پر زندگی بغیر جاگتی عمر کے چلتی رہتی ہے۔۔۔ پینتالیس سال کے اس لمبے سفر پر نکلی ہوئی زندگی مگر اچانک ٹھہرتی ہے اور اپنا محاسبہ کرتی ہے۔۔۔ کہ عالم! کبھی تو ٹھہر کر اپنے بارے میں سوچو۔۔۔ کہ تم کتنا بٹے ہو۔۔۔ آفس۔۔۔ ندیم۔۔۔ اور تبّو میں تمہارے کتنے حصّے ہوئے ہیں۔

تو اچانک پلٹ کر اپنی آزاد زندگی کے بیس سال پیچھے لوٹ جاتا ہُوں۔ جہاں شوخ سی تبّو میری کسی بات پر قہقہہ لگا رہی ہوتی ہے۔ میری کسی کہانی پر تنقید کر رہی ہوتی ہے جہاں کسی اپنے ندیم کا خواب دیکھا جا رہا ہے۔۔۔ اور جہاں ایک بے روزگار اپنے آفیسر بننے کی رعب کی ابھی سے نقل کر رہا ہوتا ہے اور پھر جیسے تعبیر نکل آئی۔۔۔ بیس سال پیچھے چھوٹ گیا۔ بیس سال آگے بڑھ گیا آدمی۔۔۔ تو ایسے میں ایکدم سے تبّو کو دیکھ کر چونک پڑتا ہُوں۔۔۔ کہ تبّو تم بدلی کیوں نہیں۔۔۔ بدلی کیوں نہیں۔۔۔"

اور تبّو کچھ کہتی نہیں۔۔۔ بلکہ ندیم کی طرف اشارہ کر دیتی ہے اور مَیں حیران سا ندیم کو دیکھنے لگتا ہُوں جو میرا ہی شرٹ ڈٹا کر میرے سامنے کھڑا ہے۔ میرا اپنا سوٹ جو میرے جسم پر اتنا اچھا نہیں لگتا۔۔۔ مگر ندیم کے جسم پر کیسا فٹ بیٹھ گیا ہے کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ کیسا نکھرا لگ رہا ہے ندیم۔۔۔ کیسا جم رہا ہے۔۔۔ ٹھیک ایسے ہی پُرانے منظر کے فریم میں، میں قید تھا، جہاں ابّی حضور کا کُرتا پائجامہ ڈٹائے ان کے سامنے کھڑا تھا اور روشن

آنکھیں بغور میرا جائزہ لے رہی تھیں ۔ ۔ ۔ کتنا بڑا ہوگیا ہے ۔ ۔ ۔ پھر ابّانے امّی کو مخاطب کرکے کہا تھا۔

"دیکھ رہی ہو ۔ ۔ ۔ پورا کا پورا میں مشترف میں داخل ہوگیا ہوں ــــــ"

آنکھیں بھیگ بھی جاتی ہیں اور فوراً چمک بھی جاتی ہیں۔

ندیم کہہ رہا ہے ــــــ "میرے کپڑے گندے تھے ابّو اس لئے آپ کے پہن لئے۔ ۔ ۔ ۔ آج ایک انٹرویو فیس کرنے کے لئے جانا ہے ۔ ۔ ۔"

نظریں جھک گئی ہیں۔

ندیم کو دعائیں دیتا ہوا میں شرارتی نظروں سے تبّو کی طرف دیکھتا ہوں۔ تو تبّو ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے کہ اب تم اس ۵۴ سالہ سفرنامے کو بند کر سکتے ہو کہ وقت اور عمر سے آگے نکل کر اچانک ایکدم سے میں نے ندیم میں تمھارے کھوئے ہوئے بیس سالوں کو پڑھ لیا ہے۔

"عالم! تم ندیم بن گئے ۔ ۔ ۔ اور ندیم عالم بننے کی تیاری کر رہا ہے۔"

اور اس سفرنامے کو بند کرتے ہوئے میں خود سوچ رہا ہوں کہ تبّو نے اگر ٹھیک کہا ہے تو پھر کیا زندگی صرف یہی ہے اور اتنی سی ۔ ۔ ۔ تو ہم زندگی کو سمجھ کیوں نہیں پاتے ہیں؟

بانو - سہیل ۱۹۸۶ء ◆◆

مجھے موسم بننے سے روکو

زندگی کے بائیس برس گزر گئے ہیں۔ پورے بائیس برس۔ آندھی اور طوفان میں گذرے ہوئے بائیس برس۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا ۔ ۔ ۔ اور آپ خود محسوس کر رہے ہوں گے کہ میں جھوٹ نہیں کہتا ۔ ۔ ۔ جھوٹ نہیں بولتا، بلکہ اپنے آپ کو ٹٹول پانے اور سمجھ پانے کی کوشش میں کبھی کبھی جھوٹ بن جاتا ہوں، ہو جاتا ہوں ۔ ۔ ۔

تو ناظرین پورے بائیس سال گذر گئے ہیں۔ خود احتسابی کا جرم کرتا ہوں تو کوئی مجھ سے چیخ چیخ کر کہتا ہے ۔ ۔ ۔ کہ پیچھے پیچھے مت دیکھو ۔ ۔ ۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ پیچھے نہ دیکھوں تو آگے کیسے بڑھوں ——— اور آگے نہ بڑھوں تو ڈر ہے کہ اپنے ہی تعاقب میں نکلی ہوئی میری آنکھیں، ایک ہی جگہ ٹھہرے ٹھہرے میرے وجود کے ریزے ریزے بکھیر دیں گی ۔ ۔ ۔ مجھے آگے بھی جانا ہے اور مجھے پیچھے بھی دیکھنا ہے۔ آگے بڑھنے کا خوف نہیں ہے مجھے، مگر پیچھے لوٹنے کا جان لیوا احساس مجھے کھولتے ہوئے چشمے میں اپنا ہی جھلسا ہوا چہرہ دیکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ہر شخص کو پیچھے دیکھنا پڑتا ہے۔ پیچھے لوٹنا پڑتا ہے۔ مگر اس وقت جب اس کے کسی مقام کا تعیّن ہو چکا ہے ۔ ۔ ۔ وہ ایک جگہ پا چکا ہے ۔ ۔ ۔ میں اب تک پا بجولاں ہوں کہ شہنائیاں اب تک مجھ سے کوسوں دُور ہیں ۔ ۔ ۔ خود کے سہارے نیلگوں آسمان کی سیر بھی نہیں کر سکتا۔ مگر پھر بھی اسیرِ امکاں ہوں کہ میری نگاہِ کشش جہت سے کچھ بھی روپوش نہیں ہے اور اسی واسطے اپنی آنکھیں اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کمزور مگر دھندلی آنکھیں جب جب نیلگوں

آسماں کی وسعت میں گم ہوتی ہوئی زبان ومکان کا احاطہ کر رہی ہوتی ہیں، اندر طبلے کی تھاپ کے ساتھ وہی پاگل کر دینے والے شور اور ہنگامے شروع ہو جاتے ہیں . . . اور جب جب ایسا ہوتا ہے مَیں اپنا محاسبہ کرنے لگتا ہُوں . . . ہاں! یہ جرم کرتا ہُوں کہ اب یہ جرم مجھ پر فرض ہو گیا ہے اور اس جرم کے ساتھ ایک کمزور مگر مضبوط سی آواز میرے اِرد گرد اپنا مضبوط ہالہ بُننے لگتی ہے۔

"عالم! اپنے کھوئے ہوئے شب و روز میں کبھی میری جھلک دیکھ کر پہچان سکو تو پہچان لو کہ مَیں وہی ایک لمحہ آفریدہ ہوں جو تمہاری زندگی میں کبھی نہ آسکا۔ اور مَیں جانتی کبھی نہ آئے گا۔ اس لئے کہ تمہارے وجود میں جو گوشت پوست کی ایک انتہائی خوبصورت عمارت میں دیکھ رہی ہُوں۔ دراصل وہ خوبصورت مگر کھوکھلے لفظوں کی ایک بے جان سی عمارت ہے اور یقین جانو کہ لفظوں نے اگر جذبات کو بیدار کیا ہے تو ایسے ڈھونگی الفاظ سے میرا یقین مرتا جا رہا ہے۔ اس لئے عالم میں جا رہی ہوں۔ تمہارے درمیان سے جا رہی ہُوں . . . مَیں کبھی بھی تمہارے بیچ سے ٹوٹ سکتی ہُوں۔ مَیں کبھی بھی دُھند میں اوجھل ہو سکتی ہُوں"

نگاہ جھکائے ہوئے درویش اپنی ڈفلی اپنا راگ الاپتا ہے۔ آواز کی حدت جب گرم سیال کی صُورت میں پُورے بدن میں پھیل جاتی ہے تو سر اُٹھاتا ہُوں . . . گرم گرم جلتی ہوئی آنکھیں اس کی آنکھوں میں اُتارنے کا خواہش مند ہُوں کہ دیکھ سکوں کہ بے جرم، بے یقینی کی زنجیروں میں قید کرنے والی آنکھوں کی چمک کیا بے الفاظ ہوا کرتی ہے۔ سر جھکائے اندر انہی لفظوں کو سُلانے کی کوشش کر رہا ہوں جو جذبات بن کر میری آنکھوں میں اُگ آتی ہیں اور پھر بے یقینی کا طوق بھی میرے گلے میں ڈال دیتے ہیں ——— نغمی جا رہی ہے۔ مضبوط ارادے میں دخل دینا میری فطرت نہیں رہی۔ اور مَیں جانتا ہُوں ——— چھوٹی موٹی لغزشیں ہی تو سمجھایا کرتی ہیں کہ تم آدمی ہو۔ فرشتے سے کم قد ہے تمہارا۔ پیمبری اور پیغمبری اُونچے درجے کی چیز ہے۔ تم کم ہمت ہو . . . تم پست اخلاق ہو . . . تم خود غرض ہو . . . تم دوسروں کے عیب ڈھونڈتے ہوئے اپنے عیب بھول جاتے ہو . . . تم دوسروں کی بات کہتے ہوئے اپنی بات بھول جاتے ہو . . . دوسروں کو غلط کہتے ہُوئے وہی غلطیاں دہرانے پر تم مجبور ہو . . . اس لئے کہ

تم بھی ایک آدمی ہو . . . نہیں دہراؤ گے تو پھر مکالمے کہاں سے آئیں گے ؛ ہاں مکالمے کہاں سے آئیں گے . . . بات میں بات کہاں سے پیدا ہوگی . . . طویل لمبی زندگی بغیر مکالمے کے کیسے گذرے گی !

تو ہم میں سے ہر ایک شخص کو مکالمے پالنے کا روگ ہے . اور یہ مکالمے ہیں ، جن کا براہِ راست تعلق زندگی سے ہے ۔ اور زندگی کا ان لغزشوں سے ، غلطیوں سے . . . جنھیں ہم جانتے بوجھتے بھی کرتے چلے جاتے ہیں ۔ مسکراتے ہوئے ہنستے ہوئے وقت گذاری کے لئے کرتے چلے جاتے ہیں ۔ پھر یہ لغزشیں ہم تک لوٹائی جاتی ہیں ۔ مختلف صورتوں میں ، اپنی ہی بات چوٹ کے پتھر کی طرح سیدھے دل پر آلگتی ہے ۔ دوسرے تو برہم ہو سکتے ہیں مگر میں سوچتا ہوں . . . زندگی کے اس بائیس سالہ سفرنامے کو بغیر مکالمے کے نہیں لکھا جا سکتا ۔ تو زندگی ایک مکالمہ ہے اور مکالمہ جھوٹ بھی ہو سکتا ہے اور سچ بھی ۔ نغمی سے میری الفت کی داستان بھی ایک مکالمہ تھی اور اس سے میری نفرت بھی ایک مکالمہ ہے . . . وہی لفظوں کا کھیل . . . وہی لفظوں کا ہیر پھیر . . . وہی جملوں کی تراش خراش اور لفظوں کی قلابازیاں . . . کرتب بازیاں ۔

تو ناظرین ! آپ سمجھ گئے ہوں گے ۔ اوپر جتنی بھی باتیں ہوئیں وہ سب عشقیہ باتیں ہیں ، جن کا آج کے دور میں تصور بھی پرانا پڑ چکا ہے ۔ مگر عشق آتا کہاں سے ہے . . . ہوتا کہاں سے ہے . . . پھر وہی نظروں کا سحر اور خوب صورت لفظوں کی اداکاریاں . . . چپ بیٹھے ہوئے اور آسمان کے تارے گنتے ہوئے کچھ تو بولنا پڑتا ہے نا ۔ اس لئے میں بھی بولتا تھا اور بولتا چلا جاتا تھا ۔ جس وقت میں بولتا تھا ، نغمی سنا کرتی تھی . . . ایک ٹک میری طرف دیکھتی ہوئی ، مسکراتی ہوئی ۔ اسے میرا بولنا اچھا لگتا تھا ۔ بھلا لگتا تھا ۔ اچانک سب کچھ بدلنے لگا ۔ شاید بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے کے باوجود میں اس کی جھولی میں صرف خوبصورت لفظ ہی ڈال سکا تھا ۔ اور اب وہ بور ہو رہی تھی ۔ میرے ان ہی لفظوں سے بور ، جنھیں کل وہ اچھا سمجھتی تھی اور پہروں میرے لفظوں کے طلسم میں گرفتار رہتی تھی ۔ سوچتا ہوں ، اس وقت عمر ہی کیا تھی جب نغمی نے پہلی بار مجھے ایک کتابی آدمی کہا تھا ۔ وہ مجھ سے عمر میں چھ مہینے بڑی تھی ۔ اس کا احساس مجھ سے چھ مہینہ بڑا تھا ۔ ہم گھنٹوں باتیں کیا کرتے ۔ تاروں بھرے آسمان کی جانب

انگلی اٹھا کر میں جانے کیا کیا کہتا رہتا۔ کتابی آدمی بننے کے باوجود اسے میرے پاس بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ مگر اب بات بدل گئی تھی۔ ۔ ۔ جب میں خاموش ہو جایا کرتا تو نغمی شروع ہو جاتی۔ تم بولتے بہت اچھا ہو ۔ ۔ ۔ بہت اچھا۔ آج تک تم سے اچھا بولنے والا نہیں دیکھا۔ تمہارے چہرے پر جو معصومیت ہے، اس سے زیادہ معصوم چہرہ نہیں دیکھا ۔ ۔ ۔ تم اچھا لگتے ہو مشرف ۔ ۔ ۔ بس اچھا سوچنے لگو۔ ۔ ۔

"اچھا سوچنے لگو ۔ ۔ ۔؟" میں نے نغمی کو حیرت سے دیکھا۔

"ہاں ۔ ۔ ۔ اس لئے کہ اب تم روز روز لفظ بنتے جا رہے ہو ۔ ۔ ۔ تمہارے جذبات تمہارے احساس دھیرے دھیرے تمہارے اندر سے نکل کر لفظ میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ پھر تمہارے پاس کچھ بھی نہ بچے گا اور ایک دن تم مشرف عالم ذوقی نہیں رہو گے بلکہ الگ الگ لفظ ہو گے ۔ ۔ ۔"

نغمی سنجیدہ تھی۔ اور پہلی بار میں اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس دیوزاد بونی کو جسے چھ مہینہ بڑے ہونے کے باوجود بھی میں نے اسے اپنے لطیف احساس سے قریب تر پایا ۔ ۔ ۔ زندگی کے تہہ در تہہ فلسفوں میں جھانکنے کی غلطی کرنے والے کیا دوسروں کی نظر میں صرف لفظ ہی رہ جاتے ہیں۔ میں اگر خود میں ڈوبتا ہوں اور ناسپاسی کے جرم کے بعد لفظوں کے موتی کھنگال لاتا ہوں۔ اور اب لفظ مجھے گھیر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ اور نغمی اٹھ کر جا چکی ہے۔ تاروں بھرا قافلہ آہستہ آہستہ چھوٹ رہا ہے ۔ ۔ ۔ اور لفظ مجھے گھیرے جا رہے ہیں نغمی کی آواز اچانک نہایت بلند ہو گئی ہے ۔ ۔ ۔ اور پھر نغمی کہیں یادوں کے کارواں میں اوجھل ہو جاتی ہے ۔ ۔ ۔ شفاف نیلگوں آسمان کے درمیان ایک نیا چہرہ طلوع ہوتا ہے۔ زیبا میرے قریب آ کر مجھے نئے سرے سے پڑھنے کا سلسلہ شروع کر دیتی ہے ۔ ۔ ۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں میری آنکھوں میں جھانکتی ہیں۔ جذباتی ہونٹ میرے ہونٹ کے بالکل قریب آ کر ٹھہر جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ "ڈر لگتا ہے ۔ ۔ ۔ کہیں تمہیں کھو نہ دوں ۔ ۔ ۔ تم کو کھونے کا احساس مجھے توڑ کر رکھ دے گا۔" ۔ زیبا کے خوبصورت چہرے کو ہاتھوں کی رحل میں لیتا ہوا میں پھر سے فلسفوں کی دنیا میں گم ہو گیا ہوں ۔ ۔ ۔ "کبھی کبھی سوچتا ہوں کیا زندگی بس اتنی سی ہے

زیبا کہ تمھارا چہرہ میرے ہاتھوں میں ہے اور ہم ایک خوبصورت لمحے کی جنت میں جی رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ بس اتنی سی زندگی ۔ ۔ ۔ " زیبا کے چہرے پر ناگواری سمٹ آئی ہے۔ ہمیشہ سوچتے رہنا اچھّا نہیں ہوتا۔ تم پال رہے ہو عالم۔ صرف اپنے بارے میں سوچتے ہو۔ ۔ ۔ کیا تمھارے لئے مَیں کوئی حیثیت نہیں رکھتی" ایک جھٹکے سے زیبا اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ مَیں اب تک چپ بیٹھا ہوں۔ ویسی ہی سنجیدہ مسکراہٹ لئے۔ اس لئے کہ جان چکا ہوں کہ زندگی محض اتنی سی نہیں جتنی دیر تک کہ زیبا کا خوبصورت چہرہ میرے ہاتھوں میں رہا۔ ۔ ۔ اور اب زیبا پھر میرے ان لفظوں سے پریشان ہو رہی ہے ۔ ۔ ۔ مَیں صاف دیکھ رہا ہوں وہ غصّہ ہو گئی ہے۔ وہ مجھ پر بگڑ رہی ہے۔ میرے ہی سامنے میری شکایتوں کی پوٹلی لئے کھڑی ہے۔ ۔ ۔ مَیں ایک بار پھر اپنے زنداں میں قید ہو گیا ہوں۔ نغمی کہتی ہے تم لفظ بنتے جا رہے ہو۔ زیبا کہتی ہے تم سوچتے بہت ہو۔ تمھاری سوچوں کے میل سے ہی لفظ بنتے ہیں اور پورے احساس کو بھگو دیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ سب مجھ سے دُور ہوئے جا رہے ہیں۔ نغمی بھی اور زیبا بھی ۔ ۔ ۔ لفظوں کی پٹاری میں کوئی سانپ موجود نہیں ہے۔ اور مَیں دھیرے سے زندگی کی اس مفلس شاہراہ پر تھکا ہارا چلتا ہوا اچانک نظر بن اُٹھا کر کوڑھیوں کی گاتی بجاتی ٹولیوں کو دیکھنے لگتا ہوں تو زیبا انجانے میں پھر سامنے آکر ٹوک دیتی ہے" تم مانو گے نہیں عالم۔ لفظ تمھارے ساتھ ساتھ چلتے ہی رہیں گے اور پھر ایک دن یہی لفظ ہوں گے جو تمھیں لہولہان کر دیں گے۔"

نو تا نظر بن! وحشت کے گذرے ہوئے بائیس برسوں نے اچانک مجھ پر شب خوں مار دیا ہے اور ایک دریوزہ گر تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا، آنکھوں کے آگے دُھند سے کھنچی ہوئی اس فرضی شاہراہ کو دیکھ رہا ہے جہاں زیبا اور نغمہ دونوں ہی اپنے اپنے مکالموں کی دُھند میں گم ہوتی جا رہی ہیں اور دُھند میں گم ہوتی ہوئی کہہ رہی ہیں"۔ اس ویرانے میں تم تن تنہا رہ جاؤ گے عالم، ایک دَم سے تن تنہا ۔ ۔ ۔ اور تمھارے پاس تمھارے دوست، ہمدرد اور رفیق کی صورت میں ہوں گے۔ تمھارے اپنے ہی مکالمے ۔ ۔ ۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ زندگی میں جس شدت کے ساتھ ہم نے تمھاری کمی محسوس کی، اُس نہیں پُر ہونے والی کمی کو

بھی تم نے خوبصورت الفاظ کی صلیب پر چڑھا دیا۔ اب جب جب تمہارے اندر جھانکنے کی کوشش کرتی ہوں تو تم مشترف عالم ذوقی نظر نہیں آتے بلکہ الگ الگ لفظ نظر آتے ہو۔۔۔ دیکھ لینا۔۔۔ ایک دن یہی لفظ ہوں گے جو تمھیں لہولہان کر دیں گے۔۔۔"

دریوزہ گر سر جھکائے کھڑا ہے۔

زیبا آگے بڑھ گئی ہے۔

نغمی اوجھل ہو گئی ہے۔

لفظوں کی خوبصورت وادیوں میں سیر کرنے والے مکالمے اچانک ہی گونگے بن گئے ہیں۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے کئی قطرے میری ہی سوکھی ہتھیلی پر جذب ہو جاتے ہیں۔ زندگی اس طرح سے بھی گذرتی ہے کہ صرف اپنے آپ کو ہی سمجھنا پڑتا ہے۔ پیچھے لوٹنے کا جرم نہیں بلکہ آگے بڑھنے کے لئے کچھ سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں اور اس سمجھوتے کے لئے میں نے پھر سے ایک نئے موسم کو اپنے اندر اتار لیتا ہے اور ایک جھوٹی تسلی خود کو دینے کی کوشش کر رہا ہوں کہ "زیبا سچ تو نہیں ہے۔۔۔ زندگی تو نہیں ہے۔۔۔ نغمی بھی تو ہوا ہے۔۔۔ ہوا کسی کا مقدر نہیں بنا کرتی۔ اور مشترف عالم ذوقی۔۔۔ تمھیں اپنے اندر دیکھنے کی اور سمجھنے کی کوشش میں یہ محسوس کیا ہے کہ تم موازنہ سے الگ ایک شخص ہو۔ دوسرا تم سے حد درجہ بہتر ہو سکتا ہے۔۔۔ حد درجہ کم ہو سکتا ہے مگر تم کو لے کر موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ اس لئے کہ تم۔۔۔ تم ہو۔۔۔ تم کو تمھاری ضرورت ہے۔ تم تمھارے لئے ہو۔۔۔ تم کو صرف تمھارے لئے رہنا ہے۔"

اور جب جب ایسا سوچتا ہوں، اس ہرے بھرے گھر میں جہاں میرے ابو ہیں، میرے بھائی ہیں۔ میری باجیاں ہیں، بھابھی ہے۔۔۔ جانے کیوں سب کو بالکل اجنبی سمجھنے لگتا ہوں یا خود ان سب کے درمیان اجنبی بن جاتا ہوں اور لمبی لمبی سانسیں کمرے میں اتارنے لگتا ہوں۔۔۔ اور جب تھک ہار جاتا ہوں تو لمبی لمبی سانسوں کے درمیان، پھولی پھولی سرخ آنکھوں سے کمرے میں بکھری بے ترتیب کتابوں کی جانب دیکھتا ہوں۔۔۔ یہ میری کتابیں ہیں۔۔۔ جنھیں میں شب و روز پڑھتا رہتا ہوں۔۔۔ میری کہانیاں۔۔۔ میرے افسانے۔۔۔ وہ رسائل، جن میں میری کہانیاں چھپتی رہتی ہیں۔۔۔ اخبارات سب کے سب ڈھول میں اٹے

ہیں ... اِدھر اُدھر بکھرے ہیں۔ کوئی ہاتھ لگانے والا نہیں۔ گرد جھاڑنے والا نہیں۔ مجھ پر الزام لگانے والوں نے کبھی یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ تم لکھتے کیوں ہو؟ وہ کون سی کمی ہے جسے پُر کرنے کے لئے تم کتابوں کا سہارا لیتے ہو . . . وہ کونسا غم ہے جسے تم لفظوں میں تلاش کرتے ہو . . . اور ہماری موجودگی میں بھی یہی لفظ تمہارا سہارا بنتے ہیں۔ بولے سب مگر کسی نے پلٹ کر میری ان بکھری ہوئی گرد آلود کتابوں میں نہیں جھانکا . . . کہ تم ان میں کیوں ہو عالم؟ ان میں تمہارا کونسا حصّہ چھپا ہے۔ یا پُورے پورے تم چھپے ہو . . . تم سامنے ہو یا تم کتابوں میں ہو۔ تمہاری ہر پل بولتی آنکھیں تمہاری کہانیوں میں کیوں اُتر جاتی ہیں اور جذبات بن جاتی ہیں۔ لکھتے ہُوئے اور بولتے ہوئے تم کبھی دُور نہیں گئے . . . تم جذبات ہی جذبات ہو عالم یا تم لفظ ہی لفظ ہو عالم . . .“

تو ناظرین! اپنے ٹوٹے ہُوئے پیکر کو ——— مَیں نے اِسی کمرے میں ——— اسی بے ترتیب گرد وغبار میں ڈوبے ہُوئے کمرے میں آرام کی نیند سلا دیا ہے۔ اپنی بکھری ہُوئی کتابوں اور پھیلے ہوئے بے ترتیب کہانیوں اور ناولوں کے مسودوں میں، مَیں نے اپنی انا کی بازیافت کی کوشش کی ہے . . . زیبا اور نغمی . . . مَیں تم دونوں سے مخاطب ہوں کہ تم نے کیسے مشرّف سے دوستی کی کہ اس کی کتابوں سے کوئی رُبط نہ رکھ سکیں۔ کوئی تعلق قائم نہ کر سکی اس کے سیدھے سادے لفظوں کی بولیاں تمہاری سمجھ میں نہ آسکیں۔ مَیں ہر پل سوچتا ہُوں کہ زندگی کے اس بائیس سالہ خزاں رسیدہ موسم نے مجھے کیا دیا ہے۔ تو اپنی ایک کمزور آنکھ خوبصورت چہرے پر بدنما داغ کی طرح پھیل جاتی ہے اور صرف مَیں بچ جاتا ہُوں اپنا تجربہ کرنے کے لئے۔ زیبا، نغمی، الگ الگ راستوں کی جانب مُڑ جاتی ہیں اور ان سے الگ ہٹ کر ——— لفظوں کی اداکارہ بنی سنوری پھر میرے سامنے آکھڑی ہو جاتی ہے . . . کہ عالم! وقت اور حالات کے تھپیڑے میں تم اپنی ایک آنکھ کو کمزور کر چکے ہو . . . زندگی کے اس طویل بے معنی سفر میں اپنی پیدا کردہ خاموشی کے رفیق بھی بن جاؤ اور رقیب بھی . . . تجربوں نے اگر زندگی کو معنی دیا ہے تو یقین جانو، تم سے زیادہ معنی کسی نے نہیں جانے۔ تم سے زیادہ سچ کسی پر عریاں نہیں ہوا۔ مگر سچ کو اتنے قریب سے جان لینے کے باوجود سفر ختم نہیں

ہوتا ہے۔ بلکہ سفر شروع ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ جب شعور جاگتا ہے ۔ ۔ ۔ بھٹکتے ہوئے بے معنی قدموں سے گھر میں سوال کیا جاتا ہے کہ زندگی کا منشا کیا ہے ۔ ۔ ۔ عمر کی اس دہلیز پر تب ہی خود ہی اپنے لئے ایک سائبان ڈھونڈتا ہے ۔ ۔ ۔ اور اس سائبان کے نیچے، پنچھیوں کے نئے جوڑوں کو لے کر نئے سفر کی ابتدا کر دیتی ہے ۔ ۔ ۔

تو ناظرین! میں ہکا بکا کھڑا ہوں ۔ ۔ ۔ کہ جذبات سے الگ بھی تو زندگی ہے جو مشقت اور محنت سے شروع ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ جہاں زندگی کے خوشنما جوہر نہیں جاگتے ۔ ۔ ۔ مگر نئے سفر کی شروعات کر دینی پڑتی ہے ۔ ۔ ۔ تو سوچوں کے اس اجنبی جزیرے پر بیٹھا ہوا ہیں ۔ ۔ ۔ میں لفظوں کا کاروبار کرنے والا ۔ ۔ موسموں کا تاجر ۔ ۔ چپ چاپ آگے بڑھنے سے پہلے پیچھے لوٹنے کا جرم کر رہا ہوں ۔ ۔ ۔ کہ سائبان کی تلاش اکیلے تو ہو نہیں سکتی ۔ ۔ ۔ پھر کون سہارا دے گا مجھے؟

تو ایک آواز ہولے سے دل میں اُتر جاتی ہے ۔ ۔ ۔ "عالم! میں ایک مہربان ساعت ہوں۔ مجھے خوش آمدید نہیں کہو گے ۔ ۔ ۔؟"

تو ناظرین! آپ یقین جانیں ۔ ۔ ۔ بغیر کچھ کہے ۔ ۔ ۔ بغیر کچھ سوچے ۔ ۔ ۔ میں اپنے کمرے کی طرف دیکھتا ہوں، جہاں کتاب شناس نظروں نے کتابوں کی دھول صاف کر دی ہے ۔ ۔ ۔ اور اب میرے دوسرے حکم کی منتظر ہے ۔ ۔ ۔

تو ناظرین! آپ یقین کریں ۔ ۔ بس اسی لمحے ۔ ۔ ۔ میں بغیر کچھ کہے ۔ ۔ ۔ بغیر کچھ سوچے اس کی جانب تیزی میں قدم بڑھاتا ہوں اور اسے زوروں میں اپنے سینے میں بھینچ لیتا ہوں ۔ ۔ ۔ کہ ٹھیرو ۔ ۔ ۔ ٹھیرو ۔ ۔ ۔ پہلے اتنا یقین دو کہ یہ شدت لفظوں سے پیدا نہیں ہوئی۔ یہ کسی مکالمے سے گرم جوشی نہیں ہوئی ۔ ۔ ۔ بلکہ یہ جذبات ہے ۔ ۔ ۔ اور جذبات لفظوں کے مبل سے نہیں آئے ۔ ۔ ۔ بلکہ ایک تھکے ہارے ساربان کو پانی کی تلاش میں اچانک مل گئے ہیں ۔ ۔ ۔ آدمی نے رہنے کا بھرم قائم رکھنا چاہتا ہوں میں ۔ ۔ ۔ اس سفر کو بھی اور ہر اس تلاش کو جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح سے زندگی سے ہے ۔ ۔ ۔ میں لفظ نہیں بننا چاہتا ۔ ۔ ۔ بلکہ اپنے اندر اس احساس اور ہر بات کو قائم رکھنا چاہتا

ہوں جو لفظوں اور مکالموں سے ہوتے ہوئے دھیرے دھیرے مجھ سے دور ہوتے گئے تھے۔ ۔ ۔ اب خود کو اس بات کا احساس دلانا چاہتا ہوں کہ میں مشرف عالم ذوقی ہوں ۔ ۔ ۔ اور اے انجانی سی گڑیا ۔ ۔ ۔ تم سنتی جاؤ ۔ ۔ ۔ سنتی جاؤ ۔ ۔ ۔ کہ میں پہلے موسم تھا ۔ ۔ ۔ مگر اب میں موسم نہیں بننا چاہتا ۔ ۔ ۔ میں موسم نہیں بننا چاہتا ۔ ۔ ۔ مجھے موسم بننے سے روک لو پلیز ۔ ۔ ۔ !"

فنکار ۱۹۸۵ء

ہماری مطبوعات

پھول جیسے لوگ	(ناول)	انور خان
یاد بسیرے	(افسانے)	انور خان
لمحوں کی قید	(افسانے)	کشور سلطانہ
افسانہ ۸۹ء	(افسانے)	انیس امروہوی
موجِ سحر	(شاعری)	ڈاکٹر انجنا سندھیر
قندوز قند	(طنز و مزاح)	فیاض احمد فیضی
برزخ	(افسانے)	ہاجرہ شکور
فرات	(ناول)	حسین الحق
نیلام گھر	(ناول)	مشرف عالم ذوقی
کیا مذاق ہے	(مزاحیہ شاعری)	اسمٰعیل آذر
بھوکا ایتھوپیا	(افسانے)	مشرف عالم ذوقی

۱۷۷۹، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲